نیو کی اینٹ

(افسانوی مجموعہ)

حسین الحق

نیو کی اینٹ

نیو کی اینٹ

(افسانوی مجموعہ)

حسین الحق

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

NEO KI EIENT

(Short Stories)

by

Hussain-ul-Haque

Year of Ist Edition 2010
ISBN 978-81-8223-718-6
Price Rs. 200/-

نام کتاب	:	نیو کی اینٹ (افسانوی مجموعہ)
مصنف	:	حسین الحق
رابطہ	:	سرسید کالونی، نیو کریم گنج۔ گیا (بہار) (Mob. 09934066720)
سن اشاعت اوّل	:	۲۰۱۰ء
قیمت	:	۲۰۰ روپے
کمپوزنگ	:	سید عینین علی حق
مطبع	:	عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی ۶

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, Gali Vakil, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph: 23216162, 23214465 Fax: 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com
Website: www.ephbooks.com

انتساب

خاندان کے سب سے محترم اور عمر رسیدہ بزرگ

ماموں جان

جناب سید نسیم الدین احمد مدظلہ العالی

اور

خاندان کی سب سے کم عمر فرد

ننھی سی جان

اپنی نواسی

سیدہ تعبیر فاطمہ سلمہا

کے نام

اللہ میرے ماضی اور مستقبل دونوں کو سلامت رکھے۔ آمین!

☆☆☆

فہرست

۱ — ناگہانی	۹
۲ — مور پاؤں	۲۵
۳ — سبحان اللہ	۳۹
۴ — الحمد	۵۶
۵ — مردہ راڈار	۷۸
۶ — جلیبی کارس	۸۶
۷ — زندگی، اے زندگی	۹۷
۸ — آشوب	۱۰۵
۹ — نجات.....کوئی نجات!	۱۱۳
۱۰ — بچاؤ بچاؤ	۱۲۰
۱۱ — کب ٹھہرے گا درد اے دل!	۱۲۷
۱۲ — استعارہ	۱۳۵
۱۳ — جلتے صحرا میں ننگے پیروں رقص	۱۴۱
۱۴ — کہاسے میں خواب	۱۴۹

۱۵ — گونگا بولنا چاہتا ہے	۱۵۶
۱۶ — لڑکی کو رونا منع ہے	۱۶۲
۱۷ — غم زدہ	۱۷۳
۱۸ — یہ آدمی	۱۷۹
۱۹ — رام نگر کے رستے میں	۱۸۳
۲۰ — نیو کی اینٹ	۱۹۲

☆☆☆

ناگہانی

بی بی عزت النساء اپنا کام جلدی جلدی نپٹانے میں مصروف تھیں۔

انہوں نے برتن مانجھتے مانجھتے ذرا دھڑ باہر کر کے دیکھا، شام بھاگی چلی آ رہی تھی اور ڈھیر سارا کام سر پر پڑا تھا۔ دوپہر میں ذرا آنکھ کیا لگ گئی کہ سب الٹ پلٹ ہو گیا۔ یاد آیا کہ برتن دھو کر صبح سے پڑا کپڑا ابھی دھونا ہے اور کپڑا ابھی پیشاب اور گندگی سے اٹا ہوا۔

بچے بڑے ہونے لگے تھے تو امید بندھی تھی کہ اب تو کپڑے دھونے سے نجات مل جائے گی مگر قسمت کا لکھا کون ٹال سکتا ہے۔ شوہر کو فالج مار گیا۔ چلنے پھرنے سے معذور، بولنے کی کوشش کرتا تو بہ مشکل ''پانی''، ''کھانا'' نکل پاتا۔ عام بیماری میں آدمی چڑچڑا ہو جاتا ہے، عزت النساء کا شوہر جلال الدین تو سخت بیماری میں مبتلا تھا۔ وہ جب تک بھلا چنگا رہا تو اپنے نام کے مصداق ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دی۔ کیا گھر اور کیا محلہ مجال کیا کہ کوئی معاملہ اس کی مرضی کے خلاف ہو جائے اور وہ برداشت کر لے، تو تو میں میں سے گالی گلوج پر اتر آتا مگر اپنی بات گرنے نہیں دیتا۔

عزت النساء بیاہ کر سسرال آئیں تو شروع شروع بڑی وحشت ہوئی، کس وحشی سے پالا پڑ گیا ہے؟ مگر بہن بھابھی سہیلی سبھی نے سمجھایا کہ زمین دارانہ مزاج ہے، بڑے گھر کا بگڑا نواب، کچھ دنوں برداشت کر لو۔ آہستہ آہستہ اپنی محبت کی زنجیر میں ایسا باندھو کہ سب کس بل ڈھیلا ہو جائے۔ عزت بی بی نے مشوروں کے مطابق اس کی بدسلوکی بلکہ وحشت کے مقابلے پر اپنا حسنِ سلوک نہیں بلکہ محبت آزمانی شروع کر دی مگر جلال الدین کے اندر تو کوئی ایسا وحشت ناک درندہ چھپا بیٹھا تھا جو عام لمحات کی بات تو الگ رہی بستر پر بھی عزت النساء کے ساتھ صحبت بالجبر ہی کرتا تھا۔ اس کا عام مزاج یہ تھا کہ جب عزت النساء مائل ہوتیں تو وہ کوئی نہ کوئی ایسا بہانہ تلاش کر لیتا

جس کا اختتام عزت بی بی پر لاتوں گھونسوں سے ہی ہوتا اور پھر وہ بہت چین سے کروٹ بدل کر سو جاتا۔ عزت النساء کی کیا مجال کہ ایسے وقت میں اس کو اپنی طرف مائل کر پاتیں۔ پھر جب ان کی ماہ واری کے دن آتے تو جلال الدین اس کی طرف رجوع ہوتا۔ ظاہر ہے ان چند دنوں میں وہ نجات کی خواہاں رہتیں مگر وہی چند دن ان کی مصیبت کے دن بھی ہوتے، ہر مہینے میں تقریباً ایک ہفتہ جلال الدین وحشی درندوں کی طرح نہیں بلکہ پاگلوں کی طرح اسے نوچتا بھنبھوڑتا۔ عزت النساء بچنا چاہتیں مگر بچ نہیں پاتیں اور پھر یہ بھی ہے کہ جن دنوں کا ذکر ہے وہی زمانہ تو عزت النساء کے بھی چڑھتے دریا کا زمانہ تھا۔ لاکھ نوچ کھسوٹ ہو، دو جسموں کا ٹکراؤ تو جذبات میں ہیجان پیدا ہونے کا سبب بنتا ہی ہے، سو بالآخر عزت النساء تھکان کے ساتھ ساتھ جذبات سے بھی مغلوب ہو کر آنکھیں بند کر کے پڑ جاتیں۔

ان کے تینوں بچے ان ہی دنوں کے آس پاس کی یادگار تھے۔

یہ سلسلہ شادی کے بعد تقریباً سات آٹھ سال چلا، بڑی بیٹی چھ سال کی تھی جب شوہر پر فالج کا حملہ ہوا، ڈاکٹروں نے بتایا کہ بلڈ پریشر ہائی ہونے کی وجہ سے ایسا ہوا، عزت النساء کو حیرت نہیں ہوئی۔ ایسے گرم مزاج آدمی کا بی پی ہائی ہوا تو حیرت کی کیا بات؟ مگر پریشر ہائی ہونے کی جو وجہ تھی اس نے صرف جلال الدین کو مفلوج نہیں کیا پورے گھر کو فالج زدہ بنا دیا۔

اب وہی نہیں رہا جس پہ میاں کودیں۔ زمین داری کے بل پر صرف جلال الدین کا غضب نہیں چلتا تھا، پورا گھر چلتا تھا۔ زمین داری گئی تو گھر کے سارے ہالی موالی بھی لیتی گئی اور بے زمینی سے گھبرا کر اس کے بھائی بھی دوسرے شہروں کو سدھار گئے، بعد میں خبر ملی کہ وہ انہی شہروں سے پاکستان روانہ ہو گئے۔ بچ گئے جلال الدین کے بوڑھے ماں باپ۔ وہ وقت کی مار زیادہ نہ سہ سکے اور برس دو برس میں آگے پیچھے عدم آباد سدھارے۔ خود عزت النساء کے مائکے والے پہلے ہی پاکستان جا چکے تھے۔ عزت النساء کی کائنات بس تین بچے تھے اور فالج زدہ شوہر!

عزت النساء کے لئے زندگی خارش زدہ کتے کے سر کا زخم بن گئی تھی۔

اسی زمانے میں لالہ ہر بیہر پرشاد اس کے گھر آئے۔

لالہ ہر بیہر پرشاد جلال الدین کے خاندانی منشی لالہ بنسی دھر پرشاد کے چھوٹے بھائی تھے۔ بنسی دھر تھے تو جلال الدین کے ہم عمر، مگر کبھی جلال الدین کے سامنے بیٹھے نہیں دیکھے گئے۔

ڈیوڑھی پر جب آتے تو انداز ایسا ہوتا جیسے کتا دم ہلا رہا ہو۔سب سے پہلا کام یہ کرتے کہ ڈیوڑھی کے باہر ہی جوتی اتار دیتے۔دھوتی کھول کے لنگی بنا لیتے اور برآمدے میں پڑی بنچ پر چپ چاپ بیٹھ جاتے۔اب اگر ایک گھنٹہ اندر سے کوئی باہر نہیں نکلا تو اس سے لالہ بنسی دھر کو کوئی فرق نہیں پڑتا کبھی خوش قسمتی سے اگر دس پندرہ منٹ بعد ہی اندر سے کوئی باہر آ گیا تو خبر ہو جاتی کہ لالہ آ گئے ہیں۔مگر خبر ہونے پر بھی یہ کوئی ضروری نہیں تھا کہ میاں (جلال الدین) لالہ سے مل ہی لیں۔

لالہ کا کام تھا کہ آئیں اور بیٹھ جائیں اور جب جلال الدین کہہ دیں یا کہلوا دیں تب ہی لالہ جائیں۔

گھر کی ساری ضرورت، ہینگ ہلدی سے کپڑے زیور تک لالہ ہی پوری کرتے۔نہ کبھی لالہ نے پیسہ مانگا نہ کسی نے پیسہ دیا۔جلال الدین نے بھی لالہ سے کبھی حساب نہیں لیا۔کتنا کھیت ہے، کتنا نقدی پر گیا کتنے کی لالہ نے خود بوائی کرائی کتنا رہن رکھا گیا، کتنا بیچا گیا، یہ سارا معاملہ بنسی دھر کے ذمہ تھا۔آخر تو وہ مختار عام تھے۔

مگر جب زمین داری چلی گئی تو لالہ بھی کاہے کے مختار۔۔۔۔۔؟

یاد آیا باغ تو بچا ہوگا۔مگر عزت النساء کس سے پوچھتیں، جلال الدین تو کہنے سننے کی منزل سے بہت آگے نکل چکے تھے۔زندہ لاش نے کب کسی کو کچھ بتایا، سوچا کہ لالہ بنسی دھر سے پوچھا جائے مگر لالہ میسر کہاں تھے، ہر دن ڈیوڑھی پر حاضری لگانے والے لالہ کو دیکھے ہوئے پانچ چھ مہینے گزر چکے تھے۔جلال الدین کے بیمار پڑنے کے بعد مہینے دو مہینے تک وہ پابندی نبھاتے رہے لیکن جب تمام ڈاکٹروں سے پوچھ پاچھ کر اطمینان کر لیا کہ یہ فالج اب موت کے ساتھ ہی جائے گا۔اور میاں اب کسی کو کچھ بتانے کی پوزیشن میں نہیں رہ گئے ہیں تو پھر آہستہ آہستہ لالہ کی آمد میں ناغہ پڑنے لگا۔

جب لالہ کو گئے مہینے پر مہینے گزرنے لگے اور گھر کا سامان بکنے کی باری آ گئی تو۔

پہلی مرتبہ عزت النساء نے ڈیوڑھی سے باہر قدم رکھا۔

برقعہ پہن کر باہری پھاٹک پر پہنچیں تو اتفاق سے اسی وقت خاندانی کہار گھورن سامنے آ گیا۔

''مالکن کہیں جانا ہے کیا؟''

''لالہ بنسی دھر کے یہاں جانے کو سوچ رہی ہوں۔''

''آپ کاہے جائیں؟ ہم بلائے لاتے ہیں۔''

عزت النساء ہلکے سے ہنسیں۔ ''زمانہ بدل چکا گھورن۔ مجھے ہی جانا پڑے گا۔''

ٹھیک ہے مالکن۔ آپ ڈیوڑھی پر ہی رہیں۔ ہم ابھی ڈولی لے کر آئے۔''

''رہنے دو پیدل چلی جاؤں گی۔''

گھورن ذرا ندامت ہو کے گڑگڑانے لگا: ''مالکن، ایسا مت کیجئے۔ جب تک ہم جیوت ہیں۔ یہ نہیں ہوگا۔''

عزت النساء ذرا آواز سے ہنسیں۔ ''اچھا ٹھیک ہے ڈولی لے کر آؤ۔''

لالہ کے گھر عزت النساء پہنچیں تو گویا ایک خاموش سی ہلچل مچ گئی۔ گھورن نے پہنچتے ہی گہار لگا دی تھی ''مالکن کے یہاں سے سواری آئی ہے۔'' لالہ کی بوڑھی ماں تیز قدموں سے چلتی خود باہر آگئیں۔

''مالکن آپ؟''

''جی ہاں! سوچا کہ ذرا آپ کا گھر بھی دیکھ لوں۔''

عزت النساء نے ہلکے سے مسکرا کر جواب دیا اور گھر پر ایک نگاہ کی۔ ان کی اپنی حویلی سے بڑی تھی ان کے منشی کی حویلی۔ چاروں طرف قد آدم چہار دیواری، احاطے کے اندر ایک غلام گردش، دوسری طرف طویلہ، تیسری طرف گؤشالہ، ایک کنارے پر چھوٹا سا ایک مندر، مندر کے بعد ذراہٹ کے کنواں، بیچوں بیچ لالہ کا مکان۔ باہری حصہ الگ۔ اس سے ذراہٹ کر اندرونی حصہ دونوں حصوں کو جوڑتی ہوئی ایک مختصری برساتی۔ اسی برساتی کے راستے ماتا جی عزت النساء کو لئے اندر چلی گئیں۔

مکان کے اندرونی حصے میں بڑے چھوٹے سب نظر آئے۔ سوا بنسی دھر کے!۔

وہیں پہلی بار نظر آئے۔ لالہ ہری ہر پرشاد!

سرخی مائل گورا رنگ، تیکھا ناک نقشہ، متناسب قد وقامت، لالہ ہر یہر پرشاد کی خوبصورتی پہلی نظر میں متاثر کرنے والی تھی۔ اچانک سرسری طور پر عزت النساء نے سوچا: ''یہ بنسی دھر سے چھوٹا ہے، مجھ سے برس دو برس بڑا ہوگا۔''

جس وقت کا ذکر ہے اس وقت عزت النساء بتیس (۳۲) برس کی نہیں ہوئی تھیں۔

''لالہ بنسی دھر کہاں ہیں؟'' کچھ دیر ادھر ادھر کی گفتگو کے بعد عزت النساء نفسِ مطلب پر

آ ہی گئیں۔

''ان کا حال احوال ہم سے نہ پوچھئے۔ اپنی کوکھ کا پیدا ایسا پرایا ہو جائے گا، ہم نے نہیں سوچا تھا۔ تین ماہ پہلے بال بچوں کو لے کر دہلی چلے گئے۔ اگر ہر یہ ہرنہ ہوتا تو ہمیں تو کوئی پوچھنے والا بھی نہ ہوتا۔''

''ان کا پتہ؟'' عزت النساء کو اپنی آواز ڈوبتی محسوس ہوئی۔

کوئی خیر خبر نہیں بی بی۔ بس یہاں سے اتنا کہہ کر نکلے کہ ہمیں اب اس شہر میں نہیں رہنا۔ اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں جانتے۔''

عزت النساء نے صاف محسوس کرلیا کہ ماتا جی بنسی دھر کے حوالے سے کوئی گفتگو نہیں کرنی چاہتیں، عزت النساء یہ بھی سمجھ گئیں کہ اس کا مطلب کیا ہے اور یہی بات عزت النساء کا دل بیٹھانے والی تھی۔

''اچھا ماتا جی، میں چلتی ہوں۔'' گھر لوٹتے ہوئے، ڈولی میں وہ جی بھر کے روئیں۔ اس درمیان انہیں کیا کیا نہ یاد آیا۔ بچپن کے دن، میکے کا آنگن، گھر کے پیچھے بغیچے میں لگے پھل پھول، سکھی سہیلی، بچپنے کے ڈھیر سارے کھیل، رشتے کا ایک بھائی جو اسے دیکھتا تھا تو دیکھتا ہی رہ جاتا تھا اور وہ اس کے باؤلے پن پر کھلکھلا کر ہنستی ہوئی بھاگ جاتی تھیں۔ ڈولی میں بی بی نے کئی دہائیاں بتا ڈالیں۔

گھر پہنچیں تو سب الٹ دکھائی دیا۔ شوہر بستر ہی پر گندگی پھیلا چکا تھا، بچے رو رہے تھے، بڑی بیٹی اپنے جانتے سب کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی مگر باپ تو بہر حال اس کے بس کی چیز نہیں تھا۔ عزت النساء نے پہلے شوہر کی گندگی صاف کی پھر بچوں کو سنبھالا تب باورچی خانے کی طرف پلٹ کے تاک سکیں۔ باورچی خانے سے فارغ ہوتے ہوتے رات سر پر آن کھڑی ہوئی۔ سب کو کھلا پلا کے وہ بستر پر گئیں تو دماغ اڑ رہا تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کریں۔ شوہر کا علاج تو دور کی بات، کھانے کپڑے کا انتظام مشکل ہو گیا تھا۔ نزدیک دور نگاہ دوڑائی، کوئی بھی تو اس مصیبت کی گھڑی میں کام آنے والا نظر نہیں آرہا تھا۔ ایک بھگدڑ ۴۷ء میں مچی اور دوسری زمین داری کے خاتمے کے بعد۔ نزدیک و دور جس کے بارے میں سوچا تو یاد آیا کہ وہ تو پاکستان چلا گیا۔ انہیں لگا کہ اگر جلال الدین مفلوج نہ ہوتا تو شاید وہ بھی پاکستان ہی میں پائی جاتیں۔

گذشتہ چھ مہینوں میں کیا نہیں ہو گیا۔ گھر کا سامان بکا۔ وہ بی بی صاحب سے استانی جی بن

گئیں، اس سے بھی کام نہ چلا تو لوگوں کے کپڑے اور بستر سینے لگیں، میلاد پڑھانے لگیں۔ مگر بات تو پھر بھی نہیں بن پا رہی تھی۔ حکیم صاحب کہتے، مفلوج کو کبوتر کے گوشت کا عرق چاہئے، مولوی صاحب کی فیس باقی تھی، نیا سال شروع ہو گیا، نئے درجے کی کتاب کا مسئلہ، ننگی کیا نہائے کیا نچوڑے۔ عزت النساء ایک دن کا انتظام کرتیں تو دوسرے دن کے لالے پڑ جاتے۔

بی بی عزت النساء کو کبھی کبھی محسوس ہوتا کہ ان کا سر پھٹ جائے گا۔

ایسے ہی حالات تھے جب لالہ ہر یہر پرشاد ان کے گھر آئے۔

پوس کا مہینہ جا رہا تھا۔ چاند کی آخری تاریخوں کی رات تھی۔ اندھیرا اُمڈ گھمڈ کر عزت النساء کے گھر پر برس رہا تھا، دور دور تک کہاسہ پھیلا ہوا تھا، رات تھوڑی آگے بڑھی تھی، دروازہ ابھی بند نہیں کیا گیا تھا کہ اچانک محسوس ہوا۔۔۔۔ دروزہ پر کوئی ہے! عزت النساء سمجھ نہیں پائیں۔ اس ٹھنڈی اور اندھیری رات میں کون ہو سکتا ہے۔ مگر دروازے پر کسی کے ہونے کا گمان کم اور یقین زیادہ ہوا۔ انہوں نے لالٹین کی مدہم لو ذرا تیز کی اور بڑی بیٹی رقیہ کو ساتھ لے کر دروازے کی طرف بڑھیں۔

لالٹین کی روشنی میں ہیولا نمایاں ہوا۔۔۔۔۔ دروازے پر لالہ ہر یہر پرشاد کھڑے تھے۔۔۔

"لالہ جی آپ؟"

لالہ ہر یہر پرشاد دونوں ہاتھ جوڑے کھڑے رہے۔

کچھ دیر تو وہ لالہ کو صرف دیکھتی رہیں، دراصل وہ سمجھ ہی نہیں پا رہی تھیں کہ وہ کیا کریں۔۔۔۔ مگر چند ہی لمحوں میں وہ سنبھل ہی گئیں۔۔۔ "لالہ جی رکیے گا۔۔۔ ایک منٹ" کہتی ہوئی پلٹیں۔ جلدی سے باہری بیٹھک کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئیں بکنے سے بچی اور گرد میں اٹی دو کرسیوں اور وہیں پر پڑے ٹیبل کو جلدی جلدی صاف کیا اور دروازے کی طرف لپکیں۔۔۔ "لالہ جی آئیے!"

لالہ جی آہستہ آہستہ چلتے ہوئے بیٹھک میں داخل ہوئے۔ عزت النساء نے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو لالہ نے دونوں ہاتھ جوڑ لئے اور آہستہ سے بولے: "یہ نہیں ہو سکتا پہلے آپ بیٹھیں۔" عزت النساء مسکراتی ہوئی بیٹھ گئیں۔ لالہ کے بیٹھنے کو "نصف نشست" یا "مؤدبانہ نشست" کہا جا سکتا ہے۔۔۔ کچھ دیر دونوں کے درمیان خموشی کا صحرا پھیلا رہا۔ عزت النساء نے محسوس کیا کہ لالہ پہل کرنے میں ہچکچا رہے ہیں۔

"آپ نے کیسے کیسے تکلیف کی؟"

"شرمندہ ہوں۔" لالہ نے پھر ہاتھ جوڑ لئے۔ "پہلے ہی آنا چاہتا تھا، ہمت نہیں کر سکا، آج ادھر سے گزر رہا تھا تو طبیعت بہت بے چین ہوگئی۔"

عزت النساء نے حیرت سے اسے دیکھا اور حیرت سے سنا بھی۔ لالہ کے لہجے میں حزن اور اضطراب دونوں شامل تھے۔ انہیں رشتے کا وہ بھائی یاد آ گیا جوان کے لئے بولایا یا پھرتا تھا۔ شادی کے بعد وہ ایک مرتبہ ملا تھا اور بہت بوجھل لہجے میں پوچھا تھا: "بی بی کیسی ہیں؟ آپ کو دیکھنے کو تو آنکھیں ترس گئیں۔" بعد کے دنوں میں اس کی آواز پھر گونجی تو انہیں ایسا لگا جیسے مرتا ہوا آدمی خدا حافظ کہہ رہا ہو، عزت النساء اندر سے کانپ سی گئیں۔ "لالہ کی آواز پر وہ باولا کیوں یاد آ گیا؟"

لالہ اس دن تھوڑی دیر ہی بیٹھے۔ ادھر ادھر کی باتیں کیں اور رخصت ہو گئے۔ دو دن چار دن، جب ہفتہ گزر گیا تو عزت بی بی جیسے لالہ کا آنا بھول سی گئیں۔ ان کا ہر دن بغیر کسی وجہ اور سبب کے بسر ہوتا رہا۔

ایسے ہی بے سبب اور بے مصرف دنوں میں سے کسی ایک دن۔۔۔ لالہ ہر یہر پرشاد دوبارہ آئے۔ بیٹھتے ہی پوچھا "بچے کہاں ہیں؟"

"سو گئے۔" عزت النساء نے آہستہ سے جواب دیا۔

"کیا رقیہ بھی؟"

"نہیں وہ پڑھ رہی ہوگی۔"

"ذرا تکلیف کر لیجئے، اسے بلایئے۔"

عزت النساء رقیہ کو بلا لائیں۔ لالہ نے رقیہ کی ٹھوڑی چھو کر پیار کیا۔ سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر بغل میں رکھا ایک پیکٹ اس کی طرف بڑھایا۔ "بیٹا! آپ بھائی بہنوں کے لئے۔"

رقیہ کا ہاتھ بے ساختہ پیکٹ کی طرف بڑھا۔ پھر فوراً ہی اس نے ہاتھ نیچے گرا دیا اور ماں کی طرف دیکھا۔

"لالہ جی اس کی کیا ضرورت تھی؟"

لالہ نے پھر ہاتھ جوڑ لئے۔ "بچوں کے لئے ہے۔ راستے میں مٹھائی کی دوکان پر نظر پڑ گئی تو جی چاہ گیا۔"

"لے لو بیٹا تحفہ ٹھکراتے نہیں۔" کہتے کہتے ان کی آنکھیں دھندلا گئیں یاد کرنا چاہا کہ بچوں

نے مٹھائی کب کھائی تو یاد نے ساتھ چھوڑ دیا۔

''چائے لے آؤ۔'' رقیہ جانے لگیں تو عزت النساء آہستہ سے بولیں۔

''اب رات زیادہ ہوگئی۔ اس وقت تکلیف مت کیجئے۔'' آواز لالہ جی تک تو پہنچ ہی گئی۔ ان کے ہاتھ پھر جڑ گئے تھے۔

''لالہ اس گھر میں تو اس وقت سے محفل جمنی شروع ہوتی تھی۔'' عزت النساء کے منہ سے ہلکی سی آہ نکل گئی۔

اس موڑ سے عزت النساء لالہ ہری ہر پرشاد کے سامنے کھلنی شروع ہوئیں۔ لالہ اب ہر دوسرے دن آنے لگے اور جب آتے تو بچوں کے لئے کچھ نہ کچھ لے کر ہی آتے۔

پھر ایک دن: لالہ آئے کچھ دیر بیٹھے اور جلد ہی اٹھ گئے۔ چلنے لگے تو باہری دروازے پر پہنچ کر رکے، پلٹے اور ایک رومال دونوں ہاتھوں کے بیچ رکھ کر عزت النساء کی طرف بڑھایا۔ انداز نذر پیش کرنے والا تھا اور لہجے میں التجا کا درد اور خوف شامل تھا: ''انکار مت کیجئے گا۔''

عزت النساء کچھ سمجھ نہیں پائیں۔ اندھیری رات، ہوا تیز، برشگال کا شور / کروں تو کیسے کروں شمع کی نگہبانی / ان آندھیوں میں کفِ دست کا سہارا کیا۔ ان کے کچھ فیصلہ کرنے سے پہلے لالہ نے رومال ان کے ہاتھوں پر رکھ دیا اور تیز قدموں سے باہر نکل گئے۔

عزت النساء نے دروازہ بند کیا اور دروازے ہی سے ٹِک کے کھڑی ہوگئیں۔ رومال کھولا۔ شروع چاند کی رات تھی چاند کی کم کم روشنی میں انہوں نے دیکھا۔ سو سو کے پانچ نوٹ رومال میں باندھے گئے تھے۔ عزت النساء وہیں پر، جیسے تھونس کر بیٹھ گئیں اور پھپھک پھپھک کر رونے لگیں۔

لالہ اس کے بعد دس پندرہ دن نہیں آئے۔ یہ عرصہ عزت النساء کے لئے بڑی بے چینی اور امتحان کا عرصہ تھا۔ گھر اپنی بدحالی کی انتہا پر تھا اور رومال میں بندھا پانچ سو روپیہ عزت النساء بی بی کی صندوقچی کے بالکل نچلے حصے میں پڑا ہاتھوں کے لمس کو ترس رہا تھا۔ اس درمیان کتنی مرتبہ بچے روئے مچلے بی بی کتنی مرتبہ اندر اندر ٹوٹیں، بکھریں، ان سے یہ پوچھنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ ایسے ہی کئی بے پناہ لمحوں میں ان کی نگاہ شوہر کی طرف اٹھی اور انہیں محسوس ہوا کہ وہ غصہ، نفرت، ترس، بیک وقت کئی جذبوں کی قید میں ہیں۔

ایسے بے پناہ لمحوں میں انہیں ایک ہی سوال پریشان کرتا۔ ''یہ تو اپنے اعمال کی سزا بھگت رہا

ہے مگر میں نے اوران بچوں نے کیا قصور کیا ہے؟"

کبھی کبھی عزت النساء تھک جاتیں۔ٹوٹنے لگتیں،سوچتیں" اب ایسا بھی کیا؟ کیا اسے معلوم نہیں کہ لالہ بنسی دھر مختار عام تھے، جو کچھ بکا ہوگا کیا اس کی خبر لالہ ہر یہر کو نہ ہوگی؟ ہو سکتا ہے ہر یہر پشاد نے بنسی دھر کو خبر کی ہو اور بنسی دھر ہی نے یہ پیسہ بھجوایا ہو۔" یہاں تک پہنچ کر وہ صندوقچی کی طرف دوڑتیں، مگر تالا کھولتے کھولتے خیال آتا:" ماتا جی نے تو صاف کہہ دیا کہ بنسی دھر کی کوئی خبر نہیں، چھٹی پتری کے لئے کوئی پتہ نہیں، پھر لالہ ہر یہر نے اس کو خبر کیسے کی ہوگی؟ تب یہ پیسہ؟"

عزت النساء ٹھٹھک جاتیں، پلو سے آنکھیں صاف کرتیں اور صندوقچی کے پاس سے ہٹ جاتیں۔جیون تیرے رنگ ہزار،کبھی بادِ بہاراں،کبھی موجِ صرصر،کبھی اُمس،کبھی کھلی ہوا....."

عزت النساء کے لئے ان دنوں جینا مدّوجزر میں گھرے آدمی کا اُبچھ کرنا تھا۔کبھی کبھی عزت بی بی اپنے آپ سے پوچھتیں:

"اس میں مد کہاں ہے عزت النساء۔۔۔"

ایسے ہی بے تھاہ لمحوں میں، لالہ ہر یہر پرشاد نے ایک شام دستک دی، کچھ دیر ادھر ادھر کی گفتگو کے بعد عزت النساء پوچھ ہی بیٹھیں:" لالہ بنسی دھر کی کوئی چٹھی آئی؟"

"جی نہیں۔ان کی کوئی خبر نہیں۔"

"اور آپ لوگوں نے کوئی خبر لی بھی نہیں؟"

"میں نے تو ارادہ کیا تھا لیکن ماتا جی آڑے آگئیں۔"

"کیوں، ماتا جی کیوں؟"

"اب چھوڑیے۔جانے دیجئے۔اس تفصیل میں نہ جائیے۔"

"لالہ میرے لئے یہ تفصیل بہت ضروری ہے۔کچھ بھی چھپایئے مت۔"

لالہ نے ایک ٹھنڈا سانس لے کر بدن ڈھیلا چھوڑ دیا اور بہت بوجھل لہجے میں بولے:" ماتا جی سے ان کا اختلاف ہو گیا۔ماتا جی کا کہنا تھا کہ تم جس جائداد کے مختار عام ہو، اس میں جو بھی بچا ہے، وہ اصل مالک کو لوٹا دو۔"

عزت النساء کے پاس اب پوچھنے کو کیا رہ گیا تھا؟ وہ سمجھ گئی تھیں کہ لالہ کیا چھپانا چاہ رہے تھے اور لالہ بھی سمجھ گئے تھے کہ بی بی کیا پوچھنا چاہ رہی ہیں۔دونوں کے درمیان ترسیل کی کامیابی کا

سانپ پھن کاڑھے کھڑا تھا اور کیچوے کی رفتار سے رینگتی رات دونوں کے گرد اپنا جال بہت آہستگی کے ساتھ مگر بہت مضبوطی سے بنتی جارہی تھی۔ عزت النساء اس جال کو توڑنا چاہتی تھیں مگر وہ محسوس کررہی تھیں کہ گھر پر فالج کا حملہ ہو چکا ہے۔ انہیں لگا وہ عورت کبھی رہی ہوں گی مگر اب وہ ایک مکھی ہیں۔ جسے کسی دیو نے دیوار پر چپکا دیا ہے۔ انہوں نے غور سے لالہ ہر یہر پرشاد کو دیکھا.... کیا وہ دیو یہی ہے؟.... لالہ کے چہرے پر فرشتوں کی معصومیت بکھری پڑی تھی۔

اچانک لالہ ہر یہر پرشاد کھڑے ہو گئے۔ ''میں چلتا ہوں۔''

''لالہ جی۔ ایک منٹ!''

بی بی عزت النساء کے منہ سے بے ساختہ نکلا، اور پھر اچانک وہ بالکل بے خودسی اٹھیں، تیزی سے اندر گئیں، صندوقچی سے پوٹلی نکالی اور اسی بے خود انداز میں، تیز قدموں سے چلتی، باہر بیٹھک میں آئیں اور پوٹلی لالہ کی طرف بڑھائی: ''لالہ جی۔ آپ کی امانت!''

لالہ ایک منٹ تک، بس ایک ٹک انہیں دیکھتے رہے۔ ان کے ہاتھوں میں روپوں کی پوٹلی تھی اور وہ ہاتھ لالہ کی طرف بڑھا ہوا تھا۔ لالہ نے آہستہ سے وہ پوٹلی لی، جھک کر ان کے قدموں میں رکھ دی، اور پھر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر ان کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اپنی آنکھوں سے لگا کر بغیر آواز کے زار و قطار رونے لگے۔ عزت النساء نے محسوس کیا کہ ان کا ہاتھ لالہ کے آنسوؤں سے تربتر ہوا جارہا تھا۔

یہ ایک عجیب و غریب صورت حال تھی۔ انچاہی انجانی، عزت النساء نے چھٹپٹا کر صدیوں پر محیط لمحے کے تیز پرشور دھارے کے بہاؤ میں بہنے سے خود کو بچانا چاہا مگر انہیں محسوس ہوا کہ عجیب ان دیکھا سا ایک تیز پرشور دریا تو خود ان کے اندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ اس بھیانک اور قیامت خیز لمحے میں وہ لڑکا انہیں پھر یاد آیا، جس سے شادی کے بعد بس ایک مرتبہ ملاقات ہوئی تھی اور جس کی آواز سمندر کی آخری تہوں سے آتی سنائی دی تھی ''بی بی آپ کیسی ہیں؟ آپ کو دیکھنے کو تو آنکھیں ترس گئیں۔''

لالہ اس حال میں اندازاً دو تین منٹ بے خود سے رہے اور پھر تقریباً دوڑتے ہوئے نکل گئے۔

اس رات عزت النساء پر رنگوں نے یلغار کی۔ نیلا، پیلا لال کاسنی، گلابی، فیروزی، چمپئی، کتھئی، لاجوردی، کاہی، پستئی، سرمئی، آسمانی دودھیا، انگوری، کشمشی، بادامی، پیازی، سفید، کالا، ہرا..... رنگوں کی بھرمار تھی اور موسم سرد دھند میں ڈوبا ہوا، پھر پرندوں نے ان کے گرد گھیرا ڈالا۔ طوطا، مینا، بلبل،

پپیہا، شیاما، کوئل، فاختہ، لعل، گوریا، تیتری، مور، باز، ساری رات وہ کسی پرشور دریا میں اُب چُبھ کرتی رہیں، ساری رات تھپیڑے انہیں ایک تنکے کی طرح سات دریاؤں میں اکیلی ناؤ بنائے رہے۔ ساری رات کوئی تھا جو انہیں دریا سے صحرا اور صحرا سے دریا کے درمیان گڑیے کی طرح اچھالتا رہا۔

آنکھ کھلی تو انہوں نے کالا رنگ، باز پرند، دریا کے بے پناہ تھپیڑے اور صحرا کی سلگتی دوپہر یاد رکھی۔

مگر اس دن ایک بات اور بھی ہوگئی۔ وہ نہا کر آئینے کے سامنے بال سنوارنے بیٹھیں تو اچانک اپنے آپ کو نظر آگئیں اور انہیں حیرت ہوئی، وقت کے تھپیڑے ان کا آپا سراپا نہیں چھو پائے تھے۔ لمبے بال، سرخی مائل دودھیا رنگت، خوبصورت نقش ونگار..... بی بی عزت النساء کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ کھیلتی نظر آئی جس میں اپنے آپ سے شرمانے کا انداز نمایاں تھا۔

"بی بی یہ بُندے پہن لیجئے۔ بہت اچھی لگیں گی آپ۔" اچانک آئینے کے جسم پر برسوں پرانا، بھولا بسرا، وہ باؤلا رشتہ دار چھا گیا۔

"پاگل....." وہ کھلکھلا کر ہنسی تھیں۔

"آپ کو پتہ ہے؟ آپ ہنستے ہوئے، سر کو جھٹک کر، آگے کے بالوں کو جو پیچھے پھینکتی ہیں تو کائنات کی سانس رک جاتی ہے۔"

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام۔ ایک مرگِ ناگہانی اور ہے۔ پتہ نہیں کب کا سنا شعر ان کے ذہن میں رینگ گیا، اور جیسے ہی ذہنی رو دوسرے مصرعے پر پہنچی تو آئینے کے جسم پر لالہ ہر پیہر پرشاد جھلملانے لگے۔

"لاحول ولاقوۃ!" عزت النساء بڑبڑا کر آئینے کے پاس سے ہٹ گئیں۔ مگر ایک بات ضرور ہوئی۔ اس دن اس پوٹلی میں سے انہوں نے سو روپئے کا ایک نوٹ نکالا اور برقعہ پہن کر بازار روانہ ہوگئیں.....

دوسری بات یہ بھی عجیب ہوئی کہ انہیں لالہ ہر پیہر پرشاد آنے لگے۔ خاص طور پر جب وہ جلال الدین کی گندگی صاف کر رہی ہوتیں تو جیسے ایک جھما کہ سا ہوتا..... گھٹنوں کے بل بیٹھا، ان کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا کر روتا ایک شخص..... ایک قدآور جوانِ رعنا!

وہ سر جھٹکتیں، ذہن کو دوسری طرف مرکوز کرتیں، مگر کوئی تھا جو لپ جھپ کرتا آتا رہتا، جاتا رہتا۔

اس مرتبہ لالہ لگ بھگ بیس دن کے بعد آئے۔

آئے بھی تو یوں کہ دستک نہیں دی۔ شام اور رات کے جھٹپٹے میں اندر داخل ہوئے اور دروازے کے اندرونی حصے میں چپ چاپ کھڑے ہو گئے۔ عزت النساء، باورچی خانے میں کھانا تیار کر رہی تھیں۔ انہوں نے کوئی آواز نہیں سنی تھی۔ مگر کچھ عجب سی بے چینی کا احساس ہوا۔ وہ کام ادھورا چھوڑ کر باہر نکلیں، سب حسب دستور تھا۔ جلال الدین اپنے بستر پر پڑا ہوا تھا، بچے لالٹین کی روشنی میں پڑھ رہے تھے، چھوٹا بیٹا سو گیا تھا.... انہیں اطمینان ہوا، اپنے کام میں مشغول ہو گئیں ...... مگر دو چار منٹ بعد پھر انہیں کچھ...... معمول سے الگ محسوس ہوا..... وہ سمجھ نہیں پا رہی تھیں کہ دل بے کل کیوں ہے...... پھر پتہ نہیں ان کے من میں کیا آیا۔ وہ دروازے کی طرف متوجہ ہوئیں۔ ذرا آگے بڑھیں، پورا اندھیرا نہیں چھایا تھا...... دروازے کے نزدیک پہنچتے پہنچتے پہچان گئیں..... لالہ چپ چاپ کھڑے تھے!

"ارے آپ کتنی دیر سے کھڑے ہیں؟ دستک کیوں نہیں دی؟"

"ہمت نہیں ہوئی۔" لالہ بہت مری ہوئی آواز میں بولے۔

"آپ بھی لالہ جی.... کمال کے آدمی ہیں.... آیئے آیئے۔"

وہ پیچھے پیچھے باہری بیٹھک کی طرف آئے اور چپ چاپ بیٹھ گئے۔

"میں پانچ منٹ میں آتی ہوں۔ چولہے پر سبزی چڑھی ہوئی ہے۔" وہ کہتی ہوئی باورچی خانے کی طرف لپکیں۔

جلدی سے انہوں چائے کی کیتلی چولہے پر چڑھائی۔ طشتری میں اس دن بازار سے لایا کچھ ناشتہ رکھا اور پھر ٹرے میں چائے،

پانی اور ناشتے کی طشتری سجا کر باہری بیٹھک کی طرف بڑھیں۔

"ارے یہ کیا کیا آپ نے؟" لالہ ان کے ہاتھوں میں ٹرے دیکھ کر دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔

"لالہ جی۔" عزت النساء کی ہنسی میں اداسی بھی شامل تھی۔ "اس میں میری بہت تھوڑی سی صرف محنت لگی ہے۔" انہوں نے 'صرف' پر زور دیا۔

"بی بی۔" لالہ ہاتھ جوڑے بولے۔ "جو چاہئے سزا دے لیجئے مگر آپ کا دل دکھانا میرا

مقصد نہیں تھا۔"

عزت النساء مدتوں بعد، پہلی مرتبہ آواز کے ساتھ ہنسیں، ایک لمحے کے لئے انہیں لگا کہ غم کے بادل چھٹ گئے۔ لالہ پہلی مرتبہ کچھ دیر تک رکے، تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ، پہلی مرتبہ باتوں کا رخ عزت النساء کے میکے کی طرف مڑا، اور یوں مڑا کہ خود انہیں اندازہ ہی نہیں ہو سکا کہ وہ حال کے جلتے سلگتے ریگستانوں سے ماضی کی نرم اور ٹھنڈی چھاؤں میں کیسے پہنچ گئیں۔ وہ مائکے کے کمروں، دالانوں اور آنگنوں میں چوکڑیاں بھرتی رہیں، بالا ریز سے گلی میں مداری کا تماشہ دیکھتی رہیں، باپ کی شفقت، ماں کی ممتا، بہنیں، بھابھیاں، سکھی سہیلیاں، محبت کرنے والے بھائی اور ہلکی ٹھنڈی پھوار کی طرح انگ انگ میں اترتا اور سارے آپے سراپے کو شانت کرتا سمئے ۔۔۔۔۔

عزت النساء بولتی رہیں اور لالہ بس ایک ٹک انہیں دیکھتے رہے اور سنتے رہے۔ مسجد سے عشاء کی اذان کی آواز گونجی تو وہ چونک اٹھیں۔ "ارے اتنا وقت ہو گیا؟"

لالہ ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ "معاف کیجئے گا، میں نے آپ کا بہت وقت برباد کیا۔"

"نہیں لالہ، تم نے تو مدتوں بعد مجھ ابلا کو وقت کی قید سے آزادی دلائی۔" عزت النساء نے سوچا مگر بولیں نہیں۔

لالہ کرسی سے اٹھے، آہستہ آہستہ چلتے ہوئے باہری دروازے تک آئے۔ عزت النساء منتظر تھیں کہ وہ باہر جائیں تو دروازے کا قلابہ اب لگا ہی دیا جائے۔ مگر لالہ ڈیوڑھی پر قدم رکھتے رک گئے۔ دو قدم پیچھے ہٹے اور بی بی کے بہت قریب آ گئے۔ بی بی نے حیرت سے انہیں محسوس کیا۔

"ایک بات کہوں؟" لالہ کی آواز بہت بوجھل اور گھبرائی گھبرائی سی تھی۔

"کہئے۔" عزت النساء کی حیرت کا عرصہ ابھی مختصر نہیں ہوا تھا۔

"برا تو نہیں مانئے گا؟"

"اب تک آپ کی کسی بات کا برا مانا ہے؟"

"گھر آنے سے منع تو نہیں کر دیجیے گا؟"

"آتا کون ہے؟"

"عرض کروں؟"

"ارشاد فرمایئے۔"

''میں آپ کو....سورج کی روشنی میں.....ایک مرتبہ.....جی بھر کے دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''یہ کیسے ممکن ہے؟''

''کیوں؟''

''اس میں حرج کیا ہے؟''

''بات سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ یہ صحیح ہے کہ میرے میکے اور سسرال دونوں طرف، میری خبر لینے والا یا میری گرفت کرنے والا کوئی بچا نہیں، سب پاکستان جا چکے۔ اردگرد کے زیادہ مکانات شرنارتھیوں کو دیئے گئے۔ یہ بھی صحیح کہ پرانے ملنے والوں میں جو لوگ بچے ہیں، ان میں زیادہ تر سے، جلال الدین کے مزاج اور بدکلامی کے سبب دوری بلکہ دشمنی کا جو رشتہ قائم ہوا، وہ اب، جب ہم خود محتاج ہو چکے، بھلا دوستی میں کیوں بدلنے لگا۔ اس کے باوجود نزدیک و دور کی گلیوں میں غریبوں کے کچھ گھر تو بچ ہی گئے ہیں۔ ان کی بچیاں پڑھنے آتی ہیں۔ کبھی کبھی بچیوں کی مائیں، بہنیں بھی دن رہتے ہی آتی ہیں ان سبھوں کو شرنارتھیوں سے ڈر لگتا ہے۔ پھر میں آپ کو دن میں کیسے بلاؤں؟''

اچانک لالہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے۔ ان کا منہ اوپر اٹھا ہوا تھا اور دونوں ہاتھ جڑے ہوئے تھے۔

''بی بی! میں مر جاؤں گا.....مجھے تھوڑی سی سانس.....تھوڑی سی ہوا کی ضرورت ہے۔''

لالہ کی آواز کی سمفنی میں آنسوؤں کی آمیزش کا احساس بہت طاقت ور تھا۔

عزت النساء کو محسوس ہوا کہ گھٹنوں کے بل جھکا ہوا یہ آدمی لالہ ہر بیر پرشاد نہیں ہے.....

یہ تو کوئی پیاسی چڑیا ہے جو گرمی کی بھری دوپہر میں پیاس سے چھٹپٹا رہی ہے۔ عزت النساء کا جی چاہا.....پہلی مرتبہ جی چاہا کہ......''

وہ بالکل بے خود ہو کر لالہ کے ماتھے کی طرف جھکیں.....ان کے دونوں ہاتھ لالہ کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لینے کے لئے بیتاب تھے.....وہ کانپتی تھرتھراتی لالہ کے ماتھے کی طرف جھکتی محسوس ہو رہی تھی۔

گھٹنوں کے بل بیٹھے لالہ کی آنکھیں اس انداز میں بی بی عزت النساء کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں جیسے بی بی کا چہرہ نہ ہو بادل کا وہ ٹکڑا ہو جسے برسات کو ترستا کسان حسرت سے تکتا ہے۔

بی بی کا لالہ کی طرف جھکتا چہرہ اور لالہ کی پیاسی آنکھیں......یہ منظر جھما جھم برستے اندھیرے

نے دیکھا، ڈیوڑھی کی چاروں طرفوں نے دیکھا، آسمان کے اس ٹکڑے نے دیکھا جس کا ناموجود شامیانہ ان دونوں پر تنا ہوا تھا۔

مگر پل بھر میں منظر بدل گیا..... بی بی لالہ کے ماتھے کی طرف جھکتے جھکتے اچانک رک گئیں ..... پھر بڑی مشکل سے ... لالہ کی طرف جھکتی ہوئی عزت النساء ..... آہستہ آہستہ کھڑی ہوئیں اور رندھی آواز میں بولیں۔ "لالہ! میرا جینا مشکل مت کیجئے۔ میرے سر پر بڑا بوجھ ہے۔"

لالہ تڑپ کر کھڑے ہو گئے۔ عزت النساء کے آنسو لالہ کے ہاتھوں پر جھلمل جھلمل کر رہے تھے۔ لالہ بڑے احترام سے اپنے ہاتھوں کو ہونٹوں تک لائے، پھر ان پیاسے ہونٹوں نے بی بی کے آنسوؤں کو جیسے چوم لیا اور لالہ کی آواز قرنہا قرن کی مسافت طے کرتی، عزت النساء تک پہنچتی محسوس ہوئی: "بی بی، مریں آپ کے دشمن۔ آپ یہ سارا بوجھ تنہا کیوں اٹھائیں؟"

"لالہ آپ جائیے۔ اب مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا ہے۔" عزت النساء نے ہاتھ جوڑ لیا اور لالہ تڑپ گئے۔

"بس بی بی ..... بس۔ میں جاتا ہوں۔" وہ آگے بڑھے پھر رک گئے۔ آہستہ سے کہا۔

"اسے لیتی جائیے۔" لالہ نے ایک پیکٹ ان کی طرف بڑھایا۔

"کیا ہے؟"

"مجھے اتنا تو یقین ہو گیا ہے کہ آپ میری شردھا ٹھکراتی نہیں ہیں۔" لالہ کے لہجے میں ذرا سی شگفتگی تھی۔

عزت النساء آہستہ سے مسکرائیں..... "اچھا خدا حافظ!"

دروازے کا قلابہ لگا کر عزت النساء اس کمرے میں آئیں جس میں نہ شوہر تھا نہ بچے۔ انہوں نے پیکٹ کھولا۔ پیکٹ میں سب بچوں کے کپڑوں کے ساتھ ایک ساری بھی تھی۔ اور ایک لفافے میں پانچ سو روپے۔ اچانک عزت النساء کو یاد آیا کہ پچھلی مرتبہ لالہ نے جو روپے دیئے تھے، اس پر ایک ماہ کی مدت گزر چکی۔

"خداوندا! میں کیا کروں؟" عزت النساء آہستہ سے بڑبڑائیں۔

اس سوال کا جواب عزت النساء کو کبھی نہیں مل سکا۔ البتہ لالہ ایک ہفتہ بعد آئے۔ عزت بی بی دروازہ کھول کر پیچھے ہٹیں کہ وہ اندر آ جائیں۔ مگر لالہ خلاف توقع ڈیوڑھی پر ہی کھڑے رہے۔

''کھڑے کیوں ہیں؟ اندر کیوں نہیں آتے؟''

''نہیں۔ اندر نہیں آؤں گا۔ یہ خط آپ پڑھ لیجئے گا۔''

لالہ نے ایک لفافہ ان کی طرف بڑھایا اور لمبے ڈگ بھرتے ہوئے رات کے اندھیرے میں تحلیل ہو گئے۔

عزت النساء نے کمرے میں آ کر لالٹین کی لو تیز کی۔

''میں خود کو مجرم محسوس کرنے لگا ہوں..... آپ کی مجبوری کا ناجائز فائدہ اٹھانے کا مجھے کوئی حق نہیں.....

مجھے آپ کی خدمت کرنی ہے، وہ میں تاحیات کئے جاؤں گا۔ اس خدمت کا اجر صرف آپ کی خوشی ہے..... مجھے بس تھوڑی سی سانس..... تھوڑی سی ہوا کی ضرورت ہے..... لالہ ہریہر پرشاد

''پیلی کوٹھی'' بائی پاس روڈ پر، پہلے بائیں موڑ کی دوسری گلی کا آخری مکان۔

موجود رہنے کا وقت۔ گیارہ بجے دن سے دوپہر دو بجے تک۔۔۔ بدھ اور اتوار۔

دوسرے دن اتوار تھا۔

بی بی عزت النساء تین بجے سہ پہر کے قریب گھر میں داخل ہوئیں۔ وہ لالہ کی لائی ساری پہنے ہوئی تھیں۔

گھر میں داخل ہوئیں تو دیکھا، محلے کی ایک عورت ان کا انتظار کر رہی تھی۔ اسی دن، مغرب بعد، اس کے یہاں محفلِ میلاد شریف تھی۔

میلاد شریف میں جانے کے لئے بی بی عزت النساء نے جلال الدین کی خریدی ایک پرانی ساری نکالی، زیب تن کیا، وقت سے ذرا پہلے ہی محفل میں حاضر ہو گئیں اور میلاد انہوں نے ایسے الحاح وزاری سے پڑھا کہ سننے والوں کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ خود عزت النساء کی آنکھوں سے بھی آنسو تھے کہ رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

بی بی عزت النساء روئے جا رہی تھیں اور جھوم جھوم کر پڑھے جا رہی تھیں۔

خدا کے قہر سے روزِ جزا، بچا لینا
بہت ہوں عاجز و لاچار، یارسولؐ اللہ

☆☆☆

مور پاؤں

شام ابھی گہرائی نہیں تھی مگر طبیعت الجھی سی گئی تھی۔

کبھی کبھی خیال آتا کہ شاید بیٹی ہی ٹھیک کہہ رہی ہو، عمر کا اثر بھی تو رنگ لاتا ہی ہے مگر ہر آدمی عمر ڈھلنے پر اب ایسا خفقانی تو نہیں ہو جاتا، یا شاید موسم کی وجہ سے الجھن پیدا ہو گئی ہو، بنگال کا سیلاب، اڑیسہ کا طوفان، گجرات کا فساد.... سارے میں تو اتھل پتھل مچی ہوئی ہے۔

مگر کیا طبیعت کے الجھاؤ کا اصل سبب واقعی یہی سب کچھ ہے؟

میں ابھی کسی فیصلے پر نہیں پہنچ پایا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میرے ملاقاتی اروند کمار مجھ سے ملنے آئے تھے۔

نواسے نے دروازہ کھولا اور پرنام ناناجی کہتا ہوا انہیں ڈرائنگ روم میں لے آیا۔

میں نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے ایک ہاتھ اٹھا کر آداب عرض کیا۔ اروند کمار نے دونوں ہاتھ جوڑ کر زور سے کہا "پرنام، پرنام"!

میں پھر الجھ سا گیا مگر خموشی کے علاوہ چارۂ کار کیا تھا؟

"کہاں تھے آپ اتنے دنوں"؟ میں نے اروند کمار کی طویل غیر موجودگی کی وجہ جاننی چاہی۔

"ارے بندھو! میں یہاں تھا ہی نہیں۔ پہلے تو میں اجودھیا چلا گیا، رام للّٰہ کے درشن کرنے، وہاں سے کمبھ اشنان کی اکچھا تھی، الٰہ آباد گیا۔ وہاں دو دن اور رکنا پڑا۔ آر۔ ایس۔ ایس کی ایک سبھا میں سمیلت ہونے کے لئے"۔

میں اروند کو آنکھیں پھاڑے دیکھتا رہا..... اجودھیا..... آر۔ ایس۔ ایس..... انھیں ذرا

بھی ہچکچاہٹ نہیں ہورہی ہے؟

اروند مار میرے تجھے ملنے والوں میں ہیں.....اور یہ؟

مگر یہ ایک ضمنی بات ہے۔طبیعت کے الجھاؤ کا یہ بھی سبب نہیں بن سکتا۔ جب ہم لوگوں کی گلی گلی محلے محلے میں بینر اور اسٹیکر لگا رہتا ہے'' فخر سے کہو ہم مسلمان ہیں'' تو ہندوؤں کو بھی کچھ لوگ یاد دلا سکتے ہیں کہ'' گورو سے کہو ہم ہندو ہیں'' اور جب مسلمان مسلمان ہونے کی وجہ سے جماعت اسلامی، تبلیغی جماعت، بریلوی جماعت کہیں بھی جانے پر شرم محسوس نہیں کرتا تو ہندو بیچارہ اگر فخر سے کہے کہ ہم ہندو ہیں یا علی الاعلان بتائے کہ ہم آر ایس ایس کی سبھا میں گئے تھے تو اس سے الجھن کیوں پیدا ہو۔ میں نے اپنا سر جھٹکا اور اروند جی کو ہنس کر مبارک باد دی۔

'' بدھائی ہو، آپ کمبھ اشنان کر آئے ۔ہم لوگوں کے لئے پرشاد لائے کہ نہیں''؟ پتہ نہیں، ان کی آر ایس ایس کی سبھا میں شرکت والی بات میرے ذہن سے کیوں نکل گئی۔

'' ارے ایسا کیسے ہوتا''؟ انھوں نے ہنس کر کہا۔'' الہ آباد کا امرود لایا ہوں''۔ انھوں نے اپنے جھولے میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ پتہ نہیں، میری پرشاد والی بات ان کے ذہن سے کیوں نکل گئی۔

اسی بیچ تین چار ملنے والے اور آ گئے۔

اصل میں معاملہ یہ ہے کہ میرے داماد کا ٹرانسفر اجمیر ہو گیا تو میرا اجمیر جانا بار بار ہوتا رہتا ہے۔اب ریٹائرمنٹ کے بعد تو آدمی آزاد پرندہ ہو جاتا ہے۔ بیٹے اپنی اپنی بیویوں کے ساتھ اپنی اپنی نوکریوں پر۔ بیوی بیچ راہ میں ساتھ چھوڑ گئی، خدا سے جا ملی۔ ہماری ایک ہی بیٹی ہے۔ ننھی منی پری جیسی چھب والی گڑیا۔ ماں کی راج دلاری، بابا کا نین تارہ۔ بڑا بیٹا امریکہ میں نوکری کرتا تھا وہیں ایک شریف رشتہ دار کی بیٹی سے رشتہ طے ہو گیا۔ چھوٹا شروع سے شیطان تھا، اپنی پسند منوانے کا عادی، شادی میں بھی اپنی پسند پر اڑ گیا۔ شروع میں تو دل کو کھٹکا لگا رہا، انجان لوگ، انجان ماحول، پتہ نہیں یہ نیا ماحول اسے راس آئے گا کہ نہیں مگر شکر کہ بیٹا بہو دونوں کنیڈا میں ہیں اور اپنی دنیا میں مست ہیں۔

دونوں بیٹوں کے باہر چلے جانے کے بعد بیوی بالکل الف گھوڑے کی طرح اڑ گئی کہ '' داماد تو ایسا ہی لاؤں گی جو ہندوستان میں ہو اور سرکاری ملازم ہو تا کہ نوکری چھوڑ کر باہر نہ

بھاگ سکے۔ آخر اس کی ضد اور کوشش رنگ لائی۔ الہ آباد کا ایک گھر اس کی بیٹی کی سسرال بنا۔ شریف لوگ ہیں، کبھی کسی شکایت کا موقع نہیں ملا۔ داماد نوکری کے سلسلے میں کبھی دہلی کبھی بھوپال کبھی کہیں کبھی کہیں۔ ان دنوں اجمیر میں ہے۔ بیٹی داماد نواسہ نواسی چھوڑتے نہیں اس لئے سال میں دو تین مرتبہ آ جاتا ہوں۔

باپ دادا وہابی خیالات کے تھے۔ میں ٹھہرا آزاد خیال، وہابیوں کی شدت پسندی سے میرا کبھی نباہ نہ ہو سکا۔ صوفیوں کے بارے میں سوچا تو لگا کہ تہذیب کی طرف اس جرگے کا جھکاؤ کچھ زیادہ ہے۔ اب خسرو سے استاد بسم اللہ خاں تک وراثت کے اتنے لمبے سلسلے کو کیسے چھوڑ دیا جائے۔ صوفیا کا وحدت الوجود اور ہندوؤں کا ویدانتی فلسفہ، ایک روحانی تھرل محسوس ہوتا ہے سوچنے میں۔ ادھر قرۃ العین حیدر نے بھی کثرت میں وحدت کا ایک بڑا لمبا چوڑا اور مرعوب کرنے والا تصوراتی نگارخانہ سجا ہی دیا ہے۔

مجھے لگتا ہے کہ اسی پس منظر نے مجھے زیادہ Feed کیا ہے، باقی جو بچا وہ میری اپنی اشتراکیت کی کمائی ہے جس کا اب ہر جگہ ذکر کرنے کی آسانی نہیں رہی۔ جب تک داما. بھوپال میں رہا تو کوئی مسئلہ نہیں تھا یہ شہر نوابوں کی وضع داری کا مرکز رہا ہے اور ایک ترقی پسند حلقہ وہاں اب بھی موجود ہے مگر اجمیر میں ذرا مشکل ہوگئی۔ ملنے والے آتے تو موضوع تلاش کرنا پڑتا۔ شام ابھی گہرائی نہیں تھی مگر طبیعت الجھ سی گئی تھی۔

سامنے صوفے پر اروند کمار، درگا پرشاد، لکشمن ترویدی اور ایک ملنے والے، عید محمد انصاری۔

اروند کمار یہاں یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر تھے، درگاہ پرشاد کسی محکمے میں انجینئر تھے اور اب میری طرح ریٹائرڈ لائف گزار رہے تھے۔ لکشمن ترویدی ٹاؤن کانگریس کمیٹی کی مجلس عاملہ کے ممبر تھے اور پارٹی کے ایک سینئر ممبر کی حیثیت سے پارٹی میں ان کی بڑی عزت تھی۔ عید محمد انصاری ادھیڑ عمر کے آدمی تھے، سینچائی محکمے میں جونیر انجینئر تھے یہ دراصل میرے داماد کے ملنے والوں میں سے تھے مگر ادھیڑ عمر ہونے کی وجہ سے میری محفلوں میں بھی کھپ جاتے تھے۔ ان کے محکمے کے کوارٹرس بھی یہیں پر تھے اس لئے اسی علاقے میں رہنا ان کی مجبوری تھی۔

بیٹی داماد لوگوں کی دعوت کرنے کے شوقین تھے۔ ملنے والا خواہ میرا ملاقاتی ہو یا داماد کا، بیٹی کا دل اور دسترخوان دونوں ہمیشہ کھلا اور بڑا رہتا۔ اروند کمار، درگا پرشاد یا لکشمن جی کے گھر

والوں کا یہ مزاج نہیں تھا۔ عید محمد بیچارے نے تو کبھی اپنے گھر بلایا ہی نہیں۔

پس روز محفل جمتی اور دھڑ لے سے جمتی۔ اس دن بھی محفل جمی ہوئی تھی، اروند کمار برفی کھا رہے تھے اور بول رہے تھے "درگا بابو! اب کے تو ہم نے سنگھ سبھا میں صاف صاف کہہ دیا کہ ہندوتو کا مطلب کیول سبھیتا ہے دھرم نہیں۔ پورے بھارت ورش کی سبھیتا ایک ہے۔ کیا ہندو کیا مسلمان سب بھارت ماتا کی سنتان۔ اور بھارت ماتا کو بچانے کے لئے سبھیتا کی سمانتا انی وار یہ ہے۔" میرا جی چاہا کہ میں اروند جی سے پوچھوں کہ کس سمانتا کی بات وہ کر رہے ہیں۔ صرف اپنے بہار میں مگہی، بھوج پوری اور میتھلی تین بڑی سبھیتا ئیں تو آج تک زندہ ہیں۔ اتر دکھن کے کھانے پہننے میں جو فرق ہے، بول چال شادی بیاہ میں جو فرق ہے، اس کو آپ سبھیتا کی سمانتا کیسے سمجھ رہے ہیں۔ مگر میں نے کہا نا۔ شام ہی سے طبیعت الجھی ہوئی ہے۔ ہو سکتا ہے بہت دیر تک پڑھنے کا اثر ہو۔ اصل میں کئی دن ہوئے، داماد نے کلیشور کی کتاب "کتنے پاکستان" لا کر دی تھی۔ آج صبح سے اس میں غرق ہوا تو شام ہو گئی۔ لگاتار پڑھنے کی عادت اب چھوٹ گئی ہے۔ ممکن ہے لگاتار پڑھنے ہی سے سر بھاری ہو گیا ہو۔ ممکن ہے سر بھاری ہونے کی وجہ سے طبیعت الجھی الجھی محسوس ہو رہی ہو۔

بہر حال! طبیعت تو الجھی گئی تھی۔ اروند جی کی بات پر بولنے کی خواہش ہوئی، پھر لگا، سب بیکار ہے۔ بروقت میں ہی کیا بولوں، لوگ تو بول ہی رہے ہیں۔

لوگ بول رہے تھے۔ درگا پرشاد تو اروند جی کی بالکل ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔ لکشمن ترویدی کانگریس کے آدمی ہیں اس لئے اروند جی کی حمایت میں بہت کم بولتے ہیں۔ آج بھی انھوں نے ایک پہلو پیدا کیا۔ کہنے لگے:

" سبھیتا کی سمانتا کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سارے لوگ ایک سا کپڑا پہننے لگیں، ایک سا کھانا کھانے لگیں، ایک سی بولی بولنے لگیں۔ ایسا ہونا NATURAL بھی نہیں ہے۔ سبھیتا کی سمانتا کا مطلب ہے بھارتیتا کا اندر اندر پنپنا اور باہر باہر اس کا اس طرح ابھرنا کہ بھارت ماں ایک MODEL ہمارا OBJECT کے طور پر بنے اور ہم اس کے آگے اپنے کو پورا پورا سمرپت کر سکیں"۔

میں نے حیرت سے لکشمن ترویدی کو دیکھا: "یہ آدمی کانگریس کا آدمی ہے؟ اس نے 'انڈیا ونس فریڈم' تو چھوڑیے۔ نہرو جی کی 'ڈسکوری آف انڈیا' بھی نہیں پڑھی؟ سامنے کی بات UNITY IN DIVERSITY کے پل کو توڑ کر یہ کس قسم کا اوبڑ کھابڑ DIVERSION بنا رہا ہے"؟

مگر میں نے کہا نا۔ کملیشور کی کتاب " کتنے پاکستان" بہت دیر تک پڑھتے رہنے سے سر بھاری سا ہوگیا تھا۔ اتفاق کی بات کہ میرا ایک بھائی ہے جو پاکستان میں رہتا ہے، کتاب پڑھنے کے دوران ہی اس کا فون آگیا اور بات کرتے کرتے بے ساختہ، لاشعوری طور پر، بغیر سوچے سمجھے میری زبان سے ایک جملہ سلپ کر گیا: " تم لوگ نفرت اور گھناؤنے پن کی علامت ہو"۔

" بھیا بھیا"۔ وہ اس اچانک حملے سے بالکل UPSET ہو کر ہکلانے لگا.... کک..... کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟ آپ ایسے کیوں بول رہے ہیں؟

فوراً ہی مجھے بھی احساس ہوا کہ جملہ غلط ادا ہوگیا، میں نے گفتگو کو پٹری پر لانے کی کوشش کی مگر شاید اس کا بھی جی اچاٹ ہوگیا تھا اور میں تو اندر اندر شرمندگی محسوس کر ہی رہا تھا۔ اب پتہ نہیں، فون کدھر سے ڈس کنکٹ ہوا۔

" بیچارہ میرا بھائی"۔ مجھے اس پر بڑا ترس آیا۔ وہ کسی نظریے کے تحت تو پاکستان گیا نہیں تھا۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۰ء کے بیچ بھی نہیں گیا کہ یہ کہا جائے کہ بھیڑ کی نفسیات کا حصہ بنا۔ وہ تو اچھا بھلا ایک بینک میں کیشیر تھا۔ چین سے اپنے بال بچوں کے ساتھ اس کی صبح ہوتی تھی اور رب کا شکرادا کرتے ہوئے رات میں سوتا تھا۔ اسی بیچ اس کا تبادلہ شہر سے کنارے کے علاقے میں واقع ایک برانچ آفس میں ہوگیا۔ وہاں کام کم تھا، آرام زیادہ ملا مگر ہونی کو کون روک سکتا ہے، ایک روز شام میں کیش لے کر ہیڈ آفس جا رہا تھا۔ ساتھ میں سپاہی بھی تھے مگر سب مٹی کے مادھو۔ غنڈوں نے حملہ کیا اور لاکھ روپے لوٹ کر لے گئے۔ تفتیش شروع ہوئی، سپاہیوں میں ڈی آئی جی صاحب کا ایک رشتہ دار بھی تھا، سب سپاہی صاف چھوٹ گئے۔ پیسہ اسی محلے کے غنڈوں سے برآمد ہوا جس محلے میں بھائی رہتا تھا۔ غنڈوں نے اقبالیہ بیان میں بھائی کو بھی اپنا ساتھی بتادیا۔ گاج آخر میں بھائی پر بھی آگری۔ وہ لاکھ رویا گایا چھٹپٹایا، منت سماجت کی مگر قانون کا تو اپنا طریقہ ہے، بھائی کے بیانِ صفائی پر غنڈوں کی گواہی بھاری پڑی۔ گرفتاری کی نوبت آگئی۔ کمزور آدمی، پناہ کی تلاش میں ادھر ادھر دوڑا مگر دوسروں کو کیا دوش دوں میری ہمت نہیں ہوئی کہ اسے اپنے گھر میں چھپالوں۔ اس وقت اس کو صرف ایک پناہ گاہ کی تلاش تھی۔ عرب امریکہ کہیں بھی وہ جاسکتا تھا مگر پاسپورٹ کہاں تھا؟ لے دے کہ ایک پاکستان بچا تھا جہاں الیاس احمد جیسا " ساہتیہ اکیڈمی انعام یافتہ" بھی گردنیا پاسپورٹ سے گھوم آیا۔ یہی پاسپورٹ میرے بھائی کے بھی کام آیا، اور میں؟

لعنت ہے مجھ پر کہ میں عام آدمی کی مجبوری کو نفرت اور گھناؤنے پن کا استعارہ قرار دے رہا ہوں۔

"مگر میری الجھن کا اصل سبب کیا یہی ہے؟ میں نے اپنے کو پھر ٹٹولا تو اندر سے پھر جواب آیا۔ "نہیں"!

پھر طبیعت بند بندی کیوں ہے؟ کسی کام میں جی نہیں لگ رہا ہے۔ اجمیر کی شام تو بہت دلچسپ ہوتی ہے۔ پہاڑوں سے گھرا یہ شہر، ماحول اور منظر کے لحاظ سے توجہ کھینچنے والا شہر ہے۔ جاتی سردیوں کی شام، پہاڑوں پر آہستہ آہستہ اترتی دھند، حدِ نظر تک درختوں کا ایک لمبا سلسلہ، آشوک، چیڑ، پیپل، نیم، دیودار اور ببول کے چھوٹے بڑے سایوں میں گھرے کوارٹروں پر آہستہ آہستہ اترتا اندھیرا، پہاڑوں پر بنے مندروں میں جلتے قمقمے، ہوا کی لہروں کے ساتھ نیچے اترتی بھجن کیرتن کی آوازیں، درختوں کی طرف اوپر پرواز کرتے پرندے۔

ایسے من موہ لینے والے، شام کے اس مہربان لمحے میں، میری طبیعت بند کیوں ہے؟

کون سی ایسی الجھن اندر اندر بنگل مار کے بیٹھ گئی ہے جس کا پہچاننا مشکل ہو گیا ہے؟

جتنی دیر ملنے والے بیٹھے رہے، میری طبیعت الجھتی رہی، سچ پوچھیے تو اس دن میں صرف سنتا رہا، بلکہ اور سچ پوچھیے تو میں نے سامنے بیٹھے ملاقاتیوں کی ساری باتیں سنی بھی نہیں، وہی بولتے رہے وہی سنتے رہے، پھر روز کی طرح جب انھیں اٹھنا تھا، اٹھے اور چلے گئے۔

میری طبیعت کے اٹ پٹے پن کو میری بیٹی داماد نے محسوس کر لیا۔ دل کا مریض ہوں اس لئے دونوں ہی گھبرا گئے۔ داماد کہنے لگا: "ابو جی! ڈاکٹر کے یہاں چلیے گا؟ کہیے تو فون کروں"؟ میں نے سختی سے انکار کیا اور دونوں کو اطمینان دلایا کہ کوئی بات نہیں ہے، پھر بھی بیٹی تیل کی شیشی لئے چلی آئی۔ "ابو، لیٹیے، تیل لگا دوں"؟ نواسے نواسی بھی آج شانت تھے۔ میرے چھوٹے والے شریر نواسے کو بھی شاید ماں نے سمجھا دیا تھا۔ کھانے کے بعد وہ میرے بستر پر اچھل کود کرنے نہیں آیا۔

بیٹی داماد بہت دیر تک میرے پاس بیٹھے رہے اور اچھی اچھی میٹھی میٹھی باتیں کرتے رہے، پھر میرے سونے کا وقت ہوا تو بیٹی نے بلب آف کیا، نائٹ بلب جلایا، کھڑکیوں کے دروازے بھڑکائے، پھر میری طرف آئی:

"میں جاؤں ابو"؟

''ہاں بیٹا، بالکل جاؤ۔ میں ایک دم ٹھیک ہوں''۔ میں نے ہنس کر اس کے گال تھپتھپائے۔ اس نے فرطِ جذبات میں جھک کر میری پیشانی چومی اور اس کے منہ سے صرف اتنا نکلا......

''میرے ابو''!

نائٹ بلب کی مدھم روشنی میں بھی مجھے نظر آ گیا۔ اس کی آنکھوں کے گوشوارے نم ہو گئے تھے۔

میری وہ ساری رات عجب طرح سے ڈسٹرب ہوئی۔ نیند بار بار اچٹتی رہی، نیند ٹوٹنے پر ہر مرتبہ کمرے میں حبس کا احساس ہوتا رہا اور میں ہر مرتبہ خود کو سمجھاتا رہا۔ ابھی سردیاں ختم نہیں ہوئیں، حبس کا ہے کا؟ اور جب نیند بھی آئی تو بے خبری کی نیند مجھے میسر نہ ہو سکی۔ نیند کے ہر ٹکڑے میں کوئی نہ کوئی اٹ پٹا سا خواب اٹکا پڑا تھا۔

ایک مرتبہ دیکھا کہ اجمیر کے سارے پہاڑ اجمیر کے روضے پر گر پڑے ہیں اور اس چور چور ملبے سے ذرا ہٹ کر ایک بزرگ ہاتھ میں پرانے زمانے کا ایک بکس لیے کھڑے ہیں۔ میں ان کے پاس گیا تو انھوں نے کہا: ''اب چلنا چاہیے''۔ میں نے کہا: ''بکس بہت پرانا ہو گیا ہے''۔ فرمایا: ''اندر سے سلامت ہے''۔ میں نے ذرا بچوں کے انداز میں ضد کی: ''راستے ہی میں تو جے پور پڑے گا وہاں سے نیا لے لیں گے''۔.......... اس پر وہ ہنسے بھی، اور مجھے ڈانٹ بھی پلائی: ''تیرا باپ صادق پوریوں کا شیدا اور تو پیغمبر بے کتاب کا عاشق۔ تجھے میں جے پور تو نہیں جانے دوں گا''..... پھر بھی میرے چہرے بشرے کی ہچکچاہٹ شاید یہ ظاہر کر رہی تھی کہ پرانے بکس کے ساتھ سفر میرے لیے مسئلہ بن رہا ہے۔ سو انھوں نے پیار سے میری پیٹھ پر تھپکی دی اور فرمایا: ''چلو چلو، خسرو زادِ راہ لے کر آ رہا ہوگا''۔

''مگر یہ''؟ میں نے چور چور ملبے کی طرف اشارہ کیا۔

''اس میں ابھی کچھ وقت لگے گا'' ان کی آواز تھکی تھکی سی تھی مگر اس میں ناامیدی کا عنصر شامل نہیں تھا۔ پھر نیند ٹوٹ گئی، اور پتا نہیں کتنی دیر بعد دوبارہ نیند آئی۔

اب کے بڑا عجیب منظر تھا۔ کہیں کوئی سجا سجی ہوئی تھی اور اس میں تانڈو رتیہ پر کوئی تمثیل پیش کی جا رہی تھی۔ اس تمثیل میں فلیش بیک کا جھماکہ ہو رہا تھا، منظر پر منظر بدل رہا تھا۔ کبھی کسی میدانِ جنگ کا منظر جس میں دونوں طرف ایک ہی طرح کا نعرہ، کسی نہر کے کنارے

چھ مہینے کے کسی بچے کا تیروں سے چھدا لاشہ، کبھی نا قابلِ جنگ (اید ھیہ) شہروں پر میزائل برسانے کا منظر۔ پھر پردہ گر جاتا اور نیا منظر سامنے آتا۔ بھری سبھا میں ایک دیور اپنی بھابھی کو بے ستر کر رہا ہے، ایک عورت کو اپنی پاک دامنی ثابت کرنے کے لئے ''اگنی پریکشا'' دینی پڑ رہی ہے۔ منظر پر منظر بدلتا رہتا ہے۔ ایک بیٹا اپنے باپ کو قید کر رہا ہے، بھائی کے ساتھ نو برس کے بھتیجے کو بھی قتل کر رہا ہے۔ ہزاروں کی بھیڑ عبادت گاہ ڈھا رہی ہے۔ باپ بیٹی کے ساتھ ہم بستر ہو رہا ہے۔ برہنہ عورتوں کا جلوس دوڑ رہا ہے اور پیچھے سے ڈھیر سارے لوگ ان بھاگتی عورتوں پر قہقہہ لگاتے ہوئے جھپٹ رہے ہیں۔ ایک حاملہ عورت کا پیٹ چاک کر کے بچہ نکالا جا رہا ہے اور پھر اس بچے کو نیزے میں کھونس کر نیزہ پر اچھالا جا رہا ہے۔ تانڈو نرتیہ جاری ہے......ناچ......ناچ......''۔

ساری رات ایسے ہی اٹ پٹے خوابوں میں گئی۔

دوسری صبح اتوار تھا۔ ناشتے کی میز پر بے سوچے سمجھے میرے منہ سے نکل گیا: ''آج درگاہ چلا جائے''۔

''ہاں ٹھیک تو ہے''۔ داماد نے ہامی بھری اور بیوی بچوں کی طرف مخاطب ہو کر بالا: ''تم لوگ بھی تیار ہو جاؤ، سب چلتے ہیں''۔

داماد پھر اخبار پڑھنے لگا تھا جو پہلے سے اس کے ہاتھ میں تھا۔ اخبار پڑھتے پڑھتے اچانک اس کے چہرے پر چمک سی آ گئی اور میری طرف مخاطب ہو کر بالا: ''ابو! ایک اور ڈسکوری۔ مریخ پر پانی ہونے کا ثبوت ملا''۔

''مریخ کیا''؟ بڑے والے نواسے نے سوال کیا۔

MARS!۔ میں نے نواسے کی مشکل سمجھتے ہوئے اسے جواب دیا۔

''ارے واہ''!۔ نواسہ خوشی سے اچھل پڑا۔ تب تو LIFE EVEDERNCE بھی مل ہی جائے گا۔ مزا آ جائے گا''۔

''اب تو آدمی کے پیر کے TISSUE سے دوسرا آدمی بھی بن جا رہا ہے''۔ نواسی نے بھی اپنے علم کا پوز مارا۔

''اور چاند پر بھی آدمی پہنچ گیا''۔ چھوٹے میاں بھلا کیوں چپ رہتے۔

''عراق اور پاکستان میں دس محرم کے دن بم حملہ میں لگ بھگ ۲۵۰ آدمیوں کی جان

گئی''۔ٹی وی پر اسی وقت خبر آرہی تھی۔

میں نے سنا اور چپ رہا اور کیا کر سکتا تھا۔ پھر داماد نے گاڑی نکالی۔ ہم سب لوگ گاڑی میں بیٹھ گئے۔ گاڑی درگاہ کی طرف چل پڑی۔ جس وقت ہم لوگ درگاہ میں داخل ہوئے اس وقت درگاہ کے ایک گوشے میں قوال ڈھولک کی تھاپ پر لہک لہک کر گا رہا تھا:

ما کے کلیم روبہ شفا خانۂ مسیح
لعلِ شکر فروش توئی چارہ سازِ ما

درگاہ میں جیسا ہجوم پہلی مرتبہ دس برس پہلے دیکھا تھا۔ اس میں کچھ زیادتی ہی ہوئی ہوگی، کوئی کمی نہیں تھی۔ کوئی دیواروں سے سر ٹکراتا، کوئی در و دیوار چومتا، کوئی مزار کو بوسہ دیتا، کوئی مزار سے الٹے قدم باہر نکلتا، کسی کی آنکھیں گریہ سے لبریز، کبھی کے ہونٹوں پر استغاثہ اور فریاد..... موپہ کرپا کرو مہاراج معین الدین..... بھانت بھانت کے لوگ، عجیب عجیب ہیئت عجیب ادا....''۔

میں ایک کنارے کھڑا سب کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ ہر کچھ دن کے بعد یہاں آنے کی خواہش ہوتی ہے مگر میں یہاں کیوں آتا ہوں؟ اس کا مجھے علم کیوں نہیں ہو پاتا؟

اس وقت مجھے احساس ہوا کہ صرف اپنی الجھن ہی سے میں بے خبر نہیں ہوں۔ اپنی خواہش کا بھی مجھے پتہ نہیں۔ میرے اندر کوئی اور ہے جو مجھے بے چین رکھتا ہے، مجھے دوڑائے پھرتا ہے۔ مگر کیوں؟ وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے؟ کچھ دیر بعد میں نے داماد کی طرف دیکھا، وہ شاید میرا ہی انتظار کر رہا تھا، بچے بھی ادھر ادھر گھوم گھام کے ہم لوگوں کے پاس آچکے تھے۔

''چلا جائے''؟ داماد نے پوچھا۔''ہاں چلو''۔

''یہاں میری جان پہچان کے ایک خادم رہتے ہیں۔ ان کے یہاں چلا جائے ابو''؟ درگاہ کے احاطے سے باہر نکل کر داماد نے پوچھا۔

''کیا حرج ہے؟ چلو وہاں بھی ہو لیتے ہیں''۔

ہم لوگ جب خادم کے یہاں پہنچے تو خادم کی محفل جمی ہوئی تھی اور خادم صاحب بیان کر رہے تھے..... خواجہ کی شان اور طاقت کا کیا کہنا، تاریخ میں درج ہے کہ حضرت خواجہ کی کھڑاؤں نے تلوار کا کام کیا ہے اور وہ تو بہت پہلے کی بات ہے، ابھی حال کا ذکر سنیئے۔ گوالیار میں خواجہ کے ایک عاشق کے گھر حکومت کے کارندے چڑھ آئے اور انکم ٹیکس کا الزام لگا کے اس کا

گھر ڈھانے لگے۔ جب اس بیچارے کی کچھ نہ چلی تو اس نے وہیں سے فریاد کی: "المدد یا خواجہ"۔ اس آواز کا بلند ہونا تھا کہ حکومت کے کارندوں کے پیر زمین دھنس گئے اور جب تک انھوں نے معافی نہیں مانگی، زمین نے ان کے پیر آزاد نہیں کئے"..... حاضرین نے انتہائی عقیدت اور اقرار و اثبات کے انداز میں سر ہلایا اور مجھے لگا کہ حبس اور گھٹن کی شدت میری جان لے لے گی۔

"چلو چلو۔ یہاں سے جلدی چلو"۔ میں نے بچوں کو وہاں پر بیٹھنے بھی نہ دیا اور انہیں لے کر کوارٹر لوٹ آیا۔

"ابو کی فلاسفی اور فائن آرٹس سے دلچسپی انہیں صوفیوں تک پہنچاتی ہے مگر ان کی وہابیت ان کو وہاں سے کھینچ لاتی ہے"۔ چلتی گاڑی میں باہر کے مناظر دیکھتے ہوئے بیٹی آہستہ سے مسکرا کر بولی۔

میں بیٹی کی بات کا کیا جواب دیتا۔ مجھے "گھٹو" (Ghetto) کا معنی دیکھنے کی خواہش ہو رہی تھی۔ ویسے رات والے پہلے خواب کی تعبیر اب کچھ کچھ میری سمجھ میں آنے لگی تھی

گاڑی جب کوارٹر کی طرف مڑ رہی تھی، اسی وقت میں نے دیکھا۔ لکشمن ترویدی اپنے برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے اچانک یاد آ گیا، میں نے داماد سے کہا "بیٹا ایک تکلیف کر لو، لکشمن جی کو ذرا میرا اسلام پہنچا دو"۔

"خیریت ابو"؟

"ذرا ان سے ایک بات کرنی ہے"۔

"کون سی بات ابو؟" بیٹی کے لہجے میں تجسس تھا۔

"بتا دوں گا، پہلے تم بلا لاؤ"۔

تھوڑی دیر بعد لکشمن جی کوارٹر میں داخل ہوئے۔ میں تو ڈرائنگ روم کھولے ان کا انتظار کر ہی رہا تھا۔

"آیئے آیئے لکشمن جی۔ معاف کیجیئے گا۔ میں آپ کو بلا وقت تکلیف دی"۔

"ارے نہیں بندھو"۔ لکشمن جی نے دونوں ہاتھ جوڑ کر نمشکار کیا۔ اس میں کشٹ کا کیا پرشن؟ آج اتوار ہے۔ آج تو دن بھر ہم فری ہیں"۔

ہم باتیں کرنے لگے۔ اِدھر اُدھر کی، دنیا جہان کی باتیں، اتنے میں داماد چائے لے

آیا۔ چائے کے بعد میں نے الائچی پیش کی، انھوں نے دھنیہ واد کہتے ہوئے الائچی قبول کی۔
جس وقت وہ الائچی چھیل رہے تھے، اس لمحہ میں نے آہستہ سے کہا:

''کل آپ کی ایک بات نے مجھے بے چین کردیا''۔

''کون سی بات، بندھو''؟ انھوں نے بہت حیرت سے مجھے تکا۔

آپ نے کہا تھا: بھارت ماں کو ایک object کے طور پر ہمارا Modell بننا چاہیئے۔

''ہاں کہا تو تھا''۔

''آپ تو کانگریس کے بہت Active member ہیں۔ آپ کا یہ Defination سیکولرزم کی اسپرٹ سے میل نہیں کھا رہا ہے''۔

لکشمن جی نے چھیلی ہوئی الائچی ٹرے میں رکھ دی اور بہت آہستگی کے ساتھ لیکن بہت پر اعتماد لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر بولے:'' میں کانگریسی ضرور ہوں۔۔۔لیکن آپ نے مجھے سیکولر کیسے سمجھ لیا۔۔۔یہ غلط بات ہے۔۔۔میں ہندو ہوں''!

اس کے بعد لکشمن جی بھی چپ ہو گئے اور میری سمجھ میں بھی نہیں آیا کہ اب میں آگے کیا بات کروں؟ لکشمن جی میرے سامنے بیٹھے ہوئے تھے اور میں ان کے سامنے بیٹھا ہوا تھا، پھر بھی مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ ہم دونوں کے درمیان ایک عجیب سی بھیانک بے تعلقی پھنکار مار رہی ہے۔ میں شاید چاہ کر بھی اچانک ابھری اس بے تعلقی کو اکھاڑ پھینکنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ لکشمن جی نے ہی پہل کی:

''اور سنایئے۔کیا حال چال ہے؟ آپ لوگ ابھی کہاں سے لوٹے؟''

''درگاہ سے''۔ میں نے اپنی آواز کسی اندھے کنویں سے باہر آتی محسوس کی۔

''ارے تو ہمیں بھی کہا ہوتا۔ ہم بھی چلتے۔ اجمیر میں تو آستھا کا دوہی کیندر ہے، پشکر ناتھ دوسرے کھاجہ صاحب''!

پھر کچھ دیر تک وہ پشکر ناتھ اور خواجہ صاحب کی مہانتا اور بڑپن، انہونیاں اور کرامتیں بیان کرتے رہے۔ میں ان کی باتوں میں کسی نہ کسی طرح ان کا ساتھ دیتا رہا۔ آخر تو میرے بلاوے پر وہ میرے پاس آئے تھے۔

ان کے جانے کے بعد بیٹی داماد نے پوچھا تو جھوٹ بولنے کے علاوہ میرے پاس کوئی

چارہ نہیں تھا۔ لکشمن جی نے ایک مرتبہ جے پور کے ایک ہارٹ اسپیشلسٹ کا ذکر کیا تھا، اسی کے بارے میں پوچھنا تھا۔

''تو کیا پتا چلا''؟ بیٹی کا اشتیاق بڑھ گیا۔

''ان دنوں وہ انڈیا میں نہیں ہیں۔ باہر گئے ہوئے ہیں''۔ میں اپنے جھوٹ پر مطمئن تھا کیوں کہ یہ گفتگوان سے چند دنوں پہلے ہو چکی تھی۔

اتوار کہنے کو تو چھٹی کا دن رہتا ہے مگر یوں گزرتا ہے جیسے جوانی۔ دن گزر ہی گیا اور ایک شام پھر آ گئی! الجھنوں سے بھری شام۔

دو دن سے جو بے نام سی الجھن میرے وجود میں رچ بس گئی تھی، وہ اپنے آپے سراپے پہ کنڈل مارے کسی رُودالی کی طرح ہولے ہولے سیاپا کرتی رہتی۔ میں محسوس کرتا کہ یہ مقامِ افسوس ہے مگر مرنے والے کا چہرہ نگاہوں کے سامنے نمایاں نہیں ہو پاتا۔ کوارٹر پر پھر ایک مرتبہ شام کا سماں تھا۔

نزدیک و دور سارے درخت سر جھکائے کھڑے تھے۔ لوگ باگ گھروں کی طرف لوٹ رہے تھے۔ بچے اب ہوم ورک میں جٹ جائیں گے، پرندوں کے لئے شام کی تسبیح کا وقت۔ اجمیر میں پہاڑوں اور درختوں کی وجہ سے کبوتر، مینا، طوطا، گوریا شیاما پھول سنگھی، طرح طرح کے پنچھی پکھیرو ڈیرہ جمائے رہتے ہیں۔ درگاہ میں کبوتر زیادہ رہتے ہیں، سنا مدینہ اور کربلا میں بھی رہتے ہیں مگر یہاں کوارٹرس کے اردگرد مور زیادہ پائے جاتے ہیں۔ مور جب موج میں آ کر پر پھیلا کر ناچتے ہیں تو کیا خوب صورت منظر سامنے آتا ہے، ایسا لگتا ہے جیسے ساری کائنات کا حسن اس ایک پل کے رقص میں سمٹ آیا ہو۔ مور بچپن سے میری کمزوری رہا ہے، شاید یہ میرے ناسٹلجیا کا حصہ ہے۔ ایک مرتبہ بچپن ہی میں والد کے ساتھ چڑیا خانہ گیا تھا۔ ساتھ میں والد کے ایک دوست اور ان کی بیٹی رخشندہ بھی تھی۔ اس نے پرنٹڈ سلک (Printted Silk) کا شلوار جمپر پہن رکھا تھا۔ کئی رنگوں والا ایک انتہائی دیدہ زیب کپڑا۔ ایسا لگتا جیسے کہکشاں رخشندہ کے بدن پر اتر آئی ہو۔ لال پیلا، ہرا، بلو کاسنی، فیروزی، چمپئی، سرمئی، دھانی، کشمشی، زعفرانی، دودھیا، آسمانی۔ اب کیا بیان کروں۔ اس کے جسم سے رنگوں اور روشنیوں کا ایک ایسا سفر شروع ہوتا نظر آتا جو آگے کہیں بڑھ ہی نہیں پاتا تھا۔ ہر رنگ جھوم جھوم کر رخشندہ کے چہرے پر نچھاور ہوتا تھا اور میں کبھی چڑیا

خانے میں ناچتے اس مور کو دیکھتا جس کے پروں پر فرشتوں کی دھنک بکھیرتی صبح اتر آئی تھی اور کبھی رخشندہ کو دیکھتا جو مور کے پر سمان دھنک رنگ بنی خود قوس قزح کی طرح مور اور میرے درمیان بکھری سی گئی تھی۔

میں آج بھی اس سلسلے میں کشمکش کا شکار ہوں کہ مور رخشندہ کو دیکھ کے ناچ رہا تھا یا رخشندہ مور کو محو رقص دیکھ کے دھنک رنگ ہوگئی تھی۔ مگر جب تہذیب وتمدن کے مسائل پر غور کرنے کی منزل میں آیا تو مجھے بار بار یہ احساس ضرور ہوا کہ رخشندہ، مور اور ہماری تہذیب تینوں ایک دوسرے سے الگ کچھ بھی نہیں ہیں۔

قصہ مختصر: اسی زمانے سے مور میری کمزوری رہا ہے۔ داماد کے ٹرانسفر کے بعد میں جب پہلی مرتبہ یہاں آیا تو دیکھا۔ آنگن کے ایک حصے میں تلسی کا پودا لگا ہوا ہے۔ میں نے مسکرا کر پوچھا ''بیٹا یہ تلسی کا پودا ہے؟'' بیٹی کہنے لگی: ''ابو، یہاں ہر گھر میں تلسی کو شبھ مانا جاتا ہے۔ میں نے سوچا بہت سے پودے ہیں ایک یہ بھی سہی''! میں چپ رہا، بوڑھا آدمی ہوں، اپنی پسند وناپسند کسی پر لادنا مجھے ویسے بھی صحیح نہیں لگتا۔ اب اس نے لگایا ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ پھر ادھر ادھر گھوما۔ دو چار لوگوں کے یہاں آیا گیا تو موروں پر بھی نظر پڑی۔

''بیٹا۔ کئی گھروں میں دیکھا۔ یہاں لوگ مور بھی پالتے ہیں''۔ ایک دن کھانے کی میز پر میں نے بیٹی سے کہا۔

''نانا''۔ نواسی نے میری بات اچکی۔ ''مور نیشنل برڈ ہے''۔

''یہ Religious bird بھی ہے''۔ داماد آہستہ سے بولا۔

''ہاں''۔ مجھے بھی یاد آیا۔ یہ ہندوؤں کے یہاں شاید کسی دیوتا کی سواری ہے۔

بیٹی اس ساری گفتگو میں بالکل خموش رہی۔ بات آئی گئی۔

میں دوسری مرتبہ آیا تو میں نے بیٹی کو یاد دلایا ''بیٹا، مور بہت خوب صورت جانور ہے۔ ایک مور پال لو''۔

''جی ابو''۔ بیٹی نے میری بات پر آہستہ سے ہنکاری بھری، مگر اس کی آواز میں اس مشورے کے تئیں عجب سی بے تعلقی محسوس ہوئی۔

تیسری مرتبہ آیا، تب بھی دیکھا، دوسرے گھروں میں مور ہے، بیٹی کے کوارٹر میں نہیں

ہے۔ وسندھرا راج سندھیا راجستھان کی وزیراعلا ہو چکی تھیں اور کانگریس لیڈر کو سیکولر کہے جانے پر اعتراض تھا مگر اب مجھے یقین ہوتا چلا جارہا تھا کہ الجھن کا اصل سبب یہ سب کچھ بھی نہیں ہے۔ بکل مارے سیا پا کرتی رُودالی کے چہرے کا گھونگٹ تیز ہوا کی شرارت سے ذرا ذرا ہٹ ہٹ جارہا تھا۔

میں نے آنے کے ایک دو دن بعد، بیٹی سے کہا: "بیٹا، یہ چھوٹے میاں"۔ میں نے چھوٹے نواسے کی طرف اشارہ کیا۔ "لکشمن جی کے یہاں میرے ساتھ جاتے ہیں تو لکشمن جی کے مور کو دیکھ دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں"۔

"جی ابو"۔ شاید بیٹی میرا عندیہ سمجھ رہی تھی پھر بھی خود سے کھلنا نہیں چاہتی تھی۔

"میں ابھی باہر نکل رہا ہوں۔ ایک مور لیتا آؤں گا"۔

"نہیں ابو مور مت لایئے گا"۔ بیٹی کے لہجے میں کچھ عجیب سا دکھ اور خوف گھلا ملا تھا۔

"کیوں بیٹی۔ خوب صورت پرندہ ہے۔ نیشنل برڈ ہے"۔

"جی، مگر Religious bird بھی تو ہے"۔

"ہاں تو کیا ہوا؟" میں سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ "تلسی کا پودا تم نے لگایا ہی ہے۔ مور بھی پال لو"۔

"ابو"۔ بیٹی ایک لمبی سانس کھینچ کر بولی "تلسی کے پودے کی بات الگ ہے"۔

"بیٹا، میں تمہاری بات نہیں سمجھ پا رہا ہوں۔ صاف صاف بتاؤ"۔

"ابو، مور پال تو لوں، مگر وہ مر گیا تو"۔۔۔؟

میری بیٹی اتنا کہہ کر ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ شاید وہ مجھ سے آنکھیں چار کرنے کی ہمت نہیں جٹا پا رہی تھی۔ ہوا تیز ہو گئی تھی۔ پت جھڑ کا موسم شاید آن چلا تھا۔ سوکھے پتے چرمرا چرمرا کر گر رہے تھے۔ پہاڑ کی چوٹی پر رُودالی سیا پا کرتی نظر آئی۔ تیز ہوا کے جھونکوں سے اب اس کا چہرا کھل کھل جارہا تھا۔ باتھ روم سے پانی گرنے کی آواز آرہی تھی۔ بیٹی شاید منہ پر پانی کے چھپاکے مار رہی تھی۔ مجھے اب اپنے دوسرے خواب کی تعبیر بھی کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی تھی، مگر حیرت اس بات پر تھی کہ اس خواب میں کہیں رخشندہ شامل نہیں تھی۔۔۔!

☆☆☆

سبحان اللہ

اوسط درجے کا مکان تھا۔

نئی وضع قطع کا تو نہیں تھا لیکن پرانے ہند اسلامی طرز تعمیر میں بھی کشادگی کے ساتھ ساتھ روشنی اور ہوا کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔ تین طرف بلند و بالا دیواریں ضرور تھیں مگر ان دیواروں کے سہارے جو کمرے بنائے گئے تھے ان میں روشنی اور ہوا کے لیے اونچائی پر ہی سہی پھر بھی کئی عدد خاصے بڑے روشن دان بنائے گئے تھے جن میں لوہے کی مضبوط جالیاں لگی ہوئی تھیں بلکہ ایک سمت جدھر غلام گردش اور پالکی رکھنے کے لئے کچھ رقبہ مختص کیا گیا تھا، اس طرف کے کمروں میں تو کھڑکیاں بھی تھیں۔

صدر دروازے کی طرف پہلے قدِ آدم چہار دیواری، جس میں ایک طرف کی دیوار کے لگ بھگ چار فٹ پھیلے رقبے میں ہر دو اینٹ کے بیچ اس طرح خلا پیدا کیا گیا تھا کہ ہوا اور روشنی کا بہ آسانی ہی نہیں بلکہ بہتات میں گزر ہو سکے۔ اس چہار دیواری کے اندرونی حصے میں چھوٹا سا آنگن سے لگا برآمدہ، برآمدے کے بغل میں ہال، جس کے دو طرف دروازے اور ایک طرف کی کھڑکی، یہ اس گھر کے بیرونی حصے کا ذکر ہے۔

بیرونی حصے کے بعد اندرونی حصہ جس میں دو سمتوں میں دو لمبے دالان۔ ایک دالان میں ایک بڑا کمرہ، اس کمرے کے اندر ایک کوٹھری جو باکس روم یا اسٹور کہی جا سکتی ہے۔ دوسرے دالان میں تین کشادہ کمرے۔ ان تینوں کمروں کے بعد سیڑھی کا حصہ اور اس حصے کی دوسری طرف باورچی خانہ۔ پھر بہت بڑا آنگن آنگن کی دوسری سمت یعنی کمروں کی مخالف سمت میں کنواں، چند پائپ، غسل خانہ اور بیت الخلا (ٹوائلٹ) وغیرہ۔ اسی طرف ایک کمرہ جس میں ایک بہت ضعیف

بوا رہتی تھیں جو دراصل جوانی کے دنوں میں اس گھر کی آیا یا باورچن یا دائی وغیرہ تھیں۔

پہلی منزل پر دو بڑے ہال نما کمرے اور ان کے علاوہ تین کشادہ کمرے، ٹوائلٹ باتھ روم الگ، آگے میں کھلی چھت، اور پھر اس کے اوپر دوسری منزل پر اایک بہت بڑی چھت اور کنارے پر ایک کشادہ کمرہ۔ اس کمرے کی چھت سے جسے تیسری منزل کہا جا سکتا ہے، پورا شہر آنکھوں کے پیالے میں سمٹ آتا تھا۔

گھر جس علاقے میں تھا اسے گلی یا محلے کا علاقہ تو نہیں کہا جا سکتا مگر کالونی کہنا بھی یقیناً مبالغہ نہیں بلکہ کذب ہوگا۔ دراصل یہ گھر شہر کی صدر شاہراہ کے ایک موڑ سے محلے کی طرف مڑتی ہوئی ایک پختہ سڑک کی بالکل ابتدا میں واقع ہونے والا چوتھا گھر تھا۔ یعنی اس گھر کے اردگرد حدنگاہ تک بازار کیا کوئی دوکان بھی نہیں تھی۔

اور یوں بھی جن دنوں کا ذکر ہے ان دنوں بازار الگ ہوا کرتے تھے اور بازار میں بھی لوہار ٹولی الگ ہوا کرتی تھی اور سنار ٹولی الگ، پھر گول ایک الگ چیز تھا جس میں سبزی اور غلہ ملتا تھا اور بازار ایک قدرے مختلف تصور پیدا کرتا تھا، کپڑوں، جوتوں اور کاسمیٹکس کی دوکانوں کا مرکز۔ بعد کے دنوں میں اسی بازار کے علاقے میں فوٹو کھینچنے کی دوکان، درزی کی دوکان اور میڈیکل شاپ وغیرہ کھلتی دکھائی دیں۔

جس گھر کا ذکر ہے وہاں صبح فجر کی اذان کے ساتھ شروع ہوتی تھی۔ مولانا سبحان اللہ فجر کی اذان کے ساتھ اٹھ جاتے، ان کے اٹھنے کے آس پاس اہلیہ بھی بستر چھوڑ دیتیں، جاڑے کے دنوں میں اسٹو وجلا کر پانی گرم کیا جاتا اور دونوں میاں بیوی اپنے مصلّٰی پر نماز سے فارغ ہوتے۔ دونوں کے نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہوتے بلاقن بوا باورچی خانے میں پہنچ جاتیں، نماز سے فارغ ہوتے ہوتے دونوں کے سامنے صبح کی چائے آجاتی۔ چائے کے بعد شوہر اپنے نظام الاوقات کے مطابق ٹیبل پر آجاتے اور کل رات جو کتاب جہاں تک پڑھی تھی اس سے آگے پڑھنا شروع کر دیتے، ادھر بیوی بھی کمرے سے نکل آتیں۔ یہ وقت پوری طرح صبح ہو جانے کا ہوا کرتا تھا۔

اب بچوں کے اٹھنے کا وقت ہوتا۔ شادی شدہ لڑکوں کا کمرہ کھلتا۔ سب امی جان کو آداب بجالاتے ہوئے دالان میں آجاتے۔ اگر بیٹیاں میکے آئی ہوئی ہوتیں تو وہ بھی باہر نکل

آتیں۔ پھر دھوپ نکلتے نکلتے ناتی پوتوں کی چہکار سے پورا گھر گونجنے لگتا۔

آٹھ بجتے بجتے سب نہا دھو کر فارغ ہوتے۔ یہی وقت مولانا سبحان اللہ کے اوپر سے نیچے آنے کا ہوتا۔ دالان میں بچھی بہت بڑی چوکی پر دسترخوان بچھتا۔ مولانا کے نیچے اترتے ہی بیٹے، داماد، بیٹیاں، بہوئیں، ناتی پوتے فرداً فرداً انہیں آداب کرتے۔ مولانا سب کو دعائیں دیتے ہوئے دسترخوان پر بیٹھ جاتے اور جب تک مولانا اپنی رکابی میں ایک روٹی رکھتے ہوئے یہ نہ کہتے ''بسم اللہ کرو'' کسی کی مجال نہیں تھی کہ ناشتے کے کسی آئٹم کی طرف ہاتھ بڑھا دے۔ ناشتے کے بعد چائے کا دور چلتا اور اس دوران گھر کے تمام افراد کا مولانا سے انٹرایکشن، مختلف قسم کے مسائل، مختلف قسم کے موضوعات، سماج، سیاست، مذہب، ادب، شہر کی تازہ خبریں، رشتہ داروں کے احوال، چائے کا یہ دور تقریباً ایک گھنٹہ چلتا۔ سوا نو سے ساڑھے نو بجے کے درمیان یہ محفل اختتام کو پہنچتی اور مولانا بنگلے کی طرف رخ کرتے جہاں کوئی طالب علم، ملاقاتی یا سوالی پہلے سے موجود ہوتا یا مولانا کے پہنچتے پہنچتے پہنچ جاتا۔ یہ سلسلہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ چلتا۔ اس دوران پروفیسر بیٹا کالج کے لئے روانہ ہو جاتا، وکیل بیٹا کچہری رخصت ہوتا اور ڈاکٹر بیٹا مطب کا رخ کرتا۔

ساڑھے دس گیارہ کے درمیان مولانا گھر کے اندر تشریف لاتے اور چوکی کے پاس رکھی آرام دہ کرسی پر ذرا آرام کرنے کے انداز میں فروکش ہو جاتے۔ آدھ پون گھنٹے کا یہ وقت مولانا کے ذرا پیٹھ سیدھی کرنے کا وقت بھی ہوتا، ایک پیالی چائے پینے کا بھی اور بالخصوص بیوی بچی اور بہو سے مخاطبت کا بھی۔ اسی وقت اسکول نہ جانے والے بچے ان کے پاس لائے جاتے، وہ انہیں پیار بھی کرتے اور اگر کسی کے لیے ضروری سمجھتے تو اسے کچھ پڑھ کر دم بھی کرتے۔

ساڑھے گیارہ بجے مولانا اوپر چلے جاتے اور اپنے پڑھنے کی میز پر دوبارہ بیٹھ جاتے۔ پڑھنے کی میز پر بیٹھنے سے پہلے ان کا پن ڈبہ پان سے بھر کر رکھ دیا جاتا اور بغل میں تازہ تازہ گرم کیا ہوا حقہ بھی، اب مولانا کی حقے، کتاب اور پان سے یاری چلتی۔ اس یار باشی کا وقفہ گھنٹے سوا گھنٹے کا ہوتا۔ ساڑھے بارہ سے پونے ایک کے درمیان مولانا میز سے اٹھ جاتے۔ پہلے ٹوائلٹ پھر وضو، تب تک اذان ہو جاتی، مولانا نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے۔

نماز ختم ہوتے ہوتے کھانا ان ہی کے کمرے میں آ جاتا۔ یہ وقت چوں کہ بیٹوں کے گھر سے باہر رہنے کا ہوتا لہٰذا دوپہر کا کھانا مولانا اہلیہ کے ساتھ تناول کرتے۔ کھانے کے بعد دو

سوا دو کے درمیان قیلولہ کی نیت سے بستر پر جاتے، اٹھتے تو عصر کا وقت ہو چکا ہوتا۔ عصر کے لیے تیار ہو کر وہ مسجد جاتے اور عصر کی نماز سے فارغ ہو کر مغرب تک کا وقت وہ مسجد ہی میں گزارتے، اس درمیان خلقِ خدا ان کے پاس 'افادۂ دین و دنیا' کی نیت سے جمع ہوتی۔ یہ سلسلہ اذانِ مغرب تک چلتا۔ مغرب سے فارغ ہو کر گھر لوٹتے اور بنگلے پر احباب کی محفل جم جاتی۔

اس محفل کے اختتام پذیر ہوتے ہوتے عشاء کا وقت ہو جاتا۔ مولانا عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر پھر دالان میں بچھی چوکی پر تشریف فرما ہو جاتے۔ دسترخوان بچھ چکا ہوتا، بیٹے، داماد آ چکے ہوتے، کھانا شروع ہوتا۔ کھانے کے اختتام پر گفتگو کی محفل نہیں جمتی، سب اپنے اپنے کمروں کا رخ کرتے۔

مولانا نو ساڑھے نو سے گیارہ ساڑھے گیارہ بجے تک مصروفِ مطالعہ نظر آتے۔

ساڑھے گیارہ کے قریب مولانا کے کمرے کی بتی گل ہو جاتی، اسی کے آس پاس پورے گھر پر سناٹا چھا جاتا اور اس طرح اس ایک اوسط درجے کے مکان کا ایک دن تمام ہوتا۔

افرادِ خانہ ایک مخصوص اندازِ زندگی کے عادی تھے۔ گھر میں بالعموم باتیں بلند آواز میں نہیں کی جاتی تھیں۔ عورتوں اور لڑکیوں کا سر ساڑی یا اوڑھنی کے آنچل سے ڈھکا نظر آتا۔ جس چوکی، مسہری یا پلنگ پر عورتیں بیٹھی رہتیں اس پر بالغ لڑکے یا مرد نہیں بیٹھتے۔ گھر کی دائیوں سے مرد اور نوکروں سے عورتیں عام حالات میں ہم کلام نہیں ہوتیں۔ گھر کے مرد یا لڑکے بالعموم بازاروں میں نظر نہیں آتے، اگر یہ راستہ طے کر رہے ہوتے اور اس بیچ کسی شناسا پر نگاہ پڑ جاتی تو چھوٹوں کا ہاتھ سلام کے لئے اٹھ جاتا اور بڑے زیرِ لب دعا دے دیتے مگر کوئی راستے میں رک کر ایک دوسرے سے گفتگو نہیں کرتا۔ بڑوں کی محفل میں چھوٹے بیٹھ تو جاتے مگر خاموش رہتے، چھوٹوں کی محفل میں بڑے کبھی بیٹھے دکھائی نہیں دیتے۔ عیدین کے مواقع پر گھر کے بڑوں کی قیادت میں سب چھوٹے ایک ساتھ چلتے اور رشتہ داروں کے یہاں جا کر عید کی مبارک باد دیتے۔ لڑکیاں چھتوں اور کھڑکیوں سے باہر نہیں جھانکا کرتیں اور شرفا کے لڑکے محلے کے چوک پر کبھی دکھائی نہیں دیتے۔ عورتوں اور لڑکیوں کے دوسرے گھروں میں اسکول آنے جانے کے لیے ڈولی، پالکی اور (بعد میں) رکشوں کا استعمال ہوتا تھا۔

اس ذکر کو آزادی کے آس پاس کا ذکر سمجھا جانا چاہیے۔

آزادی کے اولین دنوں ہی میں دونوں بیٹیوں کے میکے والوں کو پاکستان جانے کی دھن سوار ہوگئی۔ مولانا سبحان اللہ نے حتی الامکان اپنے سمدھیوں کو سمجھانے کی کوشش کی مگر جادو تو وہی جو سر چڑھ کر بولے اور مولانا جادو اور کالے جادو سب کی تاثیر سے واقف تھے، مگر بیٹی پرایا دھن، کیا کر سکتے تھے، ایک بیٹی کی سسرال والے مشرقی پاکستان گئے، دوسری بیٹی کا شوہر اور جیٹھ مغربی پاکستان۔ مشرقی پاکستان والی بیٹی تو بنگلہ دیش بننے کے مراحل میں تباہ و برباد ہوگئی، ساس سسر دیور مارے گئے۔ بیٹی داماد کسی طرح بھاگ کر کاٹھمنڈو پہنچے اور وہاں سے کینیڈا۔ بعد میں خبر ملی کہ دونوں بہنوں نے کراچی میں کسی ایک جگہ دو فلیٹ خرید لیے ہیں اور خوش ہیں۔

خود مولانا کے شہر اور محلے میں جو بھگدڑ مچی تو اچھے اچھوں کے پیر اکھڑ گئے۔ صدر شاہراہ کا موڑ مڑنے پر جو پہلے کے تین مکانات تھے، تینوں کے مالک بھاگ کھڑے ہوئے، ان میں ایک تو مولانا کا عم زاد ہی تھا مگر تینوں مکان مالکوں نے چپکے چپکے اور اونے پونے اپنے مکانات ہندو مارواڑیوں کے ہاتھ بیچ دیے اور مسلمانانِ شہر یا محلہ دار تو الگ چیز ہیں، رشتہ داروں کو بھی بھنک نہیں لگنے دی۔

جن دنوں یہ سب کچھ واقع ہو رہا تھا، ان دنوں مولانا بار بار شکرانے کی نماز پڑھتے اور رب کریم کا شکر ادا کرتے کہ اس نے ان کو عزیمت کی راہ چلنے کا حوصلہ بخشا؛ ورنہ رخصت بلکہ ہزیمت سے بچالیا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد برسہا برس تک یہ بھگدڑ جاری رہی۔۔۔ مولانا کے پاس دم سادھ کر بس دیکھتے رہنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا!

اس زمانے تک صدر شاہراہ، جو اسٹیشن سے بازار تک جاتی ہے، خطوں میں منقسم تھی، اسٹیشن سے دھرم شالے تک کا علاقہ بازار کے لیے مختص تھا اور اس علاقے میں رہائشی مکانات کم از کم تھے اور جو تھے بھی وہ مارواڑیوں کے یا پس ماندہ ہندوؤں کے، اشراف ہندوؤں کے علاقے دوسرے تھے اور ان میں بھی صرف رہائشی مکانات تھے۔ اسی طرح مسلم اشراف کا جو علاقہ دھرم شالے کے بعد سے شروع ہوتا تھا ان میں بھی بیچ بیچ میں کچھ کرانے کی دوکانیں نظر آجاتی تھیں مگر یہ دراصل ان مکانات کے ذیلی حصوں میں تھیں جن کے مکان مالک بھی دراصل ذات کے بلیے تھے۔ اغلب یہ ہے کہ یہ کیسری برادران شہر بسنے کے ابتدائی ایام میں خان صاحبان اور میر صاحبان کی عنایتوں کے طفیل ان کی غلام گردشوں میں رہنے کے لیے تھوڑا بہت حصہ پا گئے تھے اور بعد کے

دنوں میں انہی حصوں میں انھوں نے بہت چھوٹی چھوٹی کرانے کی چند دوکانیں کھول لی تھیں۔ پھر بھی انہیں کسی حیثیت سے تجارتی مرکز کی کوئی مثال قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔

مگر ۱۹۵۶ء کے بعد آہستہ آہستہ اور غیر محسوس طور پر صورت حال بدلنے لگی۔

مثلاً دھرم شالے کے بعد دائرہ محلہ کی جو سرحد شروع ہوتی ہے اور اس محلے کا جو رخ صدر شاہراہ کی طرف ہے، اس رخ پر ایک بہت ہی نیک شریف اور غریبوں کے کام آنے والے بزرگ نے خدمتِ خلق کی غرض سے ہومیو پیتھک علاج کا ایک مرکز قائم کیا۔ اس کی ضرورت ان کو یوں محسوس ہوئی کہ نامی گرامی رؤسا جب زمین داری کے خاتمے کے بعد پاکستان بھاگے تو بچ گئے تباہ حال اشراف یا محنتی پس ماندہ مسلمان۔ ان تباہ حال اشراف کا المیہ یہ تھا کہ آزادی کے وقت بچ جانے والے حضرات میں کچھ تو ساٹھ سے ستر کے درمیان کے تھے جب قویٰ مضمحل ہو چکے ہوتے ہیں۔ ان کے بعد کی دوسری نسل جو چالیس سے پچاس کے درمیان کی تھی اس کی گاڑی کاشتکاری یا اوقاف کی جانب سے جاری امداد یا رئیسوں کی دربارداری کے سہارے ہی چلتی تھی مگر ۱۹۵۶ء کے بعد جو مجموعی صورتِ حال سامنے آئی وہ کچھ یوں تھی کہ زمینداری خاتمے کے قانون کے تحت زمین داری تو بحقِ سرکار دریا برد ہوئی اور جو زمین دار نہیں تھے، صرف کاشت کار تھے، بہ مشکل پچاس ساٹھ بیگھہ کھیت کے مالک، ان کے کھیتوں اور اسامیوں نے اس زمانے میں برپا ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کا سہارا لے کر مالکوں کی زمینوں پر قبضہ کر لیا اور مالکوں کو جان سے مارنے کی دھمکی دے کر گویا کھیت بدر کر دیا۔ باقی بچ گئے اوقاف تو اوقاف کے ساتھ دو صورتِ حال درپیش ہوئی۔ وقف کے تحت جو کھیت تھے ان کے کیا اور اسامی بھی دوسرے اسامیوں کی طرح دیدہ دلیر ہو گئے۔ نتیجتاً اوقاف کے متولیوں نے شہر اور اس کے ارد گرد کی پرتی اور غیر مزروعہ زمینوں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔ اب تو ان کی اپنی شکم پروری کا مسئلہ درپیش تھا ضرورت مندوں کی طرف نگاہ کون اٹھاتا۔ رئیسوں کی نوے فیصد آبادی تو پاکستان جا چکی تھی، دربار کہاں سے سجتا کہ دربار دار منڈلاتے، جو تھوڑے بہت رؤسا بچ گئے تھے انھوں نے بھی اپنا بھلا اسی میں جانا کہ دربار کو فی الحال مقفل کر دیا جائے ورنہ ایک انار سو بیمار والی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا۔ ایسے منظر نامے پر بچ گئے تباہ حال اشراف اور محنتی پس ماندہ مسلمان!

ان نیک دل، شریف اور غریبوں کے کام آنے والے بزرگ سے ان کی پریشانی دیکھی

نہ گئی، ہومیو طریقۂ علاج سے شغف تھا، اللہ کا نام لے کر ایک دواخانہ کھول دیا اور مفت لوگوں کا علاج کرنے لگے۔ جلد ہی ایک بڑی بھیڑ ان کے مطب کا چکر کاٹنے لگی۔ ڈاکٹر صاحب بھی خوش تھے کہ اللہ ان سے غریبوں کی خدمت کا فریضہ انجام دلوا رہا ہے، مگر تقریباً سال بھر تک خدمت خلق کا یہ نظارہ بہت خموشی سے دیکھنے والی، ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ نے جب ڈاکٹر صاحب کو یاد دلایا کہ گھر میں بچا ہوا سارا پیسہ غریب مریضوں کی دوا کی نذر ہو چکا تو ڈاکٹر صاحب بھی چونکے، دوستوں عزیزوں نے بھی سمجھایا کہ ذوی القربیٰ اور یتیم و مسکین کے حقوق سے انکار کفر ہے۔ آپ مفت تشخیص کر کے نسخہ لکھ دیجیے، جو بہت غریب ہے اس کو دوا بھی دے دیجیے مگر آپ نے عمومی طور پر جو کسی سے بھی پیسہ نہ لینے کا سلسلہ جاری کر رکھا ہے یہ سلسلہ تو کسی نہ کسی دن آپ ہی کو خیراتی دواخانے میں لے جا کر کھڑا کر دے گا۔

ڈاکٹر صاحب نے بہ جبر و اکراہ اس مشورے کو قبول کر لیا۔

اب ڈاکٹر صاحب صرف نسخہ لکھ دیتے تھے اور مریض کسی دوکان سے دوا خرید لیتا تھا، مگر ڈاکٹر صاحب کی جمع پونجی تو پہلے ہی نکل چکی تھی، اس پر سارے کا سارا دن مریضوں کی نذر۔ کوئی اور ذریعۂ معاش بھی نہیں تھا۔ جب حالات بے قابو ہونے لگے تب گویا مجبوراً ڈاکٹر صاحب نے مطب کے بغل میں ہومیو پیتھک دواؤں کی ایک دوکان کھول لی۔ اس سے مریضوں کو بھی کہیں اور جانے سے نجات مل گئی اور ڈاکٹر صاحب کا معاشی مسئلہ بھی کسی قدر حل ہو گیا۔

مگر کچھ ہی دنوں بعد ڈاکٹر صاحب نے ایک اور بات محسوس کی، بہتیرے مریض ایسے آئے جن کو سرجری کی ضرورت ہوتی۔ ان کی دارو ئے شفا تو ڈاکٹر صاحب کے پاس تھی نہیں، وہ دل مسوس کے رہ جاتے۔ وہ تو اتفاق سے خاندان کا ایک عزیز M.B.B.S کر کے ان سے ملنے آیا تو ڈاکٹر صاحب کو اچانک اپنے مریضوں کی یاد آ گئی۔ انھوں نے اس عزیز کو مجبور کیا اور اس نے ڈاکٹر صاحب کے بغل ہی میں اپنی کلینک کھول لیا۔ مگر کلینک کھول لینے سے بھی مسئلے کا کلی حل تو نہ نکل سکا۔ وہ تو سرجن تھا اور صرف نسخے اور دوا سے سرجیکل کیس کا نپٹارا تو نہیں ہو سکتا تھا۔ کلینک کے بغل میں ڈاکٹر صاحب کے ایک عزیز کی پرتی زمین تھی اور وہ بھی تقسیم کا مارا ہوا تھا۔ اس نے ایک دن ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ اگر سرجن صاحب چاہیں تو اپنا نرسنگ ہوم اس پرتی زمین پر بنا لیں اور جو لاگت آئے اس کو کرائے میں منہا کر لیں۔ سرجن صاحب اس بات پر خوش ہوئے،

نرسنگ ہوم بن گیا اور سرجن صاحب کی کلینک میں ایلو پیتھک دواؤں کی دوکان کھل گئی۔

اب صورتِ حال یہ سامنے آئی کہ ہومیو پیتھک اور ایلو پیتھک دونوں طرح کے مریضوں کا اس علاقے میں جمگھٹا لگنے لگا۔ جن مریضوں کا آپریشن ہوتا، وہ اور ان کے گھر والے اس علاقے میں ایک ہفتہ سے پندرہ دن تک متواتر رہنے لگے۔ مسئلہ پیدا ہوا ان متواتر رہنے والوں کے چائے ناشتے اور کھانے کی ضرورتوں کی تکمیل کا۔

آخر کار ایک ہوٹل بھی کھل گیا۔

غیر محسوس طور پر ایک نئی صورتِ حال سر اٹھاتی جا رہی تھی۔ اس کا شدید احساس مولانا سبحان اللہ کو اس دن ہوا جب وہ محلہ دائرہ کی ایک تقریب میں شرکت کرنے کے لیے اپنے مکان سے نکل کر صدر شاہراہ پر آئے۔ یہ ذکر ۱۹۵۶ء کے بعد کا ہے۔ وہ اپنے موڑ سے دائرہ تک ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے آگے بڑھتے گئے تو انھیں احساس ہوا کہ گزشتہ پانچ دس برسوں میں تو گویا دنیا ہی بدل گئی۔ چوکھنڈی، منڈی کشور خاں اور ان دونوں کے ایک طرف محلہ حضرت شاہ ہارون عرف برتلہ اور دوسری طرف دائرہ۔ ان چار محلوں سے گزرتی ہوئی صدر شاہراہ (مین روڈ) پر کم از کم دونوں طرف پچاس پچاس یعنی سو مکانات تھے اور دوکانیں شاید دس بھی نہیں ہوں گی۔ یہ تذکرہ ہے آزادی سے پہلے کا۔ مگر اس شام جب مولانا سبحان اللہ محلہ دائرہ کے لیے چلے تو اندازہ ہوا کہ چار محلوں پر محیط اس پورے رقبے میں کم از کم پچاس دوکانیں خریداروں سے بھری ہیں۔

''رب کریم! اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟'' مولانا سبحان اللہ اتنا آہستہ آہستہ بدبدائے کہ شاید فرشتوں تک بھی یہ بدبداہٹ نہ پہنچ پائی ہوگی۔

گھر لوٹ کر مولانا سبحان اللہ نے پھر شکرانے کی نماز پڑھی اور سجدہ ریز ہو کر بارگاہِ الٰہی میں عرض گزار ہوئے کہ ''مولائے قدیر! تیرا ہزار ہزار احسان کہ تو نے اس ناچیز کو محلے کے اندر کی پرسکون زندگی عطا فرمائی''۔

مگر اتنا عرض کرتے کرتے مولانا سوچ میں پڑ گئے۔ انھیں یاد آیا کہ پچھلے برس سے اب صبح میں آنے والے طالب علموں، ملاقاتیوں اور سائلین کی تعداد بتدریج قلیل ہوتی جارہی ہے۔ آنے والے اب زیادہ تر مغرب بعد آتے اور کچھ دیر رک کر روانہ ہو جاتے۔

پھر بھی مولانا شکر گزار تھے کہ رب کریم نے انھیں مرجعِ خلائق بنایا۔

مگر طالب علموں اور ملاقاتیوں سے محوِ گفتگو ہونے کے دوران انھیں اپنا اضطراب زیادہ ہوتا محسوس ہوا۔ پہلے طلبائے علم بالعموم مشکوٰۃ، قدوری، بیضاوی اور جلالین کے متن پر گفتگو کرتے، جو ذرا منطقی یا کلامی ذہن رکھتے وہ منطق کے قضایا اور جزء لا تجزیٰ کے جزوی مگر خصوصی نکات پر انشراحِ صدر کے طالب ہوتے، یا وحدت الوجود اور وحدت الشہود پر گفتگو چل نکلتی۔ بعض بعض طلبہ تاریخ میں دلچسپی رکھتے تھے پس وہ عربِ جاہلیہ سے اندلس تک کا ذکر چھیڑتے اور اندلس سے مسلمانوں کے اخراج کے اسباب پر اپنا اضطراب ظاہر کرتے۔ مولانا کے رفقا میں علما کے ساتھ ساتھ شعرا اور ادبا بھی ہوا کرتے تھے مگر صبح و شام کی مجلسوں میں یہ حضرات بالعموم دقیق علمی مسائل سے گریز کرتے ہوئے شعر و ادب کے مختلف پہلوؤں پر محوِ گفتار نظر آتے۔ بیچ بیچ میں جب نہ تب کوئی اچھا شعر یا اچھا فقرہ ہر صبح یا ہر شام حاصلِ محفل بن جاتا۔ مجلس کا اختتام بالعموم مولانا کے کسی نہ کسی دوست شاعر کے کلام پر ہوتا۔ مگر بعد کے ایام میں محوِ گفتگو ہونے کے دوران ایک دن مولانا کو کچھ عجیب سا احساس ہوا۔

طلبائے علم، علمائے شہر اور شعرائے عہد کی گفتگو بیچ بیچ میں جب نہ تب اپنا چولا بدلنے لگی تھی۔

دراصل ہوا کچھ یوں کہ ایک شام ذکر چھڑا ہوا تھا متقدمین شعرا کے یہاں دست یاب روحِ عصر کا۔ اس ضمن میں کئی مثالیں بھی پیش کی جا چکی تھیں، مثلاً:

میرؔ کا شعر:

شہاں کہ کحلِ جواہر تھی خاکِ پا جن کی
انھی کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

غالبؔ کا شعر:

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

مومنؔ کا شعر:

شبنم خراب، مہر کتاں، سینہ چاک ماہ
لو اور بھی ستم زدۂ روزگار ہیں

اسی دوران نسبتاً ایک نوجوان شاعر شعیب راہیؔ نے آزادیِ ہند کے بارے میں ترقی پسند شاعر فیض

احمد فیض کا ایک شعر پیش کیا:

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر کہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

موجودہ بزرگ اور ثقہ علماء اور شعرا دونوں ہی متفق ہوئے کہ اثر لکھنوی جیسے عمائدینِ ادب کے اثرات ابھی زائل نہیں ہوئے تھے اور مہذب محفلوں میں ترقی پسندانہ گفتگو یا اشعار کو (معتوبِ شرفا) تصورِ اشتراکیت کا اثر سمجھنے کے سبب ایک قسم کا ذہنی انحراف و الحاد متصور کیا جاتا تھا۔

مگر سبحان اللہ کی محفل کا یہ اختصاص بھی تھا کہ اس میں بزرگ اور جوان دونوں نسلوں کے صاحبانِ بینش و دانش شرکت فرماتے تھے۔ پس یوں ہوا کہ شعیب راہی صاحب کی اس جرأت کے بعد وہاں موجود تازہ واردوں کو گویا حیلۂ غیبی ہاتھ آیا اور 'روحِ عصر' کے حوالے سے جو گفتگو آگے بڑھی تو عصر اور عصرِ حاضر میں خوئے وفا کی کمیابی کے ضمن میں ملک میں شر پسند عناصر کی فتنہ پردازی، فرقہ وارانہ فسادات اور ہندوستان میں مسلمانوں کی بدحالی کے ذکر سے گزرتے ہوئے دھرم شالے سے برتلے تک ہندوؤں کی تاجرانہ موجودگی اور شاطرانہ افزودگی سب زیرِ بحث آ گئے اور مولانا سبحان اللہ ہکا بکا بس ایک ٹک دیکھتے رہ گئے۔۔۔ اس دن سے ان کی محفل ان کے ہاتھ سے نکل گئی۔

وہ رئیس تو تھے نہیں کہ جب چاہتے دربار میں تالا لگا دیتے۔ وہ تو عالم اور فقیر تھے۔ فقیر کا حجرہ بود سے نابود ہو جاتا ہے مگر بند نہیں ہوتا۔

مولانا کی محفل ویسے ہی برپا ہوتی رہی مگر گفتگو کا رخ مڑ چکا تھا۔ کبھی کوئی بیان کرتا کہ فلاں جگہ ڈاکہ پڑ گیا، کوئی بتاتا کہ فلاں آدمی کا قتل ہو گیا۔ ایک دن کسی نے کسی کے بارے میں خبر دی کہ اس نے نمبر دو کی کمائی سے لاکھوں کما لیا اور اب اس کی جھونپڑی محل میں تبدیل ہو رہی ہے۔

جن دنوں کا یہ ذکر ہے انہی دنوں میں سے کسی ایک دن مولانا نے دیکھا کہ ان کے بغل کے بغل میں یعنی صدر شاہراہ سے محلے کا موڑ مڑنے پر جو پہلا مکان ایک عزیز کسی مارواڑی کے ہاتھ فروخت کر کے پاکستان چلے گئے تھے، وہ مارواڑی مکان کی طرف واقع باہری دیوار تڑوا کر اس میں تین دوکانیں بنوا رہا ہے۔

محلے کے اندر دوکان بننے کا یہ پہلا واقعہ تھا۔

اسی زمانے میں کسی ایک صبح: دسترخوان پر پروفیسر بیٹا دکھائی نہیں دیا۔ مولانا نے متحیر

اور سوالیہ نگاہ اہلیہ پر مرتکز کی تو وہ آہستہ سے بولیں: "اس کی روٹین میں ایک کلاس سویرے کا بھی جز گیا ہے، اس لیے وہ پہلے ہی ناشتہ کر کے جا چکا"۔ بات کچھ سمجھ میں نہ آئی مگر دسترخوان پر مولانا پہلی مرتبہ تکدر کا شکار ہوئے۔ ماں نے شاید بیٹے کو باپ کے استفسار کی بابت اطلاع دے دی تھی۔ عشائیہ کے وقت بیٹا ماں کے اجمال کی تفصیل بیان کرنے لگا: "اب لڑکوں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے اس لیے انتظامیہ نے کئی سکشن کر دیے ہیں۔ پہلے سکشن کا کلاس 8:00-8:50 ہے اور دوسرے سکشن کا کلاس 8:50-9:40 تک جاری رہتا ہے"۔ مولانا نے بیٹے کا یہ بیان حیرت اور افسوس سے سنا اور خموش رہے۔ حیرت اس بات پر ہوئی کہ عشائیہ کے اوقات میں گفتگو اس گھر کے نظام الاوقات میں شامل نہیں تھی اور افسوس اس بات پر ہوا کہ ان کا پروفیسر بیٹا بازاری زبان بولنے لگا تھا۔

دوسری صبح مولانا ناشتے کے بعد چائے نوشی کے دوران پروفیسر بیٹے کی طرف متوجہ ہوئے: کل آپ بتا رہے تھے کہ طلبہ کی تعداد زیادہ ہونے کے سبب تدریسی حلقوں یا درجات کو کئی ٹکڑوں میں منقسم کرنا پڑا"۔

"جی ابا حضور!"

"اتنے طلبہ کا داخلہ ہی کیوں لیا گیا کہ اساتذہ کے نظام الاوقات میں خلل آ گیا"۔

"جی، یہ مسئلہ تو ہم لوگوں کے دائرۂ کار سے باہر ہے۔ مگر غالباً انتظامیہ نے یہ فیصلہ شاید اس لیے کیا ہو کہ طلبہ کی زیادتی کی وجہ سے پیسے بھی تو زیادہ آجاتے ہیں"۔

"یعنی پیسوں کے لئے انسان اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کا حق چھوڑ دے گا؟"

پروفیسر بیٹا خموش ہو رہا، باپ سے بحث و تمحیص کی عادت تھی نہ جرأت۔ مگر بعد کے دنوں میں کسی ایک شام حاضرینِ جلسہ میں سے کسی نے مارواڑیوں کی خوئے تاجرانہ کے ذکر میں جب یہ بیان کیا کہ: "ان کی دوکان پر بڑا جائے یا چھوٹا وہ تو یکساں طور پر ہر خریدار سے ایسا سلوک کرتے ہیں جیسے خریدار نہ آیا ہو نعوذ باللہ خدا آ گیا ہو"۔ تو مولانا کو بے ساختہ اپنا پروفیسر بیٹا یاد آ گیا جو انتظامیہ کی خواہش کے مطابق سانس کی آمد و شد کا نظام قائم کرنے کی ابتدا کر چکا تھا۔

اس دن مولانا سبحان اللہ نے بعد نمازِ مغرب پھر دو رکعت نماز بطورِ شکرانہ پڑھی اور بارگاہِ ایزدی میں سجدہ ریز ہو کر عرض گزار ہوئے کہ "ربِ قدیر! تیرا ہزار ہزار احسان کہ تو نے اس

کمزور بندے کو اپنی مرضی سے خدمتِ خلق میں مصروف رہنے کا موقع عطا کیا اور ہر قسم کی قیدِ تمناہی دلا تمناہی سے بچائے رکھا‘‘۔

مگر وہ زمانہ ہی کچھ عجب خلافِ توقع زمانہ تھا۔ چیزیں، وقوعے اور افکار سب کچھ یوں اچانک بھک سے نیا رنگ وروپ اختیار کرلیتے تھے، واقع ہوجاتے تھے اور کاسۂ سر میں جگر مگر کرنے لگتے تھے کہ حیرت ہونے لگتی تھی کہ یہ کیسے ہوگیا، یہ کیسے سوچ لیا۔ مولانا کو بھی حیرت ہوئی، سودا اپنی ہجویات اور بطورِ خاص حضرت ولی اللہ دہلوی کے بارے میں ان سے جو ہفوات سرزد ہوئیں، اس سبب سے وہ مولانا کے ناپسندیدہ شعرا میں تھے، اس پر بھی ایک صبح مولانا کو آپ ہی آپ سودا یاد آگئے:

اٹھ گیا بہمن ودے کا چمنستان سے عمل
تیغ اردی نے کیا ملکِ خزاں مستاصل

’’شاید یہ موسم کا اثر ہو‘‘۔ مولانا نے سوچا۔ گرمی پوری طرح آچکی تھی۔ لو کے جھکڑ مزاج میں خشکی اور تکدر پیدا ہونے کا سبب بن رہے تھے اور تشنگی کا مداوا کسی طور نہیں ہو پا رہا تھا۔ خزاں کی چاپ محسوس کرنے کے دوران ایک شام بعد نمازِ مغرب مسجد سے لوٹتے ہوئے مولانا نے دیکھا کہ ان کے پڑوسی مارواڑی نے جو دو دکانیں نکالی تھیں، ان میں سے دو دو کانوں میں سامانِ فروختگی سج چکا تھا۔ ایک دوکان ریڈیو کی تھی اور دوسری چوڑیوں کی۔ تیسری دوکان جو خالی تھی اس میں مالکِ دوکان مارواڑی سینڈو بنیان پہنے، دھوتی کو گھٹنوں سے اوپر اٹھائے بیٹھا تھا اور پنکھا جھل رہا تھا۔

یہ منظر شرفا کے محلے کے قریب؟‘‘ مولانا نے دیکھا، سوچا اور آہستہ سے اپنے مکان کی طرف بڑھ گئے۔ انھیں پھر سودا یاد آگئے تھے:

تیغ اردی نے کیا ملکِ خزاں مستاصل!

موسم بھی بدل چکا تھا اور حالات بھی تیزی سے بدلاؤ کی ڈھلان کی طرف آرہے تھے۔ پہلے مارواڑی کی دیکھا دیکھی مولانا کے بالکل بغل میں بسنے والے دوسرے مارواڑی نے بھی اپنے مکان میں تین دوکانیں نکال لیں، بیچ والے مارواڑی بندھو پیچھے کیوں رہتے، وہ بھی اپنے بھائیوں کی راہ چلے، بات یہیں تک آکر رکی نہیں۔ ان مارواڑی کے گھروں کے سامنے جو پرانے محلے دار تھے انھیں بھی ہوش آیا۔ ضرورت تو انہی کو زیادہ تھی۔ ایک کے باپ کا انتقال ہوچکا تھا،

دوسرے بستر پکڑ چکے تھے اور تیسرے ملازمت سے ریٹائر ہو چکے تھے۔ تینوں کی اولاد خوابِ خرگوش میں گم رہی۔ پڑھے نہ لکھے نام محمد فاضل۔ جو سامنے کے پڑوسیوں کو صورتِ معاش پیدا کرتے دیکھا تو اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ مل گیا۔ ایک نے اپنے چوڑے دروازے کے آدھے حصے میں دیوار اٹھا کر ایک دوکان نکال لی، دوسرے نے سڑک کی طرف بنے کمرے کی باہری دیوار ڈھادی اور اس میں لوہے کا شٹر لگوا دیا، تیسرے سے کچھ بن نہ پڑا تو اس نے باپ کی بنائی باہری بیٹھک کو ہی دوکان بنا ڈالا۔

پھر ایک روز، ایک اور منظر مولانا کا دل دہل جانے کا سبب بنا۔ مولانا مغرب کی نماز پڑھ کر لوٹے تو دیکھا کہ اہلیہ باہری حصے کی دیوار کے خلا میں ہاتھ ڈال کر سامنے کے مسلمان دوکان دار سے کوئی چیز خرید رہی ہیں۔

'الامان والحفیظ! مولانا کانپ سے گئے۔ کانپتے قدموں بہت تیزی سے مسافت طے کرتے ہوئے بنگلے میں پہنچے اور اہلیہ کے ہاتھ پر دوہتڑ مارا:" پاگل ہو گئی ہو؟ تم سودا خرید رہی ہو؟"

اہلیہ پہلے تو گڑبڑائیں، پھر کچھ جھینپیں، پھر آہستہ سے بولیں:" بچے نہیں تھے، بلاقن بوا بھی اپنے گھر چلی گئی ہیں۔ آپ کے ملاقاتیوں کے آنے کا وقت ہو رہا تھا، دیکھا چینی نہیں ہے، وہ سامنے مظہر میاں نے دوکان کھولی ہے، اپنے سامنے کے پیدا ہیں۔ ان سے تو آپ نے کبھی پردے کا حکم دیا بھی نہیں......اور وہ.....میں نے مظہر میاں کے بیٹے کو ہاتھ بڑھا کر پیسہ دیا تھا"۔

" میں از روئے شرع گفتگو نہیں کر رہا ہوں...... یہ طریقہ غلط ہے کہ گھر کی عورتیں سامان خریدیں"۔

آپ جن طریقوں کو غلط سمجھتے ہیں، وہ سب طریقے آہستہ آہستہ رائج ہوتے جا رہے ہیں"۔ اہلیہ بہت آہستگی سے مگر مودبانہ کہتی ہوئی اندر چلی گئیں۔

مولانا کے وجود میں ایک بھیانک زلزلہ ہنکارنے اور پھنکارنے لگا۔ انھوں نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پایا۔ پہلی خواہش یہ ہوئی کہ وہ جہاں ہیں وہیں بیٹھ جائیں مگر انھوں نے اس مقام کو دیکھا جہاں وہ کھڑے تھے اور خود پر نفریں کی۔ دراصل وہ آنگن کے اس آخری حصے میں تھے جہاں ایک طرف بیت الخلا اور دوسری طرف غسل خانہ تھا۔ دوسری خواہش ہوئی کہ اوپر جا کر کچھ دیر لیٹ رہیں مگر یاد آیا کہ یہ وقت ملاقاتیوں کی آمد کا ہے۔ چار و ناچار وہ نپے تلے قدموں بنگلے

میں موجود اس ہال میں آئے جس میں محفل جمتی تھی اور اپنی مخصوص کرسی پر جیسے ڈھ سے گئے.....
چند لمحوں بعد انھوں نے محسوس کیا کہ اندر برپا خلفشار آہستہ آہستہ سکون میں تبدیل ہوتا جا رہا ہے۔
مگر طبیعت پر جو 'قبض' طاری ہوا وہ 'کشاد' کی طرف مائل نہیں ہو پا رہا تھا۔

آہستہ آہستہ لوگ آنے لگے، سبھی جانے پہچانے چہرے تھے اور مولانا سبحان اللہ کی کم سخنی کے عادی لہٰذا آج بھی مولانا کی خموشی سے کسی کو کوئی فکر لاحق نہیں ہوئی۔ مولانا خموشی سے سنتے رہے اور لوگوں کی گل افشانی جاری رہی۔ اسی دوران ان کے ایک رفیق دیرینہ پنشن یافتہ جسٹس مستجاب علی خاں داخل ہوئے۔ مولانا نے ذرا تپاک سے خیر مقدم کرتے ہوئے دریافت کیا:

''خاں صاحب' کئی دنوں سے شرفِ ملاقات حاصل نہیں ہوا، نصیبِ دشمناں سب خیریت تو ہے؟''

جسٹس صاحب ہنسے، کہنے لگے: ''اب جن حالات کا سامنا ہے، وہ تو خدا دشمنوں کو بھی نصیب نہ کرے''۔

''ایسا بھی کیا؟'' کئی پُر استعجاب آنکھیں جسٹس صاحب پر بیک وقت مرکوز ہوئیں۔

''ارے بھائی، کیا بتاؤں۔ بغل والا مکان تو فضل الدین بھائی نے محمد اسلام سبزی فروش کے ہاتھ بیچ دیا اور خود پاکستان سدھارے، پہلے تو افسوس ہوا، مجھے خود زمین کی ضرورت تھی، بتاتے تو میں ہی لے لیتا، پھر بھی یہ سوچ کر ان کے لیے دعائے خیر لازمی جانی کہ بندۂ خدا نے مسلمان ہی کے ہاتھ تو بیچا مگر اب سمجھ میں آ رہا ہے کہ اس شخص نے میرے ساتھ کیسی ناانصافی کی۔ اسلام الدین اپنے گھر میں آلو پیاز کی آڑھت کھول کے بیٹھ گیا۔ گھر کا پڑوس بازار بن گیا، سو تو ہے ہی، مستزاد یہ کہ اس کے گھر سے سڑی پیاز اور آلو کے بھبکے جینا محال کیے رہتے ہیں۔ مزید برآں یہ کہ اس گھر میں مرد عورت بچے، سب کے سب جس زبان میں بات کرتے ہیں، میں نے تو ایسی غلیظ لفظیات و اصطلاحات کا کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا''۔

اس کے بعد تو مجلس کا جو رنگ بدلا تو پھر سنبھالے نہ سنبھلا۔ گویا پنڈورا بکس پر پڑا ڈھکن ہٹ گیا تھا اور بلائیں پوری طاقت اور سرعت کے ساتھ مولانا پر حملہ آور ہو رہی تھیں۔ سبھوں کی گفتگو کے موضوعات اور لہجے اس قدر تبدیل ہو چکے ہیں۔ مولانا کو اس کا اندازہ نہیں تھا۔ مجلس میں موجود ہر شخص پکا ہوا پھوڑا تھا جس میں جسٹس صاحب کی گفتگو نے نشتر چبھو دیا تھا۔ عزیز الرب

کہنے لگے: '' بھئی، گفتگو کا انداز تو وہ سنبھالے جس کے پاس وراثت یا تربیت کا کچھ نمونہ موجود ہو، جیسی جزو ویسی شاخیں''۔ پس پر صلاح الدین بول اٹھے'' مگر اب تو وہ ہر چیز میں برابری کیا برتری کے کوشاں رہتے ہیں، مسجد کی امامت ہو، جلوس کی قیادت ہو یا اسٹیج کی نظامت ہو، ہر جگہ قبضہ کرتے ہیں اور سازش کے ذریعے قبضہ کرتے ہیں''۔ صلاح الدین کی اس بات پر مولانا قمرالدین مسکرائے، کہنے لگے: '' ان کی سازش ہماری حماقت کی وجہ سے کامیاب ہوتی ہے۔ ہم کو بھی تو مسجد مدرسہ اور خانقاہ کی تعمیر اور تعمیرِ نو کا شوق چرا گیا ہے، تو اب پیسہ کہاں سے آئے گا؟ اس مسئلے کا حل تو انہی کے پاس ہے اور ہمیں اس کی پرواہ تو ہے نہیں کہ مسجد و مدرسہ میں حلال پیسہ استعمال ہو رہا ہے یا حرام، ہمیں تو بس پیسہ چاہیے اور پیسہ انہی کے پاس ہے۔ وہ پیسہ دیتے ہیں اور پیسے کے زور پر مسجد و مدرسہ کے ممبر بنتے ہیں اور خانقاہوں میں آگے کی جگہ پاتے ہیں۔ جب مسجد و مدرسہ کی کمیٹی میں ان کے ممبر زیادہ ہو گئے تو پھر صدارت و قیادت سے انھیں کون روک سکتا ہے؟''

مولانا قمرالدین کی اس بات کو وکیل شرافت حسین نے کاٹا، کہنے لگے:

'' آپ Cast Consideration پر اتنا خفا ہو رہے ہیں لیکن خود آپ لوگ جس قسم کے شدید مسلکی تعصب کا شکار ہو چکے ہیں، کبھی اس پر غور کیا؟ جہاں دیوبندی کا غلبہ ہے وہاں بریلوی بیچارا پر نہیں مار سکتا، شیعوں کے مدرسوں میں سنی کا اور سنیوں کے مدرسوں میں شیعوں کا گزر نہیں، اب تو خانقاہی بھی گروہ بندی کے لیے چھٹپٹاتے نظر آتے ہیں، جب کہ صوفی اور مولوی کا بنیادی فرق یہی ہے کہ مولوی اپنے مسلک کے علاوہ کسی دوسرے مسلک والے کو برداشت نہیں کر پاتا، اس کے برعکس صوفی کا یہ اختصاص رہا ہے کہ اس کے سب اپنے ہوتے ہیں مگر آج تو صوفی بھی مولوی کے پروپیگنڈہ رینج میں آ گیا ہے اور ذوی القربیٰ کے حقوق کے حیلۂ شرعی کو اپنی گروہ بندی کے لیے استعمال کر رہا ہے۔

مجلس پوری طرح گرم ہو چکی تھی اور ہر آدمی کچھ نہ کچھ کہنے کے لیے بیتاب ہو رہا تھا۔ مولانا سبحان اللہ نے توجہ مرکوز کرنی چاہی تو جملے ٹوٹ ٹوٹ کر اور ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو کر ان تک پہنچنے لگے۔

مولوی سے تو اللہ بچائے..... بچنے کا راستہ کہاں ہے، انھوں نے تو مسجد مدرسہ اور خانقاہ کے سہارے خود کو عوام پر مسلط کر دیا ہے..... ان کا بھی کیا قصور..... عوام بھی تو کم راندۂ درگاہ نہیں

ہیں.....چاروں طرف بے ایمانوں اور ظالموں کا راج ہے......ہمیشہ یہی ہوا ہے، طاقت ور سے تو سب ڈرتے ہیں......جس کی لاٹھی اس کی بھینس.......

مولانا سبحان اللہ اپنے ہی گھر میں اپنی سجائی محفل کا انجانا پن گھونٹ گھونٹ پی رہے تھے اوران کا بس نہیں چل رہا تھا کہ محفل برخاست کردیں۔ انھیں شدید طور پر بس ایک احساس بار بار ہورہا تھا.....یہ شریفوں کی محفل ہے یا مچھلی بازار.....پھر انھیں کسی دوست کا جملہ یاد آیا.....جمہوریت کی خرابی اور زوال یہ ہے کہ ہر آدمی خودسر ہوجاتا ہے.....اب مولانا خود گڑبڑا گئے.....شور شرابے میں ڈوبی اس محفل کو تماشائے جمہوریت قرار دیں یا مچھلی بازار کی تبدیلیِ مقام تصور کریں۔

مولانا خود کو سنبھالنے کی بہت کوشش کررہے تھے مگر اپنے دورانِ سر کو شدید تکلیف کے ساتھ محسوس بھی کرر ہے تھے۔ گردش میں کائنات ہے.....کائنات ہے.....کائنا....“

اچانک محفل میں شور اٹھا.....”مولانا بے ہوش ہوگئے!“

اس دن کے بعد مولانا سبحان اللہ پھر بستر سے نہ اٹھ سکے، پہلے تو ڈپریشن اور اختلاجِ قلب نے آگھیرا، حسبِ دستور انھوں نے طب یونانی کا سہارا لیا، خمیرہ مروارید گاؤزباں جواہر والا، خمیرہ گاؤزباں حکیم ارشد والا، خمیرہ ابریشم سادہ.....ہر ممکن طور پر ان کی کوشش رہی کہ انگریزی دواؤں سے بچا جائے۔ اس دوران ملنے والوں کا تانتا بندھا رہا، آنے والوں میں علما اور زہّاد بھی تشریف لاتے رہے، ان میں سے کسی نے قرآن کی ایک آیت کے ورد کی صلاح دی۔ مولانا جھلا گئے: ”آپ آیاتِ قرآنی کو بھی جنس بازار بنا رہے ہیں۔ افادۂ مادی کے لیے کیا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے؟“ کہنے والے بزرگ چپ ہو رہے۔ آخر تو مولانا بیمار تھے۔

مولانا بیمار ہوئے تو پھر بستر سے نہ اٹھ سکے۔ بیماری کا پہلا حملہ تو دورانِ سر کی صورت میں ہوا مگر اس کے بعد اختلاجِ قلب نے گویا مولانا کا گھر دیکھ لیا۔ مولانا حتی الامکان خود کو اطمینان دلاتے کہ ”اے بندۂ کفور! تجھ کو کس بات کی کمی ہے، الحمد للہ معاش کا کوئی مسئلہ نہیں ہے، آج بھی کھاپی کر فقرا و مساکین کے لیے کچھ نہ کچھ بچ ہی جاتا ہے، تیری اولاد اطاعت شعار ثابت ہوئی اور تیری بیوی وفا شعار، خلقِ خدا میں تیری عزت بنی رہی اور نزدِ خدا تیرا توشہ ایمانداری، خلوص، تقویٰ اور صدق کا ہے۔ پھر تو کیوں خلجان میں مبتلا ہے؟“

مگر مولانا اپنے اس دلِ ناصبور کا کیا کرتے جو صابر کی مخلوق ہوکر بھی صابر نہیں ہو پا رہا

تھا۔ بات یہیں تک رکی نہیں رہی ۔ اطبا نے اختلاجِ قلب کا اصل سبب دورانِ خون بتایا اور اس مرضِ ناہنجار کے سبب جس اصل مرض کی بابت اطبا مشوش تھے بالآخر وہ تشویش صحیح ثابت ہوئی۔

مولانا پر فالج کا حملہ ہو ہی گیا۔

مولانا سبحان اللہ حیات ہیں۔ علاج چل رہا ہے۔ اطبا کا کہنا ہے کہ دماغ پر بھی فالج کا اثر ہے۔ ایک طبیب نے تو یہ بھی کہا کہ زمانۂ طفلی ہی میں کبھی کوئی ایسا حادثہ پیش آیا ہوگا جس کے سبب دماغ کا کوئی حصہ کسی نہ کسی سطح پر اسی زمانے میں متاثر ہو چکا ہوگا۔ اس رائے پر سب کا اتفاق نہیں ہے مگر اس خیال پر سب متفق ہیں کہ اگر علاج اور خدمت کے طفیل ہاتھ پیر میں حرکت شروع بھی ہوگئی تب بھی دماغ صحیح طور پر اب کام نہیں کر سکے گا۔

ورثا مولانا کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں مگر نتیجہ کچھ بہت امید افزا نہیں ہے۔

مولانا زندہ ہیں، سب کچھ دیکھتے رہتے ہیں، اپنے جانتے کچھ بولتے بھی ہیں مگر ان کی بولی اب کسی کی سمجھ میں نہیں آتی۔

گلی میں دو کانوں پر دو کانیں بنتی جا رہی ہیں۔ صرف مولانا سبحان اللہ کا ذاتی خطۂ زمین و مکان اس نئی صورتِ حال کا ابھی حامل نہیں ہوا ہے۔ حالاں کہ مولانا کے ایک بیٹے نے باقی بھائیوں کے سامنے ایک دن یہ تجویز رکھی بھی تھی مگر بڑے بھائی نے بس اتنا کہہ کر وہ گفتگو ختم کر دی کہ "ابا حضور کی زندگی تک تم لوگ اس قسم کی باتیں نہ کرو"۔۔۔!

☆☆☆

انحد

وہ گھر ندی کے کنارے تھا۔

سردیوں میں بھور کے وقت چھائی دھند میں اور جھٹپٹے کے سمے ہوتی تیز بارشوں میں نئے آدمی کے لئے ندی اور گھر کے بیچ کا فاصلہ دھیان میں رکھنا مشکل ہو جاتا تھا۔

میں بچپن میں ایک دو مرتبہ اپنے گھر والوں کے ساتھ اس گاؤں میں گیا تھا، وہ زمانہ اس گھر والوں کی ریاست کا زمانہ تھا۔ باضابطہ ان لوگوں کی کچہری لگتی تھی۔ وقت ان لوگوں کی آنکھوں کے اشارے پر اپنی رفتار کا تعین کرتا تھا اور انگلیوں کے اشارے گاؤں والوں کی سمت کا تعین کیا کرتے تھے۔

مگر جو منظر میری زندگی میں جگنوں کی طرح بار بار جھلملاتا رہتا ہے اس کا تعلق ان دنوں سے نہیں ہے۔

یہ بہت بعد کی بات ہے، غالباً میں بی۔اے۔ کے آخری سال میں تھا۔ گھر میں کچھ چہ چا چلا تھا کہ مظفر بھائی کی شادی ہے، میرے پوچھنے پر ابا نے بتایا تھا کہ میرے دادا اور مظفر بھائی کی دادی اپنے بھائی بہن تھے۔ مجھے احساس ہوا کہ رشتہ تو قریب کا ہے مگر تعلقات ذرا رکی ہیں۔

''شادی میں ہم لوگوں کو شرکت کرنی چاہیئے۔ رشتہ کوئی بہت دور کا تو نہیں ہے'' ابا نے میری بات کی ہامی بھری تھی اور شادی میں گئے بھی تھے۔

پھر آٹھ دس ماہ گزر گئے، میرا بی۔اے کا امتحان غالباً ختم ہو چکا تھا۔ مظفر بھائی اپنی دولہن کے ساتھ میرے گھر آئے۔ مجھے ذرا حیرت ہوئی۔ مظفر بھائی اس وقت کم از کم بتیس تینتیس کے ضرور ہوں گے۔ بھابھی بیس سے زیادہ کی نہیں لگ رہی تھیں۔

پہلا دن چپ چپ گزرا، کچھ تو نئی دولہن کو دیکھنے کے لئے ارد گرد کی عورتوں کے آنے کا سلسلہ رہا کچھ اتوار ہونے کی وجہ سے ابا کی گھر میں موجودگی اور ابا کی موجودگی کی وجہ سے مظفر بھائی کا گھر ہی پر رہنا اور ان دونوں کی وجہ سے میرا انہی دونوں کے پاس زیادہ وقت گزارنا اور پھر کچھ بھابھی سے پہلی ملاقات کے سبب.....''

قصہ مختصر یہ کہ پہلا دن چپ چپ گزرا۔

دوسرے دن ابا آفس گئے، بھائی کچھ سیر سپاٹے کو نکلے، بہنیں اسکول گئیں، اماں نے باورچی خانے کی طرف جھانکا اور میں آہستہ سے بھابھی کی طرف سرک گیا۔

''آپ عورتوں سے اتنا ڈرتے کیوں ہیں'' کچھ تھوڑی بہت رسمی گفتگو کے بعد بھابھی نے سیدھا حملہ کر دیا۔

''ارے ارے۔ آپ خواہ مخواہ مجھے غصہ کیوں دلا رہی ہیں؟'' میں نے ذرا بناوٹی غصے کے ساتھ کہا تو وہ ہنس پڑیں۔

''بالکل ڈرتے ہیں آپ میرے پاس اس کا ثبوت ہے''۔

''کیا ہے؟ کیا ہے؟ بتایئے تو بھلا کیا ہے؟''

اس گھر میں داخل ہوئے مجھے چوبیس گھنٹے سے زیادہ ہو چکے اور آپ اب چوبیس گھنٹوں کے بعد میرے پاس آنے کی ہمت جٹا سکے۔''

''آپ بھی کیا چن کے ثبوت لائی ہیں؟ مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔'' ارے وہ تو کل ابا اور بھیا گھر ہی پر رہے تو اب کچھ تو ان لوگوں کی تابعداری میں وقت گزر گیا، کچھ یہ سوچ کر نہیں آیا کہ بزرگوں کی موجودگی میں نئی نئی بھابھی سے کیا بات کی جا سکتی ہے؟

''دیور جی۔ بھیا کی تابعداری میں کوئی مزہ نہیں ہے۔ بھابھی کے تابعدار ہو جایئے''

''سرکار۔ یہ بندہ بے دام خط غلامی لکھنے کو تیار ہے''

''یہات (یہ بات) ہوئی نا؟''

بھابھی قہقہہ مار کر ہنسیں تو میں چونک گیا...... ایسا جھنکار بھرا قہقہہ میں نے اس سے پہلے نہیں سنا تھا معلوم ہوتا کہ ہنسی ندی کی لہر کی طرح بہتی ہوئی چلی جا رہی ہے..... ترل ترل..... پھر وہ ہنسی اپنے اختتام پر ایسے دھیمے آہنگ کے ساتھ نشیب میں اترتی کہ لگتا ندی کی رفتار اب دھیمی

ہو رہی ہے.....ترل.....ترل.....دل ل ل!

بھابھی میرے گھر سے چوتھے دن واپس اپنی سسرال گئیں ان تین چار دنوں میں میں ان سے بہت بے تکلف ہو گیا اصل میں میرا ایک مسئلہ یہ ہے کہ سب بھائی بہن مجھ سے چھوٹے ہیں اس لئے رشتے کا بڑا بھائی بھی مجھے اپنا بڑا بھائی محسوس ہوتا ہے اور مظفر بھیا تو قریبی رشتہ دار تھے ہی، سو ہم دیور بھابھی نے جی بھر کے گپ کی، جی بھر کے مذاق کیا، ایک دوسرے کو تنگ کیا یہاں تک کہ میں نے ان پر رنگ بھی ڈال دیا۔

پھر بھیا بھابھی چلے گئے۔

بھابھی نے مجھ سے وعدہ لیا کہ ریزلٹ نکلنے کے بعد مٹھائی کھانے ان کے پاس ضرور آؤں گا۔

جب وہ چلی گئیں تو مجھے لگا کہ گھر کی ساری رونق بھی وہ اپنے ساتھ لیتی گئیں۔ ان چار دنوں میں وہ گھر کی پوری فضا میں رچ بس گئی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد گھر کا ہر حصہ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے دیوار پر سے کلنڈر اتار دیا گیا ہو میں ان کے جانے کے بعد کئی دن گھر سے ایڈجسٹ نہیں کر پایا۔ اسی بیچ پھوپھو اماں گھر آئیں۔ اماں سے بات کر رہی تھیں، میں اپنے کمرے میں تھا۔ دونوں میں سے کسی کی آواز آئی۔ ''مظفر کی بیٹا (دولہن) کتنی خوب صورت ہے''۔ اس پر دونوں میں سے کسی نے تبصرہ کیا: ''مگر مظفر کی اماں جب اپنی ساس سے نباہ نہ کر سکیں تو پتوہ کو کیا خاطر میں لائیں گی۔'' میرے لئے پہلا جملہ خاصا تھرلنگ تھا اچانک مجھے احساس ہوا کہ بھابھی واقعی خوبصورت ہیں لمبے گھنے کمر کو چھوتے ہوئے بالکل سیاہ بال، بڑی بڑی بوجھل بوجھل نشے سے جھکی جھکی محسوس ہوتی آنکھیں، ستواں ناک، ہونٹ میر کا شعر رنگ جیسے میدے کی لوئی میں کوئی ہلکا گلابی رنگ ملا دے، گردن صراحی دار، انگلیاں مخروطی، جسم سرتاپا متناسب..... مجھے یہ سوچ کر بہت اچھا لگا کہ اتنی خوب صورت عورت میری بھابھی ہے۔

پھر بات آئی گئی ہو گئی۔ ویسے شروع میں کئی بار جی چاہا کہ مظفر بھیا کے گھر جایا جائے مگر بھابھی نے تو ریزلٹ کے بعد آنے کا وعدہ لیا تھا پس میں چاہ کر بھی نہ جا پایا۔ ریزلٹ نکلنے میں تقریباً دو ماہ لگ گئے اور ریزلٹ نکلنے کے بعد فوراً ہی ایم۔اے میں داخلہ لینے کے لئے پٹنہ دوڑنا پڑا۔ پھر داخلہ ہوسٹل، کلاس، نیا ماحول، نئی دلچسپیاں..... کچھ ایسا چکر چلا کہ میں تقریباً چار پانچ ماہ بعد گھر لوٹا تو بہن نے بھابھی کا خط دکھایا۔ خط تو بہن ہی کے نام تھا مگر آخر میں صرف اتنا لکھا ہوا تھا:

"دیور جی کو میری طرف سے یہ شعر سنا دینا کہ۔

ترے وعدے پر جئے ہم یہ تو جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مرنہ جاتے اگر اعتبار ہوتا"

مجھے بڑی شرم محسوس ہوئی پھر اپنے آپ پر غصہ آیا، پھر نہ جانے کیوں آئینہ دیکھنے کو جی چاہا، پھر کئی دنوں تک یہی شعر گنگناتا رہا اور بالآخر میں مظفر بھیا کے گاؤں کے لئے روانہ ہو ہی گیا۔ راستے میں مجھے یاد آیا کہ بھابھی سے ملاقات کو تقریباً چھ ماہ ہو گئے۔

جاتی برسات کا موسم تھا، ہوا میں اب خنکی آنے لگی تھی اور بادلوں کے پرے کے پرے دور دور تک آتے اور جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ میں جب مظفر بھیا کے گاؤں معصوم آباد پہنچا تو ندی اپنے پورے ابھار پر تھی۔ اس گھاٹ سے اس گھاٹ تک پورا پاٹ جل تھل ہو رہا تھا۔ شام کے پانچ بج رہے تھے۔ جو تھوڑا بہت بچا کھچا سورج تھا اسے بھی بادلوں نے ڈھک رکھا تھا۔ منظر سارے کا سارا دھند میں کھویا ہوا تھا..... میں نے بس سے اتر کر دیکھا: ندی کنارے گھاٹ پر کشتیاں کھڑی تھیں۔ لوہے کے کھگووں (لنگر) سے انہیں گھاٹ کے کسی سرے سے باندھ دیا گیا تھا مگر ابال پر آئی ندی کے تھپیڑے کشتیوں کو چین نہیں لینے دے رہے تھے اور کشتیاں کسی آسیب زدہ کی طرح آگے پیچھے دائیں بائیں جھول بھی رہی تھیں اور شاید جھوم بھی رہی تھیں۔ مجھے ایسا لگا جیسے یہ جھگڑ (لنگر) توڑ کر بدمست ندی سے ملن کی موہ مایا میں لت پت ہو رہی ہیں۔ کشتی مجھے ایک ایسا پاگل محسوس ہوئی جس کے پیروں میں زنجیریں ڈال دی گئی ہوں اور پاگل پابہ زنجیر ہونے کے باوجود ناچنے کی کوشش کر رہا ہو۔

میں مظفر بھیا کے گھر میں داخل ہوا تو اندھیرا میرے پیچھے ہی دروازے پر کھڑا نظر آیا۔

شام کی دھند میں کھویا نیچے پاٹے (چھت) والا کچی دیواروں پہ قائم کھپریل کا ایک چھوٹا سا گھر، سامنے آنگن، آنگن کے بعد دالان، دالان سے لگے لگے تین کمرے، ایک طرف چھوٹا سا بغیر دروازے کا باورچی خانہ، گھر میں چپ کی اندھی چڑیا اپنے پنکھ پھیلائے چاروں اور پسری پڑی تھی۔ دالان کے ایک کونے میں ایک پنجرہ ٹنگا ہوا تھا جس میں ایک طوطا سر نہوڑائے جانے کس دھیان میں گم تھا۔ اسی سے ذرا ہٹ کر کھپریل کی اولتی کے سائے میں رکھا ایک ڈربہ.....

"مرغیاں ہوں گی"۔ میں نے سوچا پھر نگاہ سامنے بیٹھی خاتون پر ٹک گئی..... مظفر بھیا کی اماں

(میری پھوپی) دالان میں چوکی پر بیٹھی چھالیہ کتر رہی تھیں اور ان کا منہ پان کی سرخی سے لال ہو رہا تھا۔ میں نے انہیں بہت دنوں بعد دیکھا تھا۔ اس وقت کی کوئی خاص شبیہ ذہن میں محفوظ نہیں تھی مگر اس لمحے میں ان کو دیکھنے کے بعد پہلا خیال ذہن میں آیا..... زمیندار..... پھر دوسرا لفظ بجلی کے کوندے کی طرح لپکا..... کڑک خاں..... ذہن نے ایک چھلانگ اور لگائی اور ایک جملہ پھر جگمگایا..... مرداں خاں..... مجھے ہنسی آ گئی..... میں بلاوجہ ایک سیدانی کو پٹھانی بنائے جا رہا تھا۔

"کون ہو بابو؟ کس کو کھوج رہے ہو؟"

"جی میں....." مجھے لگا میرے حلق میں کچھ اٹک گیا ہے..... میں..... میرا نام سبطین رضا ہے۔"

"ارے سبطے ہو جی؟" اچانک کسی طرف سے آواز آئی اور پھر ایک سمت سے ایک عورت بے تحاشہ چھلانگیں لگاتی میری طرف دوڑی۔

وہ عورت کئی دنوں کی پہنی ساری پہنے ہوئے تھی، چہرہ دھوپ کی تمازت سے تمتمایا ہوا..... رنگ بھی بہت مدھم..... ہاتھ، ناک، کان میں کچھ بھی نہیں تھا، سیدھا آنچل اوڑھے ایک پورم پور دیہاتی عورت..... وہ عورت نزدیک آئی تو میری آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں..... وہ تو میری بھابھی تھیں..... میری چاند جیسی خوب صورت بھابھی!

کیسے ہے و..... بے ایمان ہو!" انہوں نے اچانک ہی جملہ بھی بدل دیا اور مجھ سے بالکل لپٹ پڑنے والی کیفیت کے حصار سے جیسے باہر نکل کر تھم سی گئیں۔ شیر پر شکاری ٹارچ کا پورا فوکس ڈالنے سے شیر جہاں کا تہاں کھڑے کا کھڑا رہ جاتا ہے۔ پھوپھو مجھے نہیں بھابھی کو دیکھ رہی تھیں۔

پل کا شاید وہ ہزارواں حصہ رہا ہوگا مگر میں نے پل کے اس چھوٹے سے ننھے سے ٹکڑے کو جی کڑا کر کے ننگی آنکھوں سے سارا کا سارا دیکھا تھا۔ آنکھوں پر عذاب کی طرح اترتا وہ پل میرے لئے بارہ بجے دوپہر کے آگ برساتے سورج کی طرح پورے کا پورا چبھتا اندر اندر کاٹتا مجھے محسوس ہوتا ہوا ایک کڑوا کسیلا احساس اور نظارہ تھا..... بھابھی میرے بالکل پاس پہنچنے والی ہی تھیں بلکہ ان کی ساری کا آنچل میرے شرٹ کو چھو بھی چکا تھا کہ یک بارگی انہوں نے بغیر گردن موڑے کن انکھیوں سے اپنی ساس کو دیکھا..... وہ بالکل خموش تھیں مگر ان کی آنکھ..... شیر کے بارے

میں سنا تھا کہ وہ شکار پر جھپٹنے سے پہلے اس پر اپنی آنکھ کا فوکس مرتکز کرتا ہے۔
'' کیسے بے ایمان ہو! بھیا سے تم نے وعدہ کیا تھا کہ ریزلٹ نکلتے ہی آؤں گا''۔
بھابھی میرے ہاتھ سے میری اٹیچی لیتی ہوئی بولیں۔'' تمہارے بھیا نے تمہارا کتنا انتظار کیا''۔
اب وہ دروازے سے آنگن میں آ چکی تھیں۔ پھوپھوابھی تک چپ تھیں اور مجھے دیکھے جا رہی تھیں۔
مجھے حیرت ہوئی۔ وعدہ میں نے ان سے کیا اور یہ فرانے سے بھیا کا حوالہ دیئے جا رہی تھیں۔
''سبطین ہیں۔ عبدالرزاق چچا کے بیٹا''۔ وہ پھوپھو کی طرف مخاطب ہوئیں۔ پھوپھو کے چہرے کا تناؤ کچھ کم ہوا۔
'' آؤ آؤ بیٹھو۔ ابا اماں کیسے ہیں جی؟'' پھوپھو نے دالان میں بچھی چوکی کا ایک حصہ صاف کرتے ہوئے کہا۔
''جی اچھے ہیں۔ آپ کو سلام کہا ہے''
'' ہاں بس ایسے ہی وہ سلام بھجوتے رہیں میں سلام لیتے لیتے ایک دن مر جاؤں گی۔ کبھی ان کا آنے کو جی نہیں چاہتا''
میں چپ رہا کیا کہہ سکتا تھا، ویسے بھی میں ابا اور پھوپھو کے تعلقات استوار کرنے تو آیا نہیں تھا۔ میں تو بھابھی کے لیے آیا تھا۔ سو ناشتہ کرنے تک تو کسی طرح میں
پھوپھو اور بھابھی کے بیچ پنڈولم بنا رہا مگر ناشتہ ختم ہوتے ہوتے قدرت مجھ پر مہربان ہوگئی گاؤں کی کچھ عورتیں آ گئی تھیں اور پھوپھو ان سے محو گفتگو ہو گئی تھیں۔ میں نے موقع غنیمت جانا آہستہ سے ایک مچیا (رسی سے بنا چھوٹے پایوں والا موڑھا) اٹھا کر بھابھی کے پاس باورچی خانے میں آ گیا۔
'' ہائے توبہ ایسے کیوں بیٹھ رہے ہو؟'' وہ ہڑ بڑا کر شاید کرسی لانے کے لئے اٹھیں۔
'' میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ بیٹھیے۔'' میں نے بے سوچے سمجھے ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں بٹھانا چاہا۔
وہ ایک دم ٹھٹھک کر کھڑی کی کھڑی رہ گئیں۔ وہ میرے بالکل پاس کھڑی تھیں۔ ان کی جانگھ کا حصہ میرے بازو سے مس کر رہا تھا ان کا ایک ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا، ان کا دوسرا ہاتھ میرے گال سے ٹکرایا بھی تھا۔ میں نے ان کی طرف دیکھا۔ وہ بھی میری طرف دیکھ رہی تھیں بعد میں جب جب میں نے ان کی آنکھوں کے بارے میں سوچا تو ابال پر آئی ندی یاد آئی۔ پھر پتہ

نہیں میں نے ان کا ہاتھ چھوڑ دیا یا انہوں نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ وہ آہستہ سے چولہے کے پاس پڑے پیڑھے پر بیٹھ گئیں۔ لکڑیوں سے جلی آگ کی لو تیز ہو گئی تھی، شعلوں کی لالی ان کے چہرے پر پڑ رہی تھی اور ان کا چہرہ بالکل سرخ ہو رہا تھا اور ان کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اور وہ چولہے میں پڑی لکڑیوں سے اٹھتے شعلوں کی لو مدھم کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''ان لکڑیوں کے پیچھے کیوں پڑی ہیں۔ انہیں چھوڑ دیجئے'' میں نے بے ارادہ ایک بات کہی۔

''شعلوں کی تپش برداشت نہیں ہوتی۔''

''انہیں زبردستی بجھایئے گا تو بہت دھواں اٹھے گا۔''

''اٹھنے دو''

''ان کی آنکھ میں بھی تو لگے گا''۔ میں نے پھوپھو کے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

''لگنے دو'' وہ میرا اشارہ سمجھ گئیں۔ ''کسی بھی طرح ان کی آنکھ نم تو ہو۔'' بڑی خوبصورت سی ہنسی ان کے چہرے پر بکھر گئی۔

''آپ برداشت کر پایئے گا؟''

''اب تو عادی ہو گئی ہوں۔ ایک برس سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا''

''آپ بھیا سے کیوں نہیں کہتیں؟''

''سیلے جی''۔ انہوں نے عجیب نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''آپ کے گھر سے لوٹ کر وہ یہاں آئے اور اس کے بعد گئے تو پھر اب تک نہ لوٹے ہیں۔''

اس جملے پر ہم دونوں کے بیچ چپ کا مہا ساگر آن پڑا اور بیچ میں چولہے کا دھواں بھی۔ دھند گہری ہو گئی تھی اور وہ صاف صاف نظر نہیں آ پا رہی تھیں۔

چاروں طرف دھواں دھار بارش شروع ہو گئی تھی، تیز ہوائیں بارش کی پھوار کو چاروں طرف اڑائے لئے پھرتی تھیں اور ندی میں پانی کے تیز ریلے کی آواز ندی کے جوش کا احساس دلا رہی تھی۔ بھابھی آنکھ صاف کر رہی تھیں..... ''دھواں پھوپھو سے پہلے تو انہی کو پریشان کر رہا ہے۔'' میرے جی میں اک بات آئی پھر ہم دونوں ہی پھوپھو کی آواز کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ اپنے کمرے میں موجود عورتوں سے بات کر رہی تھیں: ''تم لوگوں کو چتوہ رکھنے کا فن نہیں آتا۔ میں

نے تو لطیف کی ماں تم کو شروع ہی میں سمجھایا تھا۔ پاؤں کی جوتی کو پاؤں ہی میں رہنا چاہئے۔ تم سے تمہاری اولاد نہ سنبھلی تو دوسرے کی اولاد کیا سنبھلے گی، مجھے دیکھو۔ مجال ہے مظفر میاں کی کہ میرے سامنے وہ اونچی آواز میں بات بھی کرلیں۔ زبان نہ کھینچ لوں ان کی....''

''باپ رے۔ یہ تو بالکل مارتے خاں۔ بے دھڑک رستم پوری ہیں۔'' میں نے سرگوشیوں میں کہا۔

''قصائی ہیں قصائی۔'' وہ اور بھی آہستہ سے بولیں۔

''ان کے ساتھ کچھ زیادہ محبت کا حربہ استعمال کرنا ہوگا۔''

''ہر بیٹا ماں سے تو محبت کرتا ہے نا؟'' انہوں نے عجب سا سوال کیا۔

''ہاں۔ بھلا یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے؟''

''یہ بیٹے کو بھی نہیں بخشتیں۔ تین رات ایسی بھی آئی کہ انہوں نے تمہارے بھیا کو میرے پاس آنے نہیں دیا''

میں بس ایک ٹک بھابھی کو سنتا رہا۔ میرا دماغ کام نہیں کر پا رہا تھا۔ کوئی عورت اتنی بھی ظالم ہو سکتی ہے؟ عام طور پر عورت کے بارے میں تو یہی تصور بنا رہتا ہے کہ وہ خوب صورتی، نرمی اور محبت کی علامت ہے مگر یہاں تو.....''

اب بارش کے ساتھ بجلی کی چمک اور بادلوں کی گرج بھی شروع ہوگئی تھی۔ فضا ساری کی ساری عجب بھیانک اور ڈراونی محسوس ہو رہی تھی۔

پھر وہ پل گزر گیا۔ عورتیں بارش کم ہونے پر اپنے گھروں کو چلی گئیں۔ دیہات میں تو رات بہت پہلے شروع ہو جاتی ہے۔ آٹھ بجتے بجتے کھانے سے فراغت ہوگئی۔ میں نے ایک بات شدت سے محسوس کی۔ میں پانچ ساڑھے پانچ کے قریب پہنچا تھا اور اب نو بج رہے تھے۔ ان ساڑھے تین چار گھنٹوں میں پھوپھو نے خود سے اٹھ کر پانی بھی نہیں پیا تھا، وہ صرف حکم صادر کرتی تھیں اور بھابھی اس کی تعمیل کے جتن میں پھرکی کی طرح سارے گھر میں دوڑتی پھرتی تھیں اور سارا گھر سنبھالے ہوئے تھیں۔

''سیلے کا بستر اوپر لگ گیا؟'' پوچھنے کا انداز ایسا تھا جو صاف بتا رہا تھا کہ اب مجھے اوپر چلے جانا چاہئے۔

''جی ہاں۔'' بھابھی نے آہستہ سے مختصر سا جواب دیا۔

''اب آپ لوگ بھی آرام کیجئے میں بھی سونے چلا'' اوپر چلے آنے کے علاوہ چارہ کار کیا تھا؟

میں اوپر چلا آیا بستر پر لیٹ بھی گیا، مگر نیند بھلا کیسے آتی، میں تو بارہ سے پہلے سونے کا عادی ہی نہیں تھا، کروٹ بدلتا رہا سونے کی ناکام کوشش کرتا رہا اور نیند کے بجائے وقت مجھ پر حملہ کرتا رہا..... رات کا سمے، نزدیک و دور سے کبھی تیز کبھی مدہم بارش کی آواز گھر کے آس پاس بنسواڑی میں لگے بانس کے درختوں کی سرسراہٹ، اور پھر بارش اور درختوں کی آواز میں ملا جلا ندی کا جل ترنگ۔ میں نے اٹھ کر پچھم کی طرف بنی چھوٹی سی کھڑکی سے باہر دیکھا..... چاروں طرف بارش.....دور دور تک بارش.....اچانک ایک عجیب سا احساس ہوا۔ اسی چھت کے نیچے وہ سوئی ہیں..... میں نے گھڑی دیکھی، دس بج چکے تھے..... ''اب سونا چاہیے''..... میں نے سوچا مگر مجھے نیند ہی نہیں آرہی تھی تو میں کیا کرتا۔ اب یہ تو یاد نہیں کہ ضرورت تھی یا نہیں لیکن میں باتھ روم جانے کے لئے نیچے اترا..... باتھ روم سے باہر نکلا تو بے ساختہ بھابھی والے کمرے کی طرف نگاہ اٹھ گئی.....وہ سامنے دروازے پر کھڑی تھیں..... میں ایک منٹ کے لئے ٹھٹھک گیا..... میرے ان کے بیچ پانی کی پھوار تھی..... کنارے اولتی میں لگے ہک میں ٹنگی مدہم لالٹین چاروں طرف عجب بھیدوں بھری روشنی پھیلا رہی تھی..... پانی کی پھوار کے بیچ بیچ سے لرزتی کانپتی روشنی بھابھی کے چہرے پر پڑ رہی تھی.....ان کا چہرہ عجب عجب سے رنگوں میں شرابور نظر آیا مگر ایک رنگ میں بھی نمی کا نام و نشان نہیں تھا..... میں نے دور سے دیکھا: وہ مجھے دیکھ رہی تھیں اور ان کے ہونٹ بالکل خشک تھے...... مجھے اس بالٹی کی کگار پر بیٹھی بالٹی کی تہہ کو حسرت سے تکتی چڑیا یاد آئی جس کی تہہ میں پانی جھل جھل جھلکتا تھا۔

میں اچانک میں نہیں رہا، پتہ نہیں اب وہاں پر کون تھا جو سب کچھ بھول گیا۔ میں یکا یک بیچ آنگن سے پانی میں بھیگتا ہوا ان تک پہنچ گیا۔ ان کی آنکھوں میں انتظار کے مہا ساگر امڈ رہے تھے..... میں نے بغیر سوچے سمجھے پاس پہنچ کر ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ کچھ نہ بولیں۔ میں کچھ دیر یونہی کھڑا رہا، وہ بھی میرے ہاتھ میں ہاتھ دیئے چپ کھڑی تھیں۔ پھر میں ان کے قریب ہو گیا۔ اب میں ان کی سانسوں کے زیر و بم کو پوری طرح محسوس کر رہا تھا۔

''اوپر آیئے''۔ میری آواز انتہائی سرگوشیوں میں ابھری اور میں ان کا ہاتھ پکڑے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔

وہ بے خود اور بے اختیاری میرے ساتھ آگے بڑھنے لگیں.....کچھ قدم میرے ساتھ چلیں.....پھر رک گئیں۔

''کیا ہوا؟''میں نے اتنی ہی آہستگی سے پوچھا۔

وہ چپ رہیں۔ کچھ نہیں بولیں۔ ہم دونوں بیچ آنگن میں کھڑے تھے۔ بارش کی پھوار ہمیں شرابور تو نہیں کر رہی تھی لیکن ہم بھیگ ضرور رہے تھے اور سارے میں گہری اندھیری رات بکھری پڑی تھی اور پر جوش ندی دکھائی تو نہیں دے رہی تھی مگر کانوں تک پہنچنے والا لہروں کا زیرو بم اس کے سر جوش کا احساس ضرور دلا رہا تھا.....وہ چپ کھڑی تھیں، میں انہیں دیکھ رہا تھا.....یک بارگی انہوں نے دوسرے ہاتھ سے میرا گال چھوا اور بہت آہستگی سے بولیں.....''جاؤ سور ہو''۔ اور اتنی ہی آہستگی سے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے الگ کر لیا اور دھیرے سے اپنے کمرے کی طرف مڑ گئیں۔

بارش نے آنگن کی زمین اتنی چکنی کر دی تھی کہ ان کا ہر قدم مشکل سے اٹھ رہا تھا۔ مجھے لگا وہ آگے نہیں بڑھ پا رہی ہیں مگر بہر حال وہ لوٹ رہی تھیں.....کسی نہ کسی طرح وہ کمرے تک پہنچ گئیں۔ کمرے کے دروازے پر پہنچ کر وہ پلٹیں میری طرف دیکھا اور آہستہ سے مسکرائیں۔ بارش کے قطرے ان کی آنکھوں سے بڑھ کر ان کے گالوں کو چھو رہے تھے۔ وہ مسکرائے جا رہی تھیں اور مجھے اوپر جانے کا اشارہ کر رہی تھیں اور بارش کے قطرے ان کی آنکھوں سے گالوں کی ڈھلکے چلے آرہے تھے۔

میں اوپر چلا آیا۔۔۔

مگر اس کے بعد میں سو نہ سکا۔۔۔

عجب قسم کی بے چینی، یقیناً اس میں شرمندگی کا عنصر بھی شامل تھا۔ یہ میں نے کیا کیا؟ یہ مجھے نہیں کرنا چاہئے تھا۔ ان کو یہ بات پسند نہیں آئی ہوگی میں ان کے یہاں مہمان تھا اس لئے وہ چپ رہ گئیں لیکن کیا سوچا ہوگا انہوں نے میرے بارے میں؟ مگر وہ دروازے پر کیوں کھڑی تھیں وہ میرے ساتھ آگے کیوں بڑھ آئی تھیں؟ ممکن ہے ان کو نیند نہ آئی ہو اور مجھے اترتا محسوس کر کے وہ یونہی اخلاقاً دروازے پر آ گئی ہوں کہ شاید مجھے کوئی ضرورت ہو۔ آخر تو میں انہی کی وجہ سے یہاں

آیا۔ یہ تو وہ اچھی طرح جانتی ہیں۔ مگر تب وہ آگے کیوں بڑھیں؟ ممکن ہے پہلے انہوں نے میرے اوپر چلنے کی بات کو بہت Seriously نہ لیا ہو اور چند قدم آگے بڑھ کر انہیں اس بات کے غلط ہونے کا احساس ہوا ہو..... مگر..... اچانک ان کا ایک جملہ گونجا: ''آپ کے گھر سے لوٹ کر وہ یہاں آئے اور اس کے بعد گئے تو پھر اب تک نہیں لوٹے ہیں''..... پھر ان کا پانی کی بوچھار کے درمیان سوکھا سوکھا چہرہ یاد آیا..... پھر ان کا میرے چہرے کو بے تابانہ چھوتا ہوا ہاتھ..... پھر ان کی آواز..... ''جاؤ۔ سو رہو''۔

میں ساری رات خواب اور بے خوابی کے درمیان جھولتا رہا اور ساری رات ندی کے بہہ بہنے کی آواز آتی رہی اور ساری رات رک رک کر کبھی تیز کبھی مدہم بارش کھونٹ کھونٹ برستی رہی..... اور میں ساری رات سو نہ سکا۔

صبح ہوئی تو میں تو شروع میں کچھ شرمندہ سا رہا مگر بھابھی کے چہرے پر خفگی کا کوئی عکس نہیں تھا۔ آج وہ سویرے سویرے نہا کر کپڑے بدل چکی تھیں اور شاید چہرے پر ہلکا سا غازہ بھی لگا لیا تھا۔ چھ ماہ پہلے والی خوب صورتی لوٹ آئی تھی۔

میں ناشتے کے بعد کچھ اور رشتہ داروں سے ملنے کی غرض سے باہر نکلا تو پھر دیر ہو ہی گئی۔ لوٹتے لوٹتے تقریباً ایک بج چکا تھا۔

''کہاں رہ گئے تھے تم؟ تمہارے انتظار میں ابھی تک میں نے کھانا نہیں کھایا''

''ارے ارے۔ سوری بھابھی..... ملنے ملانے میں دیر ہو گئی''

کھانے کے دستر خوان پر میں نے اشارے سے پھوپھو کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے اشارے ہی میں بتایا کہ وہ نماز پڑھ رہی ہیں۔

ہم لوگوں کے کھانے سے فارغ ہوتے ہوتے پھوپھوبھی نماز سے فارغ ہو گئیں، بھابھی نے ان کے کمرے میں کھانا لگایا، کمرے کے دروازے پر پانی کا لوٹا رکھا تب وہ انتہائی تمکنت کے ساتھ اٹھیں، ہاتھ دھو کر دستر خوان پر بیٹھیں۔ اور جتنی دیر وہ کھاتی رہیں بھابھی انہیں پنکھا جھلتی رہیں۔

وقت گزاری کے لئے میں بھابھی ہی کے کمرے میں رکھی کرسی پر بیٹھ گیا تھا اور بغل میں ٹیبل پر رکھی کتابیں الٹ پلٹ کر رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہاں بانو، بیسویں صدی اور شمع وغیرہ

جیسے رسائل موجود تھے اور کبھی زیادہ نہیں صرف ایک دو ماہ ہی پرانے تھے۔ ہر رسالے پر بھابھی کا دستخط بھی تھا۔ مجھے یہ تو معلوم تھا کہ ان کا میکہ شہر میں ہے اور وہ آئی.اے۔ پاس ہیں، بلکہ یاد آیا شاید انہی نے بتایا تھا کہ بی.اے. میں ان کا داخلہ بھی ہو گیا تھا، چھ سات ماہ کلاس بھی کیا تھا کہ ان کی شادی ہو گئی اور سب ادھورا رہ گیا، مگر انہیں ابھی تک مطالعے کا شوق ہے اس کا اندازہ نہیں تھا۔

''نئے رسالے نہیں ہیں۔ ادھر کوئی شہر گیا ہی نہیں''۔ انہوں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔۔۔

''بھابھی مجھے تو اندازہ ہی نہیں تھا ورنہ میں تو بہت سے رسالے لئے آتا''

''صاحب ہم نے تو غالبؔ کے شعر ہی کے ذریعہ آپ کو یہاں تک کھینچ بلایا۔ آپ کو اس پر بھی اندازہ نہیں ہوا؟'' بھابھی ہنسیں

''ویری ویری سوری''۔ میں واقعی بہت شرمندہ ہو گیا۔ میں نے بالکل سامنے کی بات نظر انداز کر دی تھی۔

''ایک منٹ رکو''۔ وہ آہستہ سے کہتی ہوئی باہر گئیں۔ ان کا رخ پھوپھو کے کمرے کی طرف تھا۔

پھر کچھ دیر بعد لوٹ آئیں اور سامنے رکھی دوسری کرسی پر بیٹھ گئیں۔ اچانک ان کے چہرے پر بڑا اطمینان سا جھلکنے لگا تھا۔

''کہاں گئی تھیں؟''

''آپ کی پھوپھو کو دیکھنے کہ سوئیں یا نہیں''۔ کبھی تم کبھی آپ۔ یہ ان کا خاص انداز تھا۔

''اتنی جلدی وہ سو جاتی ہیں؟''

اس پر وہ بے ساختہ ہنس دیں اور بڑے اطمینان سے بولیں: ''ساری دنیا پر رعب چلاتی ہیں مگر نیند کے آگے وہ بے بس ہو جاتی ہیں۔''

''یعنی؟'' میں نے محسوس کیا کہ اب ان کی آواز میں شعوری طور پر پیدا کی ہوئی آہستگی بھی نہیں تھی۔ ''یعنی یہ کہ دوپہر میں کھانے کے بعد ان کو فوراً نیند آ جاتی ہے اور دو گھنٹہ گہری نیند سوتی ہیں، اسی طرح رات میں کھانے کے بعد وہ سوتی ہیں تو چار بجے بھور سے پہلے ان کی نیند نہیں ٹوٹتی۔

پھر ہم باتیں کرنے لگے، دنیا جہان کی باتیں، مگر میں نے غلط کہا، میں تو کچھ دیر بول کر

چپ ہو گیا مگر وہ بولتی رہیں، میرے گھر جب وہ آئی تھیں تب بھی ان کو اتنا موقع نہیں ملا تھا مگر یہاں تو یہ صورت کہ پھوپھو کی دو بیٹیاں دونوں اپنی سسرال اور بس ایک بیٹا مظفر بھیا جو اپنی تجارت کے سلسلے میں دور کے ایک شہر کے باشی اور پھوپھو کی نیند ایسی گہری کہ بقول بھابھی: "سرہانے پٹاخہ بھی پھٹ دو تو نیند نہ ٹوٹے"۔ اور ادھر بھابھی لبالب پیالہ۔ وہ بتانے لگیں کہ شروع میں ان کے بھائی بہن وغیرہ کئی بار آئے مگر پھوپھو نے ایسا سرد رویہ اختیار کیا کہ آہستہ آہستہ ان لوگوں نے بھی احتیاط برتنی شروع کر دی۔ ان کی آنکھوں میں دکھ کی پرچھائیاں تیر رہی تھیں، چہرے پر اداسی کے بادل چھائے ہوئے تھے اور ہونٹوں پر برہا کا بارہ ماسہ....."

"سبطے میں بدنصیب ہوں، ماں باپ کو دوش نہیں دوں گی، میرا ہی نصیب چھوٹا تھا مگر خدا سے شکوہ ضرور ہے کہ جب ایسی اجاڑ جگہ اور ظالم لوگوں کے درمیان زندگی گزارنا میرا مقدر بنایا تھا تو پھر میرے دل میں آرزوؤں کا درخت کیوں لگا دیا، مجھے پتھر دل کیوں نہ بنایا کہ کوئی احساس نہ ہوتا....."۔

"بھابھی۔ یہ سب وقتی باتیں ہیں۔ سب آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے ان کو دلاسہ دینے کی کوشش کی۔

"نہیں سبطے۔ یہ وقتی بات نہیں ہے۔ میں قصائی کی چھری کے نیچے رکھی بکری ہوں۔ وہ عورت قصائی ہے۔ وہ خط لکھوا لکھوا کر تمہارے بھائی کو یہاں آنے سے روک دیتی ہے۔" اتنا کہتے کہتے ان کی آنکھیں بھر آئیں۔

"نہیں نہیں بھابھی۔ اتنی ناامیدی غلط ہے"۔ بے ساختہ میرے ہاتھ ان کے آنسو پونچھنے لگے۔ انہوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اپنے گال سے چپکا کر رونے لگیں۔ میرا ایک ہاتھ ان کے گال پر تھا اور دوسرا کبھی ان کی آنکھوں پر جاتا کبھی سر پر کبھی شانے پر میری کہنی کا حصہ ان کی گردن کے نیچے کے حصے سے مس کر رہا تھا۔

اب میں کچھ بول نہیں پا رہا تھا، بس وہ رہ رہ کر سسکیاں لیتی تھیں اور جیسے نیند میں بچے ڈر کر چونکتے ہیں ویسے وہ بار بار چونک رہی تھیں، اور جب وہ چونکتیں تو اپنے دونوں پیروں کو سختی سے سمیٹ لیتی تھیں، ایسے میں کبھی میری کہنی ان کے ٹخنے چھوتی کبھی ان کے دونوں ٹخنوں کے بیچ آ جاتی۔

اچانک وہ چونک کر الگ ہو گئیں۔ باورچی خانے سے برتن گرنے کی آواز آئی تھی۔

'' تو یہ بلی تھی''۔ وہ ہنستی ہوئی کمرے میں واپس آئیں اور کرسی پر بیٹھتی ہوئی بولیں۔

''سہیلے :تم تھوڑا آرام کرلو''۔

''نہیں نہیں۔ میں ٹھیک ہوں آپ آرام کر لیجئے''۔

'' ارے نہیں بھائی۔ دن میں سونے کی عادت اب نہیں رہی۔ تم آ جاؤ بستر پر۔ آپ لیٹئے ہم آپ سے گپ کرتے رہیں گے۔''

ان کا اصرار اتنا بڑھا کہ میں انکار نہ کر سکا۔ دوپہر میں لیٹنے کی میری عادت تو تھی ہی۔ میں لیٹ گیا، وہ سامنے کرسی پر بیٹھی رہیں اور بولتی رہیں۔

بولتے بولتے انہوں نے ایک پیر دوسرے پیر پر چڑھا لیا اور ان کی پنڈلی سے ذرا اوپر کا کچھ حصہ یوں جگمگانے لگا جیسے گھنے بادلوں میں سے کبھی کبھی کوئی ستارہ جگمگانے لگتا ہے۔ جو پیر انہوں نے پیر پر چڑھا لیا تھا وہ ٹخنے سے ذرا اوپر کھلا ہوا تھا اور ٹخنے کے پاس خوب صورت چھاگلوں کا ایک جوڑا یوں تو مون سادھے پڑا تھا مگر بات کرتے کرتے جب نہ تب وہ اس پیر کو ذرا سا ہلا دیتیں اور چھاجھن سے بج اٹھتے۔

چھانجھنوں کے بجنے سے ایک عجیب سی موسیقی فضا میں گونج اٹھتی اس میں نہ تو اکتارے یا جل ترنگ کا آہنگ تھا نہ سادھوؤں کے کڑے بجنے والی کیفیت، نہ ہی چوڑیوں کی کھنکھناہٹ۔ جب ان کے پیر ہلتے تو ایسی ہلکی سی گونج پیدا ہوتی جیسے بہتے ہوئے جھرنے کے جھر جھر یا ندی کے ترل ترل میں کوئی بہت ہلکے مدھم سر میں سر ملانے کی کوشش کر رہا ہو، یا جیسے دونوں چھاگلیں ایک دوسرے سے سرگوشی کر رہی ہوں اور پھر یہ گونج نئی نویلی دولہن کی طرح ہولے ہولے سج سج ہواؤں پہ قدم دھرتی لگتا کہ دروازے کی طرف جا رہی ہے مگر جب وہ اپنے پیر کی حرکت روکتیں اور چھانجھن اوپر سے نیچے کی طرف آتے تو لگتا کہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے والی میٹھی سرگوشی کہیں نہیں گئی واپس لوٹ آئی اور اسی کمرے کی فضاؤں میں ہولے ہولے تحلیل ہونے لگی۔

''اچھا لگتا ہے''۔ میں بے ارادہ بول اٹھا۔

'' کیا؟''

'' آپ کے چھانجھنوں کا جھن جھن بجنا''

وہ کھلکھلا کر ہنس دیں اور چھانجھن پھر جھن سے بج اٹھے..... پھر یوں ہوا کہ وہ جان بوجھ

کر بار بار چھاگلیں بجانے لگیں.....وہ چھاگلیں بجاتی رہیں اور میں کچھ عجب سی کیفیت کے حصار میں گھرا آنکھ بند کئے ان کی جھنجھناہٹ سنتا رہا.....پھر وہ رک گئیں۔

''کیوں رک گئیں؟ اچھا لگ رہا تھا۔'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''میرا پیر دکھ گیا''۔ وہ مصنوعی غصے کے ساتھ ذرا مسکرا کر بولیں۔

''میں بجاؤں؟'' پتہ نہیں کیسے زبان سے ایک جملہ پھسل پڑا۔

وہ کچھ دیر چپ رہیں.....پھر آہستہ سے بولیں.....بجاؤ!''

میں ان کے جھانجھنوں سے کھیلتا رہا، جھانجھن بجتے رہے اور اب میرے بجائے وہ آنکھ بند کئے کرسی پر ساکت بیٹھی تھیں اور میں جھانجھن بجائے جا رہا تھا۔ جھانجھن بجانے کے دوران کئی بار میرا ہاتھ ان کے پیر سے ٹکرایا۔ مگر مجھے ہر بار گزری ہوئی رات یاد آ جاتی اور میں آہستہ سے اپنا ہاتھ ہٹا لیتا۔ مگر پھر کچھ دیر بعد جھانجھن بجانے لگتا.....پنڈلی اور گھٹنے کے درمیان چمکنے والا ستارہ اب ملکہ وکٹوریہ کا چم چم چمکتا ہوا چاندی کا روپیہ بن گیا تھا۔

دیوار گیر گھڑی نے چار کی گھنٹی بجائی وہ چونک کر کرسی سے اٹھ گئیں۔ میں نے حیرت سے ان کو دیکھا۔

''ان کے اٹھنے کا وقت ہو گیا۔'' انہوں نے آہستہ سے مجھے اطلاع دی اور کمرے سے باہر نکل گئیں۔

میں ان کے جانے کے بعد بھی آنکھیں موندے بستر پر پڑا رہا کیوں کہ پھوپھو کے اٹھنے کی آواز مل چکی تھی۔ وہ اپنے کمرے سے نکل کر اس کمرے کی طرف آئیں کمرے میں کچھ دیر وہ کھڑی رہیں باہر بھابھی کے برتن مانجھنے کی آواز آ رہی تھی، پھر وہ باہر نکل گئیں اور عجیب سے لہجے میں بھابھی سے پوچھا۔''

سبطین کتنے بجے سوئے؟''

''جی آپ کے سونے کے تھوڑی ہی دیر بعد''

''اوپر کیوں نہیں سوئے؟''

''ہم کیا کرتے؟ مہمان ہیں۔ سو گئے تو اٹھایا نہیں''

''ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ وہ تیرا اپنا دیور نہیں ہے۔'' ان کے لہجے میں ایسا گھناؤنا پن

اور سفاکی تھی کہ میں اندر سے ذرا سا سہم بھی گیا اور خوف سے زیادہ اس عورت سے گھن محسوس ہوئی۔

"مجھے آج چلے جانا چاہئے تھا"۔ بے ساختہ ایک خواہش نے سر اٹھایا۔

"اب شام میں تو کوئی بس یہاں سے شہر جاتی نہیں۔کل ضرور چلا جاؤں گا۔" میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا۔

کمرے سے بھابھی کے جانے کے بعد ہی سونے کی خواہش جاگی تھی، ذرا سی اونگھ بھی آئی تھی۔کل رات میں بالکل ہی نہیں سو سکا تھا۔ میں سو بھی جاتا مگر پھوپھو کی باتوں نے طبیعت مکدر کردی۔ میرا سر بھاری ہورہا تھا مگر مجھے نیند نہیں آرہی تھی، سوچا اٹھ جاؤں مگر پھوپھو کے سامنے جاتے ہوئے ہچکچاہٹ ہورہی تھی، کچھ اکتاہٹ، کچھ شرمندگی، کچھ پھوپھو کے لئے بن بلایا مہمان ہونے کا احساس، بستر سے اٹھنے کو میرا جی نہیں چاہ رہا تھا مگر اٹھنا تو تھا ہی، باہر نکلا تو وہ باورچی خانے کے بالکل سامنے کھٹولا ڈال کر آلتی پالتی مارے بیٹھی نظر آئیں۔ بھابھی باورچی خانے میں جتی ہوئی تھیں۔آج دن میں بارش نہیں ہوئی تھی مگر موسم بالکل گھرا گھرا تھا چاروں طرف بادل ہی بادل، ہوا رکی ہوئی تھی اور فضا پر حبس سا طاری تھا۔

"لگتا ہے بارش ہوگی بالکل حبس ہورہا ہے۔" میرا رخ پھوپھو کی طرف تھا۔

"دو تین گھنٹے سے آسمان گھرا ہوا ہے۔ بارش تو ہونی ہی چاہئے۔" پھوپھو سے پہلے بھابھی بول اٹھیں۔ میں چپ رہا مگر طبیعت ذرا جھنجھلا گئی" ہر بات کا جواب انہی کو دینا ہے؟" پھر بھی کچھ بولا نہیں۔خموشی سے چاپاکل کے پاس بنے چبوترے کی طرف منہ دھونے کی غرض سے بڑھ گیا۔

"تم کس درجے میں پڑھتے ہو؟" میں منہ دھو کر دالان میں رکھی کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ پھوپھو پوچھ بیٹھیں۔

"جی ایم۔اے کررہا ہوں"

"کالج بند ہے؟" میں سمجھ گیا وہ یونیورسٹی کو کالج کہہ رہی تھیں اور ان کا اصل اشارہ دوسرا تھا۔

"جی ایک ٹیچر ختم ہوگئے تو ایک دن بند ہوگئی اور آج اتوار ہی تھا۔کل چلے جانا ہے۔"

اب جھوٹ بولنے اور ان کو سیدھا جواب دینے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا۔

"ارے اب آئے ہو تو ایک دو دن اور رہو۔ اتنا جلدی جانا کیا؟ ان کے لہجے سے ان کا

جھوٹ پکا پڑ رہا تھا۔

''جی نہیں۔کل تو جانا ضروری ہے۔'' اچانک میری نگاہ بھابھی کی طرف اٹھی۔وہ بس ایک ٹک مجھے دیکھے جا رہی تھیں۔مگر میں کیا کر سکتا تھا؟

موسم ویسے کا ویسا ہی گھرا گھرا اور بند بند رہا، بارش نہیں ہوئی اور رات آ گئی۔

مغرب بعد کچھ لوگ آ گئے، بات چیت کا سلسلہ رہا، پھر وہ گئے تو عورتیں آ گئیں اور پھوپھو کی منڈلی جمی مگر پھر پتہ نہیں کیا ہوا کہ عورتیں جلد ہی اٹھ گئیں اور پھوپھو پھر دالان میں بچھے کھٹولے پر آ کر بیٹھ گئیں، ادھر باورچی خانے میں بھابھی، اور دونوں کے آمنے سامنے میں.....میں ان دونوں کے بیچ سینڈوچ بنا رہا اور صورتِ حال کے اٹ پٹے پن پر اندر ہی اندر جھلاتا رہا۔ بھابھی بات تو کرتی رہیں مگر ایسی باتیں جنہیں سن کر اپنی تکا بوٹی کرنے کو جی چاہتا مثلاً یہ کہ چچا کی صحت کیسی رہتی ہے؟ بہنوں کی منسوب طے ہوئی یا نہیں؟ کبھی چچا چچی کو لے کر آؤ، تمہارا چھوٹا والا بھائی کیا کر رہا ہے؟ بھابھی جب چپ ہوتیں تو پھوپھو شروع ہو جاتیں: شمس الدین چچا کا کیا حال ہے؟ امتل خالا کے لڑکے کیا کر رہے ہیں؟ تمہارے باپ کی داڑھی ابھی کالی ہے یا سفید ہو گئی؟ تمہاری اماں کا دانت بچا ہوا ہے یا ٹوٹ گیا؟

میں جھیلتا رہا اور گھڑی دیکھتا رہا خدا خدا کر کے نو ۹/ بجا کھانا لگا آج کھانے میں خاص اہتمام تھا..... پلاؤ مرغ، مچھلی، بھینس کا گاڑھا دودھ۔

''آپ بھی آ جائیں۔'' میں نے پھوپھو سے تکلفاً کہا۔

''نہیں۔ہم تو نماز کے بعد کھائیں گے۔'' بڑا سپاٹ سا جواب انہوں نے دیا اور نماز پڑھنے کے لئے اٹھ گئیں۔

''کیا یہ آپ کے ساتھ کبھی کھانا کھاتی ہیں؟'' جب وہ اپنے کمرے میں چلی گئیں تو میں نے آہستہ سے پوچھا۔

بھابھی نے انکار میں گردن ہلائی، ہونٹوں پر انگلی رکھ کر چپ رہنے کا اشارہ کیا اور بہت ہی آہستہ سے بولیں: ''کان بہت تیز ہے''

پھوپھو نماز سے فارغ ہو گئیں تو پھر کل ہی کی طرح بھابھی نے پانی رکھا دستر خوان بچھایا، کھانا لے جا کر سجایا اور پنکھا جھلنے بیٹھ گئیں۔

میں بور ہو کر اوپر چلا آیا.....اب ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔

موسم پر خنکی کا اثر اب کافی محسوس ہونے لگا تھا۔ تین دنوں سے لگاتار ابر آلود موسم اور کبھی تیز کبھی مدہم بارش نے شاید ہوا کی کیفیت ہی بدل دی تھی۔ میں نے پاٹے کی چھوٹی کھڑکی سے باہر دیکھا، دور دور تک منظر دھند میں کھویا ہوا تھا اور ٹھنڈی ہوا سارے میں تیرتی پھر رہی تھی ندی کی آواز بتا رہی تھی کہ اس کا ابال زیادہ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو کم بھی نہیں ہوا تھا۔ بادلوں کی پرت پرت میں چھپا وسطِ ماہ کا چاند باہر چاروں طرف پھیلے کھیتوں اور کھلیانوں پر اپنی چاندنی پوری طرح تو نہیں بکھیر پا رہا تھا پھر بھی ہلکی مدہم روشنی چاندی کے برادے کی طرح جگہ جگہ بکھری پڑی تھی اور راستے سنسان تھے اور لوگ اپنے گھروں اور جھونپڑوں میں دبکے پڑے تھے، پتہ نہیں پرسکون تھے یا نہیں .....میں تو نہیں تھا.....میرے من میں ایک عجب سی بے کلی تیر رہی تھی اور میرا سر بوجھل ہو رہا تھا۔

میں نے ان ڈیڑھ دنوں میں ایک پوری زندگی جی لی تھی۔

"پیاسی چڑیا اور شکاری"۔ ایک خواہ مخواہ کا جملہ ذہن میں گونجا پھر ندی کے بہاؤ میں رل مل گیا.....میں اب بستر پر لیٹ چکا تھا۔

کل کی پوری رات اور آج کا دن لگاتار جاگتے گزرا تھا.....نیند میری پلکوں کے تٹ کی طرف اپنے پورے طوفانی سرجوش کے ساتھ دوڑی چلی آ رہی تھی۔

میں سونا نہیں چاہ رہا تھا۔ میں جاگنا چاہتا تھا۔ میں سوچنا چاہتا تھا کہ اس پوری کتھا یاترا میں بحیثیت کردار میں کون سا رول ادا کر سکتا ہوں.....مگر اس رات اپنے آپ پر سے شاید میرا اختیار اٹھ چکا تھا.....میں بار بار تکیے پر سر جھٹکتا اور سوچتا.....میرے ہاتھ اور ان کے گال.....پھر اونگھ جاتا .....پھر چونکتا اور سوچتا.....ان کی پازیب اور ان کا پیر.....پر آنکھیں بند ہونے لگتیں۔

پھر آواز آتی....."کالج بند ہے کیا؟"

"نہیں نہیں۔ کل صبح سویرے چلے جانا ہے.....اب اتنی بے غیرتی بھی صحیح نہیں۔" میرا مندہوتا ذہن مجھے تنبیہ کرتا۔

پھر پتہ نہیں کس وقت نیند آ گئی۔

اس کے بعد آگے کا جو معاملہ ہے وہ بڑا عجیب سا ہے۔

پتہ نہیں رات کا کون سا سمئے تھا، پتہ نہیں بارش ہو رہی تھی یا رک گئی، پتہ نہیں چاند

بادلوں کا سینہ چیر کر باہر آ سکا تھا یا چاروں طرف اندھیرا ہی سر مار رہا تھا، پتہ نہیں نعیم کو اس کی عذرا ملی یا نہیں، پتہ نہیں گوتم نیلمبر دوبارہ شیو پوری جا سکا یا نہیں، پتہ نہیں تبریز اور نعیم جس بھیڑ میں گم ہوئے اس میں سے انہیں نکلنے اور کسی سمت رخ کرنے کا موقع ملا یا نہیں، پتہ نہیں صفدر زندہ بچا یا مر گیا۔

پتہ نہیں میں جاگ رہا تھا یا سو رہا تھا۔

مجھے کچھ نہیں معلوم تھا..... مجھے کسی بات کا علم نہیں تھا..... کسی طرح کا احساس نہیں تھا.....

میں بے خبری کی بے حد اندھی اور گہری کھائی میں گرتا ہوا یا ترتی تھا اور میرے چاروں طرف دھند برا جتی تھی..... آگے دھند پیچھے دھند دائیں دھند بائیں دھند، میں پورم پور دھند میں اٹا ہوا تھا بلکہ شاید خود بھی دھند میں گھرا ایک منظر تھا اور دھند میرا نظارہ تھی اور نزدیک و دور کہیں کچھ بھی نہیں تھا۔

شُنئہ؟ نہیں شُنئہ نہیں..... شاید خلا، شاید بے چیزیت..... ایک گہرا انت گڑھا..... خالی پن..... جس کے کسی طرف کچھ نہیں..... کچھ بھی نہیں!

''پھر.....''

پھر'' کچھ نہیں'' میں سے.....''

'' ہے'' کے گمان کی پرچھائیں کا ایک ننھا سا.....''

بہت مہین نب کے ایک مدہم سے نقطے کی طرح..... ایک ستارہ چمکا..... بے خبری کی بے حد اندھی اور گہری کھائی میں وہ ننھا سا ستارہ بڑی آہستگی اور سبک روی کے ساتھ اترا..... پھر پل کے شاید ہزارویں حصے میں پورا نہیں بہت ذرا سا جھمکا چمکا..... اور پھر وہی بے خبری، وہی دھند، وہی اندھی گہری کھائی..... مگر یہ..... خبر کے دامن کی ہوا پائی ہوئی بے خبری، بہت دیر تک اپنا آپ سنبھال کر نہ رکھ سکی..... اب کے بہت مہین نب کا وہ مدہم سا نقطہ پورا ستارہ بن کر چمکا۔

میرے خالی پن کے تانت میں جیسے کوئی سوئی ہلکے سے چبھی مجھے لگا اندر اندر کچھ کنمناہٹ سی ہو رہی ہے..... کچھ بہت مدہم سا..... آہستہ آہستہ اپنے ہونے کا ذرا ذرا سا احساس دلاتا ہوا..... یہ ستارہ جگنو بن گیا..... بار بار جلنے بجھنے لگا..... پھر ایک جگنو سے دو جگنو..... پھر تین..... پھر چار..... پھر اندر ہی اندر ڈھیر سارے جگنو ہواؤں میں اڑتے نظر آئے..... پھر یہ سارے جگنو ایک جگہ جمع ہو کر چاند بن گئے..... پھر ایسا لگا جیسے سامنے چاند ہے..... پورا کا پورا چودھویں رات کا چاند!

مجھے یاد آیا: سونے سے پہلے میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا تھا وسطِ ماہ کا چاند بادلوں کی

پرت پرت میں چھپا بیٹھا تھا، شاید چاند بادل کی قید سے رہائی پا گیا۔
یہ سوچ کر اچھا لگا کہ چاند کھڑکی کے راستے میرے بستر تک چلا آیا۔
میں نے نیند سے بوجھل پلکیں ذرا سی کھولیں پھر آنکھیں آپ ہی آپ مند گئیں، ایک رات کی پوری جاگی آنکھیں اب میرے کہنے میں نہیں تھیں اور خود میں بھی تو سونا ہی چاہتا تھا یہ تو چاند کمرے میں چلا آیا..... مگر چاند کی چاندنی میں گرمی کہاں ہوتی ہے؟ اچانک احساس ہوا کہ چاند مجھے چھو رہا ہے۔

''چاند؟'' مجھے یاد آیا ہے میں نے پوچھا تھا

تس پر چاند ہنسا تھا۔ کچھ بولا نہیں تھا۔

چاند کی ہنسی میرے ماتھے اور گال پر جگہ جگہ بکھری..... میری آنکھ کھلی، پھر بند ہوگئی، پھر کھلی پھر لگا پلکیں آپ ہی آپ بند ہوتی جا رہی ہیں..... نیند کی دھند شاید ابھی چھٹی نہیں تھی..... میں نے دھند میں گھر اان کا دھندلا چہرہ دیکھا..... چاند..... پرت پرت بادلوں میں چھپا..... یہ ..... ان کا ہاتھ میرے گال پر تھا یا میرے ماتھے پر تھا..... چاند..... ملکہ وکٹوریہ کی تصویر والا چم چم چمکتا چاندی کا سکہ.....''۔

''بھابھی؟'' میری آواز غالباً نیند کے برفانی بوجھ تلے دبی تھی۔

''سو گئے؟'' ایک آواز..... مسافت طے کرتی، کہیں بہت دور سے آتی محسوس ہوئی، مجھے لگا وہ بہت تھکی ہوئی ہیں۔

نیند کی پری مجھے پھر اڑا کر کوہ قاف لے جا چکی تھی۔

''سو گئے؟'' ایسا لگا جیسے کوئی آواز لاکھوں میل کا فاصلہ طے کر کے مجھ تک پہنچنے کا بار بار تھکا تھکا جتن کر رہی ہو۔

''اوں ہوں ہوں اوں ہوں.....'' میں نے اس آواز پر توجہ دینے کی کوشش بھی کی تھی مگر کوہ قاف میں بے چہرہ و بے پیکر پریوں کا رقص اپنے عروج پر تھا۔

''کل مت جاؤ'' ۔ پھر ایک بہت ہلکی سی مدہم سرگوشی گونجی تھی۔

مجھے یاد نہیں ۔ میں نے کچھ جواب دیا یا نہیں..... پھر کچھ دیر بعد ایسا لگا جیسے ہزاروں میل دور سے مجھے کسی نے پکارا ہو:

"سیطے....."

میں نے جواب دینا چاہا مگر شاید پھر نیند کے سمندر میں ڈبکیاں کھانے لگا۔

"مجھے بہت چاہتے ہو؟"

"لگتا ہے بھابھی پوچھ رہی ہیں"۔ میں نے سمندر کی تہوں میں اور اندر ہی اندر اترتے ہوئے سوچا۔

"میرا ایک کام کردو گے؟"

"اتنی رات گئے؟"..... اتنا سوچا تھا..... ایسا کچھ یاد آتا ہے۔

"مجھے زہر لادو"

میں نے کچھ سوچنا چاہا تھا مگر اب سمندر کی آخری تہہ میں چپ چاپ پڑا تھا..... شاید اب میں ہاتھ پیر بھی نہیں ہلا پا رہا تھا۔

"تم بہت یاد آؤ گے"

میں نے سنا تھا..... ہاں یہی کہا تھا..... الفاظ بالکل ٹوٹ ٹوٹ کر مجھ تک پہنچ رہے تھے..... مگر میں سن رہا تھا۔

کوہِ قاف میں نیند کی پریاں رقص کر رہی تھیں..... اور چاروں طرف آوازوں کے پھول گر رہے تھے۔

پھر لگا کوئی مجھ پر جھک رہا ہے، پھر لگا میرے سینے پر کسی نے اپنا سر رکھ دیا..... پھر لگا..... پھر لگا....."

پھر اس کے بعد پتہ نہیں کیا ہوا؟

آگے کی تفصیلات بے معنی ہیں، میں صبح سویرے اس گھر سے روانہ ہو گیا تھا روانہ ہونے کے وقت میں نے دیکھا تھا: بھابھی دالان کے ایک کونے میں کھڑی تھیں، دالان کے دوسرے کونے میں ٹنگے پنجرے میں قید طوطا بڑی بے چینی سے پنجرے کے طول و عرض میں چکر لگا رہا تھا اور پھڑ پھڑا رہا تھا، وہ بار بار پنجرے کے لوہے پر اپنی چونچ مارتا، پنجرے سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا اور تھک جاتا تو پھر پنجرے کے طول و عرض میں چکر لگانے لگتا اور ٹیں ٹیں کرنے لگتا۔

گھر سے باہر گاؤں کی کچی سڑک پر کچھ دور چل کر بے ارادہ میری گردن پشت کی

طرف مڑ گئی۔ میری پشت پر مظفر بھیا کے مکان کے پائے کی کھڑکی پڑتی تھی۔ میری نگاہ بے ساختہ کھڑکی کی طرف گئی اور میں پل بھر کو ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔

بھابھی کھڑکی پر کھڑی تھیں۔

شروع جاڑے میں صبح سویرے کی بہت ہی بے ضرر دھوپ چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی پرندوں کا چہچہانا نہیں سنائی دے رہا تھا، شاید ان کے چہچہانے کا وقت گزر چکا تھا، لوگ باگ جاگ چکے تھے مگر فضا میں ابھی چاروں طرف ایک طرح کی کسل مندی تیر رہی تھی، شاید رات کا خمار ابھی اترا نہیں تھا، ندی دو دنوں کی طغیانی کے بعد آج آہستہ آہستہ یوں بہہ رہی تھی جیسے تھک گئی ہو۔ بھابھی کھڑکی پر کھڑی تھیں۔

بھابھی کھڑکی پر کھڑی تھیں، ان کی آنکھیں خشک تھیں، ہونٹ سلے ہوئے، بال بکھرے ہوئے اور بے ترتیب تھے۔

بھابھی کھڑکی پر کھڑی تھیں اور مجھے دیکھ رہی تھیں۔

میری ان کی نگاہیں ملیں تب بھی ان میں کوئی حرکت نہیں ہوئی انہوں نے کوئی اشارہ نہیں کیا، وہ بس ایک ٹک مجھے دیکھے جا رہی تھیں۔

ان تین دنوں میں پہلی بار میری آنکھیں بھیگ گئیں، پہلی بار اندر اندر درد نے ابال پر آئی ندی کے پورے سر جوش کے ساتھ سر اٹھایا اور میرے پورے وجود کو روند گیا پہلی بار درد تیز دھار دار ہتھیار کی طرح مجھے یوں کاٹنے لگا جیسے سوکھی گھاس درانتی سے کاٹی جاتی ہے، پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ.....''

اب اس سے آگے بیان بے معنی ہو جاتا ہے۔

صرف سُر باقی رہ جاتا ہے اور ابد کی انتہاؤں تک ندی کی لہروں کی طرح ترل ترل بہتا چلا جاتا ہے......!!

☆☆☆

مردہ راڈار

گئی رات تک اس کے رونے اور کراہنے کی دل چیرتی آواز سنائی دیتی رہی۔
وہ جاڑے کی ایک انتہائی سرد اور قدرے ابر آلود رات تھی، سورج دن بھر بادلوں کے نرغے میں گھرا رہا تھا، ہڈیوں کو چیرتی ہوا، گاہے گاہے رم جھم بارش، زندگی جیسے ٹھہری گئی تھی.....
ایسے ہی موسم میں مغرب کی اذان سے کچھ پہلے یا کچھ بعد، وہ پانی کے اس جماؤ کا حصہ بنا تھا۔
پانی کا وہ جماؤ شہر کے ایک پوش حصے میں تھا۔ بڑے بڑے خوبصورت عالی شان مکانات، مکانوں کے اردگرد چہار دیواری، زیادہ مکانوں کے اندر گیرج اور زیادہ گیرجوں میں گاڑیاں، اور چہار دیواریوں کے اندر، چاروں طرف پھول پودوں کا انبار، عہد قدیم سے ہم مہذب ترین اقوام میں گنے جاتے رہے ہیں، کالونی والوں کو تقریباً ساری سہولتیں میسر تھیں.....
غلاظت کی نکاسی کے انتظام کے سوا.....اس پوش کالونی میں بھی گندہ پانی جمع ہوہی جاتا تھا۔
بات پر بات نکلتی ہے اور بات پر بات یاد آتی ہے، اسی کے حوالے سے شرفو چچا اور منے بھائی نے خاصی دھواں دھار بحث کی تھی۔ شرفو چچا کا کہنا تھا کہ "اب اس کالونی میں زمین کی قیمت ڈیڑھ لاکھ روپئے کٹھ سے کم نہیں ہونی چاہئے۔" منے بھائی نے ابھی مکان نہیں بنایا تھا اور اسی کالونی میں زمین کے متلاشی تھے، وہ کہنے لگے ہاؤسنگ سسٹم صحیح نہیں ہے، اتنی قیمت کون دے گا؟
شرفو چچا دلیل لائے کسی گھر کا پانی کسی گھر میں تو نہیں سڑتا....."بس ایسی پوش کالونی میں بھی پانی کا جماؤ موجود تھا۔ اور گئی رات تک اس کے کراہنے اور رونے کی آواز دل چیرتی رہی۔
طاہر علی گئی رات تک بولایا بولا پھرا، اس کے گھر کے بالکل بغل میں تھا..... پانی کا وہ جماؤ.....اس نے کھڑکیاں اور دروازے سب بند کر رکھے تھے۔ مگر دروازوں کے شگافوں اور

جھریوں کا وہ کیا کرتا؟ بار بار اس کی خواہش ہوتی کہ وہ دروازہ کھول کر باہر نکلے اور پچھواڑے سے ابھرتی اس دکھ بھری آواز کا درد آشنا بنے، مگر اس دن اتفاق سے گھر میں، مرد کی صورت میں وہ تنہا تھا اور ان دنوں ڈاکوؤں اور لٹیروں کے خوف سے گھروں کے دروازے، سرِ شام ہی بند ہو جاتے تھے، دراصل یہ غنڈے اور اچکے بیسیوں گھروں میں گھس چکے تھے اور بہت خوف و ہراس پھیلا چکے تھے اور ان کی گرفت کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ حالاں کہ ایسا نہیں کہ اس علاقے یا شہر سے پولس چوکیاں ختم کر دی گئیں تھیں مگر "بارا کانڈ" میں سارا انتظامیہ اس طرح الجھ کر رہ گیا تھا کہ اسے شہر کی طرف دیکھنے کی فرصت ہی نہیں مل رہی تھی۔ لہٰذا کوئی بھی ذی روح کسی نالے یا گندے پانی یا گندگی کے جماؤ میں گھر جاتا اور گئی رات تک کراہنے اور رونے کی دل چیرتی آواز سنائی دیتی رہتی۔

اس دن بھی، مغرب کے آس پاس ہی سے پھٹی پھٹی، چیخنے اور چلانے کی آواز دل چیرتی اور رونگٹے کھڑی کرتی رہی، طاہر علی ہڑبڑا کر باہر نکلا اور عقب کی طرف دوڑا..... منظر دیکھ کر پہلے تو ہنسی آئی پھر فارسی کا ایک محاورہ یاد آیا اور پھر آہستہ آہستہ افسوس کی ایک کانٹے دار لہر نے اس کے چاروں طرف اپنا جال کسنا شروع کیا مگر اسی وقت باس کا فون آ گیا..... بیٹے نے آ کر بتایا تو وہ بلا سوچے سمجھے گھر کی طرف دوڑا اس کا باس نوجوان تھا اور بیک ورڈ بھی اور کچھ کرنے کا خواہش مند بھی اس لئے قانون اور ضابطے کی زبان بہت بولتا تھا۔ اور طاہر علی جیسے افراد جو مزاجاً لڑائی جھگڑے اور زور زبردستی سے اپنا کام نکلوانے والے نہیں ہوتے، ان کے لئے قانون کا ڈنڈا ہمیشہ ''تنبیہ الغافلین'' بنا رہتا ہے طاہر علی حتی الامکان اس کی کوشش کرتا تھا کہ اس کا شمار غافلوں میں نہ ہو، وہ باس کی آواز پر کیسے نہ دوڑتا؟ باس سے فون پر گفتگو ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ کچھ لوگ ملنے آ گئے، آنے والے طاہر علی کے بے تکلف دوستوں یا پسندیدہ افراد میں سے نہیں تھے۔ مگر ان کی آمد سوشل اسٹیٹس کا درجہ ضرور رکھتی تھی......اب ایسے میں وہ اس گرنے والے قطمیر صفت کی طرف کیا متوجہ ہوتا!

وہ ڈرائنگ روم میں ان لوگوں سے باتیں کرتا رہا اور اس کے رونے اور کراہنے کی آواز آتی رہی۔

پانی کا وہ جماؤ ایک ایسے خطۂ زمین پر تھا جس کے چاروں طرف چہار دیواری تو تھی مگر مکان یا پلاننگ نام کی کوئی چیز نہیں تھی اور چوں کہ ابھی اس پر مکان تعمیر نہیں ہوا اور انتظامیہ نے

بھی کالونی سے غلاظت کا کوئی انتظام نہیں کیا۔ اس لئے اردگرد والوں نے اپنی اپنی نالیوں کا رخ اسی خطۂ زمین کی طرف کردیا تھا اور اس پر طرفہ تماشا یہ کہ برسات کا پانی بھی اردگرد کی ساری ڈھلانوں سے ہوتا ہوا یہاں تک آجاتا، بات صرف یہیں تک رہتی تو شاید مسئلہ اتنا شدید نہ ہوتا۔ مگر ہر گھر والے اپنا کوڑا کرکٹ بھی تو اسی پانی میں پھینکتے پس پانی آتا بھی ہے، جمتا بھی ہے، سڑتا بھی ہے اور دلدل بھی بناتا ہے۔

طاہر علی کو بات کرتے اچانک یاد آیا کہ وہ ''قطمیر زادہ بھی تو دلدل ہی میں پھنس گیا ہے، اور اسے پھر سنائی دی..... اس کے رونے اور کرہنے کی آواز..... دل چیرنے کی حد تک دل دوز ..... پھر ایک مرتبہ خواہش ہوئی کہ وہ باہر جائے اور اس کو اس مصیبت سے نجات دلائے..... پچھلی مرتبہ بھی تو.....''

پھر خیال کی رو بھٹک گئی..... اس شہر میں وہ ابھی نووارد ہی تھا، ملازمت کے سلسلے میں وہ یہاں آیا اور اسی واسطے سے یہاں کی وہائٹ کلر سوسائٹی کا حصہ بنا پھر اس کے انداز گفتگو نے اسے انٹلکچوئل صفوں تک پہنچایا،

مسائل پر اس کا جو منفرد نقطۂ نظر رہتا تھا۔ اور اس منفرد نقطۂ نظر کو وہ جس مدلل انداز میں پیش کرتا تھا، اس کے سبھی قائل تھے مسئلہ زیر بحث یہ تھا کہ..... ''ایک صالح معاشرے میں سماجی انصاف کی قدر کو عمل میں کس طرح تبدیل کیا جاسکتا ہے؟''

طاہر علی جانتا تھا کہ ایک دن کیا اگر ایک نشست میں بھی بحث کے مجموعی منظر نامے پر کوئی دوسرا غالب آگیا تو پھر طاہر علی کو اپنا انٹلکچوئل والا امیج بچانا دشوار ہو جائے گا..... اس نے ہوا میں ہاتھ لہرایا۔ اور کہنا شروع کیا۔

''صالح معاشرہ ہمیشہ صالح اقدار کی بنیاد پر وجود میں آتا ہے اور صالح اقدار کے فروغ کا مطلب ہے۔''

''سماجی انصاف کا حصول، اور سماجی انصاف کا کلیدی نکتہ ہے زندہ رہو اور زندہ رہنے دو''!

طاہر علی بولتے بولتے اچانک رک گیا، انیل کمار سب جج بیچ ہی میں پوچھ بیٹھے ''یہ کتے کا پلا کہاں رو رہا ہے؟''

طاہر علی کو غصہ تو بہت آیا مگر اس نے ضبط کیا انیل کمار کی یہ کوئی نئی حرکت نہیں تھی، جب

بھی جج صاحب دیکھتے کہ فریق ثانی مجلس پر حاوی ہو رہا ہے تو وہ ایسی ہی غیر متعلق باتیں اٹھا کر بات کا رخ موڑ دیتے۔ مگر اس دن طاہر علی نے بھی طے کر لیا تھا کہ چاہے جو ہو، انیل کمار کو تو کامیاب نہیں ہونے دینا ہے''.....اس لئے وہ صرف اتنا بولا'' کتے تو بھونکتے ہی رہتے ہیں'' اور پھر اپنی کہی بات کا سرا بعد کی بات سے جوڑنے لگا...'' دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ...''

دلدل میں جو بھی پھنستا ہے وہ رونے کراہنے کے سوا کیا کر سکتا ہے؟

بحث ہمیشہ کی طرح بے نتیجہ رہی، کتے کے پلے کے رونے کراہنے کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا.....حالاں کہ پچھلی مرتبہ دو تین بجے دن میں اچانک پچھواڑے سے کئی بکریوں کے بے تابانہ ممیانے کی آواز سن کر جب وہ دوڑا تھا تو صورت حال اس سے بھی زیادہ بھیانک تھی۔ ایک بکری نہ جانے کس طرح اس ''چہبچہ'' (گندے پانی کا جماؤ) میں گر گئی تھی۔

بکریاں تو پانی سے ایسے ہی بھاگتی ہیں اور وہاں یہ مصیبت آن پڑی کہ ایک بکری گھورے پر دانے کی تلاش میں گئی اور پھسل کر پانی میں گر پڑی، ظاہر ہے کہ اس کا چیخنا بالکل فطری تھا، مگر اس کی چیخ سن کر جہاں کئی بکریاں دوڑیں وہیں کتوں کو بھی سن گن مل گئی۔ بکریاں......محبت کی ماری.....آواز پر.....دوڑ تو گئیں مگر اپنی فطرت سے مجبور، پانی سے سگ گزیدہ جس طرح ڈرے، کنارے پر پہنچ کر ٹھٹکیں بھی ہمت ہار گئیں کنارے پر کھڑی میں میں کرتی رہیں اس کو بلاتی رہیں مگر پانی میں کیسے اترتیں؟ وہ ایک آفت زدہ بیوقوف بکری......وہ تو اپنی بے وقوفی سے پانی میں گھر گئی تھی!

مگر کتوں کی تو بن آئی، چار پانچ کتے پانی میں کود پڑے اور چھپڑ چھپڑ کرتے ہوئے اس کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ سبھی حیرت زدہ رہ گئے۔ ان جانوروں میں جنگی حکمت عملی کا اتنا بالغ شعور کہاں سے آ گیا؟ کیا انہوں نے آدمیوں سے سیکھا؟ یا آدمیوں نے ان سے سیکھا؟ صورت حال یہ تھی کہ بکری کسی طرح اس گھیرے کو توڑ دینا چاہ رہی تھی۔ اور کتے غالباً بکری کی یہ خواہش محسوس کر چکے تھے۔۔۔۔وہ غالباً یہ بھی سمجھ چکے تھے کہ بکری اپنا دفاع صرف چار پیروں سے کر سکتی ہے، شاید اسی لئے کتوں کا پہلا اور مسلسل حملہ بکری کے پیروں پر تھا۔ کتے مطمئن ہوں گے کہ اگر بکری کا پیر بیکار ہو گیا تو پھر یہ خود ڈھے جائے گی اور تب اس کے جسم کا کوئی بھی حصہ من مانے ڈھنگ سے نوچا اور کھایا جا سکتا ہے۔

ادھر پانی میں کھڑی بکری بھی شاید اس سازش کو سمجھ چکی تھی اور غالباً اسی لئے وہ پورے وجود سے چھٹپٹا رہی تھی۔ اور چیخ رہی تھی۔ اور کنارے پر جو بکریاں تھیں ان کا عالم یہ تھا کہ وہ چیختے ہوئے چہار دیواری کے چاروں طرف دوڑتیں، ان تین چار بکریوں میں ایک سب سے زیادہ بے چین تھی، وہ بے تابانہ بار بار دیوار پر چڑھ جاتی دیوار کے حدود میں جمع پانی کی طرف جھکتی اور پھر جھک کر بے اختیارانہ پیچھے ہٹ جاتی جیسے سہم گئی ہو...... مگر اس کی چیخ کسی طرح رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

کسی نے بتایا کہ گرنے والی اس کی بچی ہے۔

ممتا کے درد اور جان کے عشق کی ایسی کشمکش شاذ و نادر ہی نظر آتی ہے۔ شور وغل سن کر اردگرد کے لوگ گھروں سے نکل آئے، مرزا رجب علی، سرور کمال، ورشہوار علی خان، برکت اللہ انصاری..... نزدیک آتے ہی ورشہوار علی خان کے تو ہوش اڑ گئے۔ ارے یہ تو میری بکری ہے، میں نے اسے قربانی کی نیت سے پالا ہے۔ تس پر سبھی تشویش میں مبتلا ہوئے اول تو قربانی کا جانور، جس کے سلسلے میں واقعہ مشہور ہے کہ ایک بڑے بزرگ برہمن نے جانور لے جاتے ہوئے قصاب کو ڈانٹ دیا تھا۔ شرم نہیں آتی؟ قربانی کے جانور کو نالی کا گندا پانی پلاتے ہو۔؟ اور اس پر ورشہوار علی خان کی بکری..... سبزی کے پتوں کی جگہ سبزی کھانے والی..... تنومند، خوب صورت، دیکھ کر ہی لالچ آ جائے!

بڑوں کی تشویش بچوں تک پہنچی اور بچے جوش میں کود پڑے مگر تھوڑا ہی آگے بڑھنے پر احساس ہوا کہ وہ پورا خطۂ زمین دلدل بن چکا تھا۔ آگے بڑھتا ہوا ہر قدم زمین میں دھنستا اور پیچھے لوٹنا مشکل ہوتا جاتا، لڑکے کسی طرح باہر نکل آئے مگر کتوں کا حملہ جاری رہا اور بکریاں بے تھاہ ہو کر چیختی رہیں منظر بہت تکلیف دہ تھا لوگوں نے پھر لڑکوں کی ہمت بڑھائی مگر لڑکے بالکل تھونس چکے تھے بہت ضد کرنے پر ایک لڑکا جھلا کر بولا۔ ارے تو جان بچانے کے لئے تو جان دینا ہوگا۔ مگر اسی وقت ورشہوار علی خان نے پچاس روپئے انعام کا اعلان کر دیا۔ انعام کے اعلان پر لڑکے گڑبڑا گئے کتوں کا حملہ بکری پر جاری تھا۔ پھر لڑکوں نے طریقہ کار بدل دیا اب کے وہ کہیں سے لمبے لمبے بانس لے آئے اور کنارے ہی سے کتوں کو دھمکانا شروع کیا اور ایک نے تو کمال ہی کر دیا، گھر سے غلیل لے آیا اور غلیل سے جو نشانہ لینا شروع کیا تو کتوں کے پاس بھاگنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔

مگر اب کے تو صورتِ حال ہی بدلی ہوئی تھی۔ شدید سرد اور قدرے ابر آلود موسم، رات کا وقت، بجلی حسب دستور غائب، چاند کی بیسویں یا اکیسویں رات اس لئے چاندنی کی بھی آس نہیں، طاہر علی کیا کر سکتا تھا۔؟ لڑکوں کو پانی چڑھانے کی کوشش کی۔'' پچھلی مرتبہ بھی تم لوگوں نے ایک جان بچائی تھی۔ ذرا پھر ہمت کرلو۔''

مگر لڑکے صاف جواب دے گئے پچھلی مرتبہ کی بات دوسری تھی بکری کا معاملہ تھا اور دن کا وقت تھا۔''

'' وہ بھی قربانی کی بکری تھی۔'' دوسرے نوجوان نے ایک اور نکتہ اٹھایا'' پھر خان صاحب نے ۵۰ روپئے جو بطور انعام دیئے وہ الگ!'' تیسرے عزیز نے بھی پہلو پیدا کیا۔

طاہر علی کا جی چاہا کہ وہ بھی انعام کا اعلان کردے..... مگر ٹیچر کلاس اتنی فضول خرچی کہاں سے کرے۔

'' بیٹا جان تو جان ہے'' ایک بزرگ نے سمجھایا۔

'' چچا کتے اور بکری کے درمیان تو فرق کرنا ہوگا۔'' ایک عزیز نے ترکی بہ ترکی جواب دیا، سبھی لاجواب سے ہوگئے اور اس کے رونے کی آواز دل چیرتی رہی کہ اس بیچ بیٹے نے آکر بتایا ......'' باس کا فون ہے۔''

کافی رات گئے ڈرائنگ روم خالی ہوا طاہر علی گھر میں آیا، کتے کا پلا دلدل میں گھرا چیختا رہا اسے پھر وہ منظر یاد آیا۔ روشنی تو غائب تھی، کئی ٹارچوں کی روشنی میں دیکھا ہوا بس ایک منظر: منظر انگنت راتوں تک جلتا اور بجھتا رہا، کتے کا پلا دلدل میں پھنسا نکلنے کے لئے ہاتھ پیر مارتا رہا، اور اس سے کچھ فاصلے پر دو تین کتے بڑی بے چینی سے اچھلتے کودتے اور چیختے رہے کتے اور انسان تو بڑے پرانے دوست ہیں اس لئے دونوں ہی پر ایک دوسرے کے چیخنے چلانے کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ مگر وہ چیخیں تو عجیب تھیں، اسے لگا ان چیخوں میں غصہ، افسوس اور خوف تینوں شامل ہیں، ایک تو بالکل پتلی پتلی آواز میں مسلسل چیخے جارہا تھا۔ اور ادھر کتے کا پلا بار بار نکلنے کی کوشش کرتا اور ہر بار چھپاک سے پانی میں گر جاتا طاہر علی وہاں پر آدھا گھنٹہ کھڑا رہا اور اتنی دیر تک یہ بے معنی عمل لگاتار جاری رہا۔ کتے چیختے رہے کتے کا پلا ڈوبتا رہا..... اسی بیچ باس کا فون آگیا پھر لوگ آگئے، پھر بحث چھڑ گئی.....'' ایک صالح معاشرے میں سماجی انصاف کا کلیدی نکتہ.....''

گئی رات تک وہی منظر جھما کے کرتا رہا: دلدل میں گھرا روتا چیختا بے چارہ پلا.....اور اس سے بھی زیادہ بھیانک آواز میں شور کرتے ہوئے کتے ..... کتے اپنی زبان میں کیا کہہ رہے تھے، طاہر علی یہ تو سمجھ نہ سکا مگر ایک بات جو سمجھ میں آچکی تھی وہ بار بار یاد آتی رہی.....کتے اور بکری کے درمیان تو فرق کرنا ہی ہوگا.....''اور پھر رات گئے تک جو بحث جاری رہی.....

سماجی انصاف کی قدر کو عمل میں کیسے تبدیل کیا جا سکتا ہے؟

طاہر علی کے اندر درد افسوس اور پشیمانی کا ایک جلتا بھبھکتا سورج طلوع ہوا اور اسے لگا وہ دھڑ دھڑ جل رہا ہے۔

اسی عالم میں نہ جانے کب نیند آ گئی، پھر شاید بیچ رات میں طاہر علی کی نیند ٹوٹی تو فوراً ہی اس کا خیال اس بے چارے پلے کی طرف گیا، اس نے آہٹ پر کان لگایا۔ کراہ جاری تھی..... تھکان سے چور وجود کی آخری کراہ......چاروں طرف سناٹا تھا۔ اور اس سناٹے میں صرف اس کی انتہائی درد اور خوف میں ڈوبی تھکی تھکی بہت مدھم کراہ ابھر رہی تھی.....طاہر علی نے کھڑکی کھول کر دیکھا، چہار دیواری کے اندر پانی کی سطح بالکل ٹھہری ہوئی تھی، کسی حصے پر بھی وہ دکھائی نہیں دے رہا تھا، شاید گردن تک دلدل میں دھنس چکا تھا۔

اس کے باقی ہم قوم شاید گھنی سرد اور سیاہ رات سے ہار گئے تھے۔

بس رہ رہ کر مغربی کنارے پر پانی میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوتا محسوس ہوتا، اور ایک انتہائی کمزور آواز کا گمان گزرتا.....اونہہ.....ہ.....ہ.....اونہہ.....ہ.....ہ.....''

یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ دلدل میں ڈوبتا یہ گریہ کتے کے پلے کا ہے یا انسان کے بچے کا۔

ایک بے چین تصور، ناامیدی کے بھنور میں ہچکولے کھاتی کسی کراہ کا بے پیکر ہیولا سا ابھرتا محسوس ہوتا اور طاہر علی اندازے سے تعلق کرتا.....وہاں..... ہاں ہاں.....وہیں سے آواز ابھرتی ہوگی پھر اس نے ٹارچ جلا کر صحیح جگہ کا احساس کرنا چاہا تو نتیجہ تقریباً یکساں ہی رہا۔

ہر گھر کا دروازہ بند تھا۔ اور وہ چھوٹی سی ننھی سی جان پانی کے بگولوں میں تنہا جل رہی تھی۔!

گلیوں میں بھونکتے رہنے والے کتے کہیں نہیں تھے.....طاہر علی کو عجب سا احساس ہوا۔ کیا انہیں اس کی موت کا یقین ہو چکا تھا؟ یا وہ خود خاموش رہ کر مرنے والے کی موت آسان بنا رہے تھے۔؟

طاہر علی بستر پر نہیں سوالات اور اضطراب کی سیج پر تھا اور صحرا کی جلتی ریت پر پڑے مڑدانے کی طرح جل رہا تھا......وہ رات بھر جلتا رہا اور کتے کا پلا رات بھر پانی میں بھیگتا رہا، ابھرتا رہا ڈوبتا رہا چیختا رہا کراہتا رہا......پھر جیسے جیسے رات گزرتی گئی اس کی کراہ بھی کمزور پڑتی گئی، صرف کراہنے کا ہلکا ہلکا سا احساس باقی رہ گیا، عجب سی، انتہائی درد اور بے بسی میں گھری کراہ......''

طاہر علی کو دوبارہ نیند آنے تک وہ کراہ سنائی دیتی رہی......آہستہ آہستہ مدھم اور معدوم ہوتی ہوئی......وقت کے بھیانک صحرائی طوفان میں، بگولوں کے بھنور میں گھری، سیلاب کے تھپیڑوں کا نشانہ ہچکولے کھاتی ہوئی ڈوبتی ہوئی مرتی ہوئی......ایک بے بس وجود کا SOS!

صبح کو بچوں نے بتایا کہ کتے کا پلا ٹھنڈے پانی میں ڈبکیاں کھا کھا کر مر گیا۔

کسی کو اس کی موت کا افسوس نہیں تھا۔ صرف طاہر علی کو بہت دنوں تک سماجی انصاف کا کلیدی نکتہ یاد آتا رہا، اور کتے کے پلے کی چیخ سنائی دیتی رہی!!

☆☆☆

جلیبی کا رس

روشن بہاری کا غصہ اپنی آخری حد یں چھو رہا تھا اور اسی غصے میں وہ ستر اسی کی رفتار سے گاڑی دوڑائے لئے چلا جا رہا تھا۔ برسات کے موسم میں یہ رفتار خطرے کا سبب بن سکتی ہے۔ روشن یہ جانتا تھا مگر وہ کیا کرتا۔ گاڑی کیا وہ خود اپنے بس میں نہیں تھا اس کی نگاہیں سامنے کے شیشے پر جمی تھیں۔ مگر اس کا دماغ وہاں سے آٹھ نو کلو میٹر دور جمنا اپارٹمنٹ کے کوارٹر نمبر ۱۵۷ پر مرکوز تھا: وہ اتنی رات گئے آخر وہاں کیوں ہے؟ سالا ضرور جانتا ہوگا کہ میں اس وقت گھر پر نہیں ہوں.... حرامی!" روشن کے منھ سے گالی بے ساختہ پھسل پڑی ورنہ عام دنوں میں تو وہ سماج کا ایک مہذب فرد گنا جاتا تھا۔

"اررر ے..... رے..... رے..... سالا..... مرے گا کیا؟" اس نے جلدی سے بریک پر پیر کا پورا دباؤ ڈالا۔ گاڑی ایک چیخ کے ساتھ رک گئی

"ارے سالا..... دیکھ کر نہیں چلتا؟" روشن کا غصہ اپنے عروج پر تھا۔ اس نے گاڑی روک کر دروازہ کھولا اور دوڑ کر سڑک پار کرتے ہوئے دیہاتی کو کالر سے پکڑ لیا..... دیہاتی بیچارہ ہکا بکا رہا..... "بب..... بب..... " بابو ہم کا کیا؟"

" سالا پھٹیچر دیہاتی" روشن نے اسے دھکا دیتے ہوئے پھر گاڑی کا رخ کیا..... کالر پکڑتے پکڑتے اسے یاد آ گیا کہ گھر جلد پہنچنا زیادہ ضروری ہے۔

" اچھی خاصی گیدرنگ مس کرنی پڑی"۔ اس خیال نے روشن کے غصے کی آگ پر جیسے تیل چھڑک دیا..... شکشا منتری، پری وہن منتری، اسپیکر سب موجود تھے، وہاں ایرے غیرے کی تو گنجائش ہی نہیں تھی۔ شکشا منتری نے کیسا لپک کر اس سے ہاتھ ملایا تھا۔ کمشنر بھی وہیں پر کھڑا تھا۔ ہماری کمائی اور کیا ہے؟ کوئی ویتن ملتا ہے؟ بھتے کے نام پر بھی تو کچھ نہیں ملتا؟ میں ہوں کیا؟ بس

بھی اس سبھا میں کبھی اس سبھا میں کبھی اس اخبار میں فوٹو، چہرہ دکھانے کے علاوہ کیا کر پایا ہوں اب تک؟ مگر میں ہی کیا۔ شیلیش کمار، رگھوونش پرشاد، مرتنجے، رنجیت ترویدی، مہتاب عالم، سب [illegible] کو کیا مل گیا؟ وہ ابراہیم شاہ پوری..... وہ تو سات آٹھ برس سے لگا ہوا ہے۔ روز منورنجن بابو سے [illegible] لگاتا ہے، کبھی دوڑ کے پان لاتا ہے، کبھی ان کی گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے گاڑی کا دروازہ [illegible] کھڑا رہتا ہے۔ اس کو تو آج تک بیس سوتری کی ممبری نہیں مل پائی جس کے لئے تین سال سے لگا ہوا ہے۔ بتا رہا تھا کہ "یار آدمی ذرا سمجھ بوجھ والا ہو تو [illegible] میں مال بہت ہے"

روشن بہاری کا نہ گاڑی پر اختیار تھا نہ خیال پر، دونوں اپنی رفتار سے بھاگے جارہے تھے۔ بڑے شہروں میں فاصلہ کتنی بڑی مصیبت ہے، اس وقت اسے اس کا شدت سے احساس ہوا' جنگل کی طرح پھیلے اس شہر میں سلیقے کی جگہ، سلیقے کا مکان ملنا کتنا بڑا مسئلہ ہے اس شہر میں آنے کے بعد کتنے پاپڑ بیلنے پڑے تھے یہ تو اس کا دل ہی جانتا ہے، شروع شروع میں کیا سمجھ میں آتا، جہاں مکان مل گیا لے لیا مگر جب کئی مرتبہ کئی مہمان پرشوں نے عجیب سا منھ بنا کر پوچھا! "اچھا تم وہاں رہتے ہو؟" تو اسے عجیب سا لگا تھا۔ کیا وہاں رہنا کوئی پاپ ہے؟ یہ لوگ وہاں رہنے کی بات سن کر اس طرح منھ کیوں بناتے ہیں؟" پھر بہت بعد میں یہ عقل آئی کہ جس علاقے میں ایک بھی انجینئر ڈاکٹر، ایم پی کوئی بڑا بزنس مین نہ ہو اس علاقے میں رہنے کا کیا معنی ہے؟ اس سوال سے گھبرا کر اس نے "جمنا اپارٹمنٹ" میں ایک فلیٹ بک کرالیا۔ حالاں کہ یہ فلیٹ لینے کے لئے پہلے اسے اپنا آبائی گھر بیچنا پڑا اور اس سے بھی جب بات نہ بنی تو بیوی کے زیور کی نوبت آئی مگر جمنا اپارٹمنٹ میں فلیٹ تو مل گیا..... جمنا کے بالکل کنارے..... بالکل نیا فاؤنڈیشن..... حالاں کہ سڑک ابھی پوری پختہ نہیں ہوئی تھی اور الیکٹرک کا کام بھی مکمل نہیں ہوا تھا پھر بھی فلیٹ کا تام جھام دوسرے فلیٹس سے کم نہیں تھا۔ یہ اپارٹمنٹ کئی سیکٹروں میں منقسم تھا۔ ہر دو سیکٹر کے بیچ سڑک، اپارٹمنٹ کے چاروں طرف قدِ آدم دیوار اندر ہی پلے گراؤنڈ اور ایک چھوٹا سا پارک، گیٹ پر دربان جو ہر آنے جانے والے کا نام لکھا کرتا۔ اس کے ٹھیک سامنے کے فلیٹ میں ایشوری بابو، سکریٹریٹ میں چیف سکریٹری کے پوسٹ پر ہیں، ان کے بغل میں ستنام سنگھ، فیشن ٹکنولاجی کے بڑے انجینئر ہیں بڑا نام ہے ان کا۔ جس گھر میں خود محکمہ منتری دعوت کھانے آئیں اس کے بڑا ہونے میں کون شک کر سکتا ہے؟ اس کے ٹھیک نیچے امبشٹا صاحب چیف ایڈیٹر ہیں، سڑک کے دوسری طرف

سامنے یونیورسٹی کے رجسٹرار، ان کے بغل میں سیف الہدیٰ ایم ایل اے۔

"روشن بھائی۔ آپ نے تو ایسی جگہ فلیٹ لیا ہے کہ اب اس پرانت میں آپ کا کوئی کام نہیں رک سکتا۔" ایک دن جب شیلیش نے یہ اعتراف کیا تو اس کا سینہ فخر سے چار ہاتھ پھول گیا۔

اور اس نے کچھ غلط بھی تو نہیں کہا تھا۔ یہاں آنے کے بعد لوگوں نے اس سے اتنا کام لیا کہ بیوی کا جتنا زیور بکا تھا اس سے دوگنا روشن نے اسے بنوایا۔

"سالی"۔ بیوی کا خیال آتے ہی پھر اس کا چہرہ بگڑ گیا۔ میں نے کیا نہیں دیا اس کو، خوبصورت بچے، خوب صورت گھر، اونچی سوسائٹی، میکے سے جتنا لے آئی اس سے دوگنا زیور..... سالی اس پر بھی رنگ بدل گئی..... شروع میں ٹھیک ٹھاک تھی مگر وہ حرامی اسے برباد کر گیا، آج اچھی خاصی گیدرنگ بھی سالے نے مس کرادی۔

پارٹی اپنے شباب پر تھی۔ پارٹی دراصل منورنجن بابو کی گلوخلاصی کی خوشی میں تھی، اپوزیشن والوں نے ان کو ایک مقدمے میں پھنسا دیا تھا۔ سالے اپوزیشن والے تو کسی کو چین سے رہنے نہیں دیتے۔ جب خود ستا میں تھے تو کیا کم لوٹ مچائی۔ اب منورنجن بابو نے اندرا واکاس یوجنا میں اتنا کام بھی کرایا اور سالوں نے اسی میں ہیرا پھیری کے الزام میں ان کو پھنسا بھی دیا۔ سی بی آئی انکوائری بٹھوادی۔ مگر ہوا کیا؟ منورنجن بابو نے بھی کوئی کچی گولیاں تھوڑے ہی کھائی تھی کہ پانڈے جی کی طرح انکوائری میں کھنڈت ڈالتے۔ انہوں نے انکوائری کا سواگت کیا۔ ہم لوگوں نے جب اس پر اعتراض کیا تو ہنس کر کہنے لگے: "مورکھ ہیں آپ لوگ۔ انکوائری والے آسمان سے آئیں گے کیا"؟ اس وقت تو ہم لوگ اس کا مطلب نہیں سمجھے مگر اب سمجھ میں آ گیا۔ اب تو دودھ کا دودھ پانی کا پانی الگ ہو گیا۔ سی بی آئی والوں نے منورنجن بابو کو نردوش ثابت کر کے ان کی پرتشٹھا اور بڑھا دی۔ آج منورنجن بابو کتنا خوش تھے۔ آج ہی موقع تھا پارلیمنٹری بورڈ کی ممبر شپ کے لئے کہنے کا۔ الیکشن سر پر ہے، ٹکٹ بانٹنے کا کام تو یہی بورڈ کرے گا۔ اس میں تو ایسی آمدنی ہے کہ ہلدی لگے نہ پھٹکری رنگ آوے چوکھا۔ اوپر سے جو ایم ایل اے ہو جائے وہ احسان الگ مانے، بعد میں یہی سب تو کام آتا ہے۔ مگر اس سالی نے سب چوپٹ کر دیا۔ اور وہ کیا۔ میں خود کیا کوئی کم گدھا ہوں، مجھے کیا پڑی تھی دس بجے رات میں فون کرنے کی؟ مگر کیسے نہ کرتا؟ اس کو میری فکر نہ ہو بچے تو انتظار کرتے ہیں۔ "پپا ابھی تک نہیں آئے"۔ فون کیسے نہ کرتا۔ رات کا دس بج چکا تھا اور پارٹی ختم ہونے

کا نام نہیں لے رہی تھی۔ پارٹی بھی تو خاصی بڑی تھی۔ کیسے نہ ہوتی۔ جب ان کو جتنا جنار دھن لائن لگا لگا کر بدھائی دینے آنے لگی تو وہ جتنا کو کیسے نہ بلاتے۔ پھر سب منتری لوگ، ان سے جڑے پارٹی کے چھوٹے بڑے ورکر، ہزار سے کم مجمع نہیں ہوگا، بارہ بج جاتا، فون کیسے نہ کرتا؟

روشن پارٹی شروع ہونے کے بہت پہلے منورنجن بابو کے یہاں چلا گیا تھا۔ اس وقت بھی پچاسوں آدمی جمع تھے۔ ہال میں ہنسی خوشی کا ماحول تھا اسی وقت منورنجن بابو نے ہنس کر کہا تھا: پچھلے سال بھر سے تو میں اس سسری جانچ کے چکر میں آپ کے لئے کیا اپنے لئے بھی کچھ نہ کر سکا مگر اب بہت ہوا۔ اور آپ لوگ بھی" منورنجن بابو ذرا زور سے ہنسے تھے۔" بہت دھیرج سے کام لیا ہے۔ پارٹی کے بعد رکئے گا۔ اپنی منتر منڈلی کے لئے تو کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہے۔"

اس لئے پارٹی چھوڑ کر آنے کا تو کوئی سوال نہیں تھا۔ پارٹی ختم ہو جانے پر بھی جب تک منورنجن بابو اجازت نہیں دے دیتے۔ وہ" منورنجن نو اس سے" ہٹنے والا نہیں تھا اور اسی لئے جب دس بج گیا تو اس نے گھر فون کر دینا مناسب سمجھا تا کہ بیوی کو بتا دے کہ آنے میں دیر ہو سکتی ہے۔

مگر فون اٹھایا نوکر نے:" جی سر ہم رامو ہیں۔"

" بی بی جی کو فون دو۔"

" سر وہ یہاں پر نہیں ہیں"۔

" سو گئیں ہیں کیا؟"

" نہیں سر۔ سوئی تو نہیں ہیں"۔

" تو پھر؟"۔۔۔

" سر وہ....." اتنا کہہ کر رامو رک گیا۔

" کیا بات ہے؟ بولتے کیوں نہیں؟ روشن نے نوکر کو ڈانٹا

" سر۔ وہ بیڈ روم میں ہیں"۔

" تو ایسے کہو نا کہ سونے چلی گئی ہیں"

" نہیں سر۔ سوئی نہیں ہیں"

" عجیب پاگل آدمی ہے۔ جب سوئی نہیں ہیں تو ان کو فون کیوں نہیں دیتا؟"

" سر وہ... ششی بھوشن بابو... ان کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی ہے"۔ رامو ہکلانے لگا تھا

''کیا بکتا ہے؟ششی بھوشن اس سمئے وہاں کہاں سے؟۔

''سرو وہ آئے تو تھے سات ہی بجے.....مگر.....انہوں نے.....'' راموا پنی ہکلاہٹ پر قابو نہیں کر پا رہا تھا۔

''ابے ہکلاتا کیوں ہے؟ صاف صاف بول''۔روشن کا غصہ آسمان چھونے لگا۔

''جی سرو ہ.....انہوں نے زیادہ پی لی.....چلنے کے قابل نہیں رہے.....میڈم نے بیڈ روم میں ان کو سلا دیا ہے.....کمرہ اندر سے بند ہے.....ہلہ کرنے کو منع کیا ہے.....بابا لوگ بھی دوسرے کمرے میں سوئے ہیں'' روشن نے فون پٹخ دیا۔

اسے لگا وہ جل رہا ہے۔آگ کی تیز لپٹوں میں اس نے خود کو گھرتا محسوس کیا۔اس کا پورا سراپا رواں رواں جل رہا تھا.....اس نے چاروں طرف نگاہ کی نجات کوئی نجات، پناہ کوئی پناہ.....کہیں کوئی جائے پناہ نہیں تھی۔وہ بے تھاہ تھا اور اکیلا تھا اور اس کے چاروں طرف آگ تھی۔وہ گھبرا کر ہال سے نکل آیا۔بے ساختہ اس کے قدم اس سمت بڑھے جہاں اس نے اپنی گاڑی کھڑی کی تھی.....گاڑیوں کی بھیڑ میں اپنی گاڑی تلاش کرتے ہوئے اسے منورنجن بابو کا جملہ سنائی دیا.....پارٹی کے بعد رکئے گا.....جانچ کے چکر میں آپ کے لئے کیا اپنے لئے بھی کچھ نہ کر سکا مگر اب بہت ہوا.....پھر اس آواز کے ساتھ ساتھ دوسری آواز سنائی دی.....میڈم نے بیڈ روم میں ان کو سلا دیا ہے کمرہ اندر سے بند ہے.....پھر آوازیں گڈمڈ ہونے لگیں.....آپ لوگ پارٹی کے بعد.....میڈم نے بیڈ روم میں.....رکئے گا.....ان کو سلا دیا ہے.....متر منڈلی کے لئے.....کمرہ اندر سے.....کچھ کرنا ہی پڑے گا.....بند ہے.....روشن آوازوں کے اژدہام میں گھرا اپنی گاڑی تک آیا۔

گاڑی کا دروازہ کھول رہا تھا تو پھر آواز سنائی دی.....آپ لوگوں کے لئے کچھ نہ کر سکا.....جب وہ کار اسٹارٹ کر کے مین روڈ پر آیا تو پھر آواز گونجی.....پارٹی کے بعد رکئے گا...''

مگر روشن سنی ان سنی کر کے گھر کی طرف دوڑ پڑا.....''ششی بھوشن! آج تمہیں بتاتا ہوں''.....اس نے دانت کچکچا کر ایکسلیٹر پر پیر کا دباؤ بڑھا دیا.....اسپیڈ انڈیکیٹر میں گاڑی ۸۰،۸۵ کا کانٹا چھوتی نظر آرہی تھی۔بارش پھر تیز ہوگئی تھی، ویسے تو آج بارش صبح ہی سے رک رک کر مسلسل ہوتی رہی تھی، موسم بھی دن بھر دھوپ چھاؤں کا کھیل کھیلتا رہا تھا مگر اس وقت تو تاحدِ نظر بادلوں کا جماؤ تھا، روشن نے سامنے کے شیشے سے آسمان کی طرف نگاہ کی مگر آسمان پہ کوئی تارا نہیں

تھا.....اندھیرا.....گھٹا ٹوپ اندھیرا.....گاڑی کے شیشے چاروں طرف سے چڑھے ہوئے تھے اردگرد کچھ نظر نہیں آرہا تھا، بس سامنے کے شیشے سے راستہ کسی طرح دکھائی دے جا رہا تھا۔

''اگر ہو جائے؟ کیوں؟ آخر کیوں؟ انہونی؟ کیوں؟ آخر انہونی کیوں؟ انہونی کی کوئی وجہ تو ہوتی نہیں......

اچانک روشن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے.....کیا انہونی ہو ہی جائے گی.....؟ وائپر کی آواز گاڑی کے اندر گونجنے لگی تھی.....کھٹ کھٹ....کھٹ کھٹ.....کیا وائپر خراب ہو گیا؟.....آواز بار بار ابھر رہی تھی.....کھٹ کھٹ....کھٹ کھٹ....پھر اس آواز کے ساتھ روشن نے اپنے دل کے دھڑ کنے کی آواز بھی سنی.....دھک دھک.....دھک دھک.....پھر دونوں آوازیں ایک دوسرے میں گڈمڈ ہونے لگیں.....کھٹ دھک.....دھک دھک.....دھک دھک.....کھٹ دھک.....دھک دھک.....''

بے ارادہ، بے سوچے سمجھے، بے اختیارانہ.....بے خیالی میں اس کا پیر بریک پر پڑ گیا تھا۔ وائپر کی آواز اب سنائی نہیں دے رہی تھی۔ گاڑی کے سارے شیشے چاروں طرف سے چڑھے ہوئے.....گاڑی چاروں طرف سے بالکل بند.....وائپر ایک طرف جھکا ہوا.....باہر چھاجوں برتی برسات اور دھواں دھار برستا اندھیرا، سڑک پر آدم نہ آدم زاد، گاڑی میں صرف روشن بہاری..... اور ایک.....بس ایک.....گونجتی.....گاڑی کے اندر.....چاروں طرف.....دھوئیں اور دھند کی طرح پھیلتی آواز.....دھک دھک.....''

روشن ایک سرد رات میں بھی سر سے پیر تک پسینے میں تر بتر ہو گیا۔

ستر پچھتر سے اسی پچاسی کے درمیان دوڑنے والی گاڑی اچانک پورا بریک لگنے سے الٹتے الٹتے بچی تھی۔ مگر روشن ابھی ہوش میں کہاں آیا تھا۔

وہ تو عجب ٹرانس میں تھا اسے یاد نہیں تھا کہ وہ منورنجن بابو کے یہاں سے اپنے گھر جانے کے لئے نکلا ہے، اسے یہ بھی یاد نہیں تھا کہ بھری برسات کا موسم ہے، اسے یہ بھی یاد نہیں تھا کہ وہ ایک ہلکی گاڑی چلا رہا ہے جو ذرا سا اسکٹ کرنے پر الٹ سکتی ہے، وہ یہ بھی بھول چکا تھا کہ وہ ستر اسی کی رفتار سے گاڑی چلا رہا ہے.....سامنے کی ہر یاد اور ہر خیال دم توڑ چکا تھا اور ایک چہرہ.....بس ایک چہرے کا کلوز اپ اس کے سامنے پھیلے شیشے کے پورے جسم پر پھیل چکا تھا۔ مینا؟ ہاں مینا؟ ہاں ہاں مینا ہی تھی۔

ہیڈ لائٹس کی روشنی میں سامنے سے آنے والی گاڑی کے اندر مینا کی شبیہہ جھلکی تھی۔

اچانک بریک لگنے سے الٹتے الٹتے بچنے والی گاڑی کو وحشیانہ انداز میں اس نے بیک گیر میں لیا روشن اب صرف ایک خیال کے حصار میں تھا...... مینا...... ہاں مینا ہی تھی...... بیس برس...... بیس برس پہلے کی مینا...... کالج ڈیز کی سب سے اچھی دوست...... اس کا پہلا پیار...... شادی نہیں ہوسکی...... ہو بھی نہیں سکتی تھی...... جب دونوں نے کالج چھوڑا تو دونوں بیس اکیس برس کے تھے...... کس منھ سے وہ اپنے بڑوں کے سامنے خواہش کا اظہار کرتے...... روشن اس وقت کس لائق تھا۔ مینا کی شادی تو کالج سے نکلتے ہی ہوگئی، پھر وہ اپنے شوہر کے ساتھ امریکہ چلی گئی اور دونوں ایک دوسرے سے بے خبر ہوگئے۔

بیس برس...... بیس برس...... مدت ہجر کتنا پھیل گئی! اور اب اس لمحے میں؟

روشن گاڑی کو بیک گیر میں لیتے لیتے رک گیا...... اس لمحے میں تو روشن، ششی بھوشن کی لگائی آگ میں جل رہا تھا۔ سڑک پر آدھی مڑی گاڑی رکی کھڑی تھی۔ روشن نے اس آدھی مڑی گاڑی کی ہیڈ لائٹ کے انتہائی کنارے پر نگاہ جمائی تو وہ گاڑی...... بہت دور پر...... ایک سرخ نقطے میں تبدیل ہوتی دکھائی دی...... اسی وقت اچانک ایک آواز گونجی...... میڈم نے بیڈ روم میں ان کو سلا دیا ہے...... کمرہ اندر سے بند ہے"۔ روشن نے ایسا محسوس کیا جیسے اس کے مغز کو کسی نے اس کے سر کے اندر سے نکال کر کسی بوائلنگ فرنیس میں ڈال دیا ہو، اس کے کان میں کسی نے سیسے پگھلا دیئے ہوں، اس کی انتڑیاں اس طرح اینٹھ رہی تھیں جیسے کوئی نوکیلا زنگ آلود چاقو آنت میں گھس کر چاروں طرف گھوم رہا ہو اور اس کے ہاتھ ایسے بھاری اور بے حس ہو رہے تھے جیسے ان پر اچانک فالج گر گیا ہو۔

اس نے بڑی مشکل سے بہت کوشش سے اور بہت تھکے تھکے انداز میں گاڑی کا رخ پھر سیدھ میں کیا۔ اس کا چہرہ ایسا سرخ ہو رہا تھا جیسے سارے جسم کا خون اس کے چہرے میں سمٹ آیا ہو۔ "ششی بھوشن مادر...... غلیظ گالی بکتے ہوئے اس نے گاڑی پھر جمنا اپارٹمنٹ کی طرف دوڑا دی...... ایک تو منورنجن کی میٹنگ چھوٹی، دوسرے یہ مینا...... پتہ نہیں یہ کب آئی...... جانے اس کو میرے یہاں ہونے کا علم بھی ہے یا نہیں...... اس حرامزادی کے چکر میں تو میری دنیا لٹ گئی ...... میں نے تو شادی کے بعد یہی سوچ کر کسی دوسری لڑکی یہاں تک کہ کسی پرانی دوست سے بھی کوئی تعلق نہیں رکھا کہ اپنی بیوی کے جذبات سے کھیلنے کا مجھے کوئی حق نہیں اور یہ سالی میری عزت

سے کھیلنے لگی..... ششی بھوشن کے بارے میں، پہلے میں نے اسے اشاروں میں سمجھایا جب اس سے کام نہیں چلا تو بہت نرمی سے مگر صاف صاف اسے بتایا کہ "یہ آدمی سیاسی دنیا میں عورت خور مشہور ہے"۔ مگر وہ کیوں سمجھنے لگی۔ الٹا مجھ ہی سے بحث کرنے لگی: آپ نے خود ہی ششی بابو سے مجھے ملوایا، ان کو اپنے گھر لائے، مجھے ان کے گھر لے گئے۔ اب وہ گھر آ جاتے ہیں تو میں کیا کروں؟ آپ کا جی چاہے تو آپ انہیں یہاں آنے سے منع کر دیجئے".....سالی مجھے بلیک میل کرتی ہے جانتی ہے کہ میں یہ تو کر نہیں سکوں گا۔ ششی بھوشن مکھیہ منتری کی ناک کا بال ہے میرے کندھے پر بندوق رکھ کر چلاتی ہے.....حرامزادی! پھر روشن کے خیال کی رو ششی بھون کی طرف مڑ گئی۔

یہ سالا ششی بھوشن بھی تو شروع شروع میں بالکل ریز رو رہا۔ میں نیا نیا راج نیتی میں آیا تھا دھوکا کھا گیا۔ پہلے تو لفٹ ہی نہیں دیتا تھا۔ اس زمانے میں تو میں منورنجن بابو کے بھی قریب نہیں ہوا تھا، سوچا اسی کے قریب ہو جاؤں، یہ تو منورنجن سے بڑی چیز ہے.....مگر یہ تو بھر منہ بات ہی نہیں کرتا تھا.....وہ تو ایک مرتبہ میں اسکوٹر پر.....اسی بے شرم کو لے کر جا رہا تھا کہ سامنے سے وہ اپنی گاڑی پر آتا دکھائی دیا، میں نے راج نیتک بھل منساہٹ کے ناطے اسے نمستے کیا.....اور یہ تو سب کے تئیں میرا عام ویوہار ہے۔ کبھی کبھی تو اس کی گاڑی زن سے نکل جاتی تھی، پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ اس نے جواب دیا یا نہیں مگر اس دن تو انہونی ہو گئی۔

"روشن جی۔ کہاں جا رہے ہیں؟" ششی بھوشن نے گاڑی روک دی تھی اور بتیسی نکال کر ہنس رہا تھا۔ "جی۔ ذرا ریڈیو اسٹیشن کے پاس" میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔

"آج کل کہاں ہیں۔ آپ؟ بہت دنوں سے بھینٹ ملاقات نہیں ہوئی"

"یہیں تو ہوں سر!"

"تو پھر ملاقات ہونی چاہیئے"

"جی سر!"

"ضرور ملے گا"

"جب کہیے سر" "کل شام میں ڈیرے پر آیئے"

"جو حکم سر!"

اس کے بعد میرا اس کا سمبندھ بڑھتا گیا۔ میں تو یہی سوچ کر خوش تھا کہ پردیش کی

راج نیتی کا اتنا بڑا گیتا مجھے یاد رکھتا ہے، میں اسی جھونک میں اس کے قریب ہوتا گیا۔ پھر ایک دن اس نے خود ہی کہا: روشن جی آپ کے گھر آؤں گا.....آپ کے ساتھ کھانا کھاؤں گا.....میں بھلا انکار کیسے کرتا۔ مجھے تو لگا میرے بھاگ کھل گئے مگر کیا پتہ تھا کہ وہی دن میری۔

بدقسمتی شروع ہونے کا دن بن جائے گا اس دن کے بعد تو وہ مجھ سے زیادہ اس بے غیرت کے قریب ہوتا گیا.....کتنے دن تک برداشت کیا جا سکتا ہے۔ اب یہ تو حد ہوگئی پھر اسے آواز سنائی دی.....کمرہ اندر سے بند ہے'' ''مگر غلطی میری ہی ہے''۔ روشن نے سوچا۔ ''میں نے اس پر روک کیوں نہیں لگائی؟ کیسے روک لگاتا؟ اس سے کیا کہتا کہ آپ میرے گھر نہ آیئے..... کچھ کہنے کے لئے کچھ Base چاہئے۔ میرے پاس کیا پوائنٹ تھا؟ مصیبت یہ تھی کہ میں منورنجن بابو سے بھی اس کی شکایت نہیں کرسکتا، دوگروپ کے آدمی ہیں، میں تو دونوں طرف سے مارا جاتا۔

''پارلیمنٹری بورڈ کی ممبری''۔ اچانک اسے منورنجن بابو کی میٹنگ یاد آئی۔

''اچھا ششی بھوشن''۔ روشن ایک لمبا سانس بھر کر بدبدایا۔ تم نے میرے ساتھ جو کیا ہے اس کا بدلہ آج تمہیں مل ہی جائے گا.....آج تم رہو گے یا میں.....اور تو چھنال.....خیال کی رو بیوی کی طرف مڑ گئی تجھ کو تو میں وہ زندگی دوں گا جس سے موت بھی کانپے گی.....سالی نے آج میری ساری پلاننگ کا ستیاناس کردیا.....منورنجن بابو تو آج سب کو خوش کرنے کے موڈ میں تھے۔ اقلیتی کمیشن کی چیرمین شپ تو مہتاب کی رکھی ہوئی ہے۔ دوسرا اور کون مقابلے میں ہے، ابراہیم شاہ پوری تو بیس سوتری کے لئے لگا ہی ہوا ہے شیلیش سیٹرن کاؤنسل کی سیٹ کے لئے دوڑ رہا ہے۔ اسٹیٹ منسٹر کی پوسٹ ہے.....رگھوونش..... ہاں رگھوونش نکل جائے گا۔ مجھ سے تو نہیں بولا ہے مگر رنجیت بتا رہا تھا کہ اس کی نظر بھی پارلیمنٹری بورڈ پر ہی ہے۔ مگر بورڈ میں تو کئی ممبر ہوتے ہیں۔ اس سے کیا۔ سب سیٹ منورنجن بابو کے آدمیوں ہی کو تو نہیں مل جائے گی۔ رگھوونش اگر نکال لے گیا تو میرا چانس کہاں؟ منورنجن بابو کو بھی تو کہنے کو مل جائے گا۔ میں نے تو تم کو روکا تھا۔ تم چلے کیوں گئے؟ اب کیا بچا ہے جو تم کو دلواؤں؟ روشن کی گاڑی جمنا اپارٹمنٹ میں داخل ہو چکی تھی۔

بارش نے ابھی تک رکنے کا نام نہیں لیا تھا۔ بادل کی گرج اور بجلی کی چمک اور بڑھ گئی تھی.....'' جو بجلی کسی ایک جگہ چمکتی ہے وہ کسی نہ کسی مقام پہ گرتی بھی ہے'' روشن کو پھر ششی بھوشن یاد آ گیا.....آواز پھر گونجی: '' کمرہ اندر سے بند تھا''.....سارا اپارٹمنٹ رات کے سناٹے میں ڈوبا ہوا

تھا۔اپارٹمینٹ کے اسٹریٹ بلب عارضی طور پر کھڑے کئے گئے لکڑی کے کھمبوں میں لٹکے ہوئے تھے اور ہواؤں کے ریلے میں آگے پیچھے ڈول رہے تھے اور درختوں کے بیچ سے چھن چھن کر آتی روشنیاں بارش کی بڑی بڑی بوندوں کے درمیان اس طرح نیچے اوپر ہوتی نظر آرہی تھیں جیسے پانی میں سانپ بل کھاتا ہے۔روشن نے اپنی گاڑی پارک کے شیڈ میں کھڑی کی اور تقریباً دوڑتا ہوا سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔اس وقت کوئی اس کا چہرہ دیکھتا تو شاید ڈر جاتا۔غصے کی زیادتی کے سبب چہرہ بالکل سرخ ہورہا تھا۔دانت بھنچے ہوئے تھے اور آنکھوں کی کیفیت عجیب ہورہی تھی جیسے کسی پاگل کی بے کیفیت آنکھیں یا کسی خونی کی وحشت زدہ آنکھیں۔اس نے اپنے فلیٹ کے کال بیل پر بے تابانہ انگلی رکھی، گھنٹی بجی،شاید نوکر دروازے کے پاس ہی تھا،دروازہ فوراً کھل گیا۔

''وہ دونوں کہاں ہیں؟روشن کی دہاڑ سے فلیٹ گونج اٹھا۔

''سر آہستہ.....میڈم بگڑیں گی.....بلہ کرنے سے منع کیا ہے''

اس کی تو میں.....''روشن نے گالی بکتے ہوئے نوکر کو ایک جھانپڑ جڑ دیا.....''بتا دونوں کہاں ہیں؟''نوکر کے لئے یہ بالکل انہونی تھی۔کئی فلیٹس میں اس نے کام کیا تھا مگر روشن جیسا اچھے سبھاؤ والا مالک اسے آج تک نہیں ملا تھا۔وہ تو کچھ کہہ ہی نہ سکا.....چودہ پندرہ برس کا لڑکا.....بالکل حیرت زدہ سا دیوار کے ایک کونے سے لگ گیا اور آہستہ آہستہ روتے ہوئے بیڈروم کی طرف اشارہ کیا۔روشن تیزی سے بیڈروم کی طرف بڑھا اور دروازے پر ایک زور کی تھاپ ماری دروازہ کھلنے میں ذرا دیر ہوئی.....دروازہ کھلا تو سامنے کا منظر غصے کو مزید بڑھانے والا تھا۔ششی بھوشن اس کی مسہری پر دراز تھا۔

اس کے لیٹنے کا انداز اور بستر کی شکنیں بتارہی تھیں کہ وہ بستر پر تنہا نہیں تھا.سائڈ ٹیبل پر شراب کی بوتل اور گلاس.....اس کی بیوی نائٹی پہنے ہوئی تھی۔ماتھے کی بندیا ماتھے پر نہیں تھی۔ہونٹوں کی لپ اسٹک پھیل کر ہونٹوں کے نیچے اور اوپر والے حصے تک آئی تھی۔بال کھلے ہوئے تھے اور بے ترتیب تھے۔کمرے میں روم فرشنر کی وہ خوشبو تیر رہی تھی جو بالعموم نائٹ بلب جلانے کے بعد روشن اسپرے کرتا تھا۔دروازہ کھلنے اور سامنے کا منظر دیکھنے میں شاید منٹ سے بھی کم کا وقفہ رہا ہوگا.....اس وقفے میں روشن ہیجان کے سمندر میں ڈوبا ابھرا.....''فوراً حملہ.....نہیں پہلے ذلیل کروں.....باندھوں.....گلا گھونٹ کے ماروں ریوالور تو یہیں دراز میں.....باندھ کر گولی

سے اڑا دوں.....اور اس سالی کو.....نہیں طلاق نہیں.....اسی گھر میں.....اسی کے سامنے دوسری عورتوں کے ساتھ.....''

ہیجان کے انتہائی خطرناک جوار بھاٹا یا بھنور یا باڑھ میں گھرا وہ ابھر رہا تھا ڈوب رہا تھا، پٹخنیاں کھا رہا تھا، اور سیکنڈ منٹ تک بھی نہیں پہنچ پایا تھا کہ اچانک وہ چونک کر اچھل پڑا۔

یہ آواز.....؟ یہ آواز.....؟ اسے لگا وہ منورنجن بابو کے پاس بیٹھا ہے.....ان کے قدموں میں.....اور وہ مسکرا کر کہہ رہے ہیں: روشن بہاری پارلیمنٹری بورڈ کی ممبری مبارک ہو''

''مگر نہیں''.....وہ پھر چونکا.....''وہ تو اپنے بیڈ روم میں ہے اور سامنے.....مکھیہ منتری کی ناک کا بال.....ششی بھوشن ہے''

''ارے بھائی۔ دھنیہ واد بھی نہیں دو گے ہم کو، ششی بھوشن مسکراتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔'' میں کچھ سمجھا نہیں۔'' روشن کو لگا کئی روشن اس پر تلے اوپر چڑھے آ رہے ہیں۔

''ہاں۔تم کیسے سمجھو گے۔تم کو تو ہم پر وشواس ہی نہیں ہے''ششی بھوشن نے ایک کاغذ بڑھاتے ہوئے کہا:''لو۔اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔تم پارلیمنٹری بورڈ کے ممبر بنائے گئے ہو۔''

''سر.....مگر میں سر.....''روشن کی کیفیت عجب ہو رہی تھی۔وہ غصہ برقرار رکھنا چاہ رہا تھا مگر ہنسی آئی جا رہی تھی اور چہرہ روہانسا ہوا جا رہا تھا اور آواز غصہ، خوشی' حیرت اور مجبوری کے رس میں ایسی تر بتر ہو رہی تھی جیسے پھلجڑی' انار' یا کریکر جلیبی کے رس میں تر بتر ہو جائے.....روشن کو لگا یہ تو اس کی اپنی آواز ہی نہیں ہے.....مگر پھر بھی بول تو رہا تھا روشن ہی!'' لیکن سر.....مگر سر.....ہم نے تو کبھی.....آپ سے کہا نہیں''۔

''ہاں تم ہم سے کیوں کہو گے؟ تم تو منورنجن سے کہو گے.....ہم کو تو پرایا سمجھتے ہو.....پرنتو ہم تو تم کو اپنا متر مانتے ہیں.....تمہاری پتنی سے ہم نے پوچھا تھا.....اس اسائنمنٹ کا کریڈٹ تو اسی کو جاتا ہے.....کتنا خیال رکھتی ہے تمہارا.......''

ششی بھوشن اور بھی کچھ بولتے رہے......''

مگر آخری قابل ذکر بات یہ ہے کہ روشن نے اپنے آپ کو ششی بھوشن کا پیر چھوتے ہوئے دیکھا۔۔۔!!!

☆☆☆

زندگی، اے زندگی

سبطین کو پورا یقین تھا کہ وہ سب کچھ سمیٹ لے گا اور دل جمعی کے ساتھ اپنے اصل کام میں لگ جائے گا۔

اسے شادی سے پہلے کے دن یاد آئے' تھوڑے سے اچھے دن' نوکری اور شادی کے درمیان کے دن، ان دنوں شاید گرانی کم تھی یا شاید خرچ ہی کم ہو، شروع شروع کی نوکری لگ بھگ ہزار روپے تنخواہ تھی مگر اتنی قلیل تنخواہ میں بھی چین زیادہ تھا۔ شہر میں نوکری ہوئی تو سبطے کے والد نے ایک جان پہچان والے کے یہاں اسے Paying Guest بنا دیا' ۵۰ روپیہ کمرے کا ۱۵۰ کھانے کا، ڈیرے سے کالج چہل قدمی کے فاصلے پر، آنے جانے کا بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا، نیا شہر جان پہچان کے لوگ کم، پھر کچھ وہ خود بھی مزاجاً کم آمیز تھا۔ ملا جلا کر مہینے میں وہ چار سو خرچ کرتا اور باقی گھر بھیج دیتا جس کے بارے میں اس کی ماں نے بتایا کہ اس میں سے بھی ڈیڑھ دو سو وہ بینک میں رکھوا دیتی تھیں۔

ایسے ہی مطمئن حال میں جیتے برس ڈیڑھ برس گذرے ہوں گے کہ ماں باپ کو اس کی شادی کی فکر ستانے لگی اور پھر شادی ہو ہی گئی، شروع شروع بیوی گھر رہی، وہ ہفتہ دس دن پر گھر چلا جاتا مگر پھر آہستہ آہستہ شیر کو خون منھ لگنے لگا۔ سبطین کو احساس ہونے لگا کہ اب ہر متناسب جسم اس کو اپنی طرف متوجہ کرنے لگا ہے' اور اس طرح دن میں دسوں بار اسے بیوی یاد آ جاتی، سبطے کو یہ سوچ کر ہنسی آئی کہ اب وہ ماں باپ سے زیادہ بیوی کو یاد کرنے لگا تھا۔

یہ سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ اس کے آبائی شہر کے دو گروپ میں تناؤ پیدا ہو گیا اور پولس والے اس کے محلے سے کئی لوگوں کو پکڑ کر تھانے لے گئے سبطے کے باپ اپنی جوانی کے دنوں میں

شہر کے باعزت سماجی کارکن تھے، اور حکمراں سیاسی پارٹی سے وابستہ بھی مگر امتدادِ زمانہ کے سبب ادھر اس کے والد کی عمر ڈھلی اور ادھر حکمراں جماعت اپوزیشن میں آ گئی۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا مگر بہرحال ایسا ہوا کہ تھانے نے اس کے باپ سے بھی پوچھ گچھ کی، یہ صحیح ہے کہ تھانے نہیں لے گئے مگر بقول اس کے باپ کے، گفتگو کا رویہ غلط تھا۔ انہی دنوں گرمی کی چھٹیاں ہو گئیں۔ اس کے باپ کا اسکول لگ بھگ ڈیڑھ ماہ کے لئے بند ہو گیا اور خود اس کا کالج دو ماہ کے لئے چھٹی کے بعد فوراً ہی رمضان کا مہینہ شروع ہونے والا تھا۔ اس کی ماں کہنے لگیں: ''رمضان میں تنہا رہو گے۔ گرمی کے موسم میں دن بھر خالی پیٹ اور اس کے بعد بھی اپنی پسند کا کھانا نہیں۔ تمہارے باپ بھی یہاں کے حالات سے ادب گئے ہیں، دو تین مہینوں کے لئے کسی چھوٹے سے گھر کا انتظام کیوں نہیں کر لیتے؟ ہم لوگ چلے چلتے ہیں۔ رمضان کے آخر میں آ جائیں گے۔ دولہن بھی امید سے ہے۔ اسے بھی وہاں کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھا دیا جائے گا''۔

آخری بات انہوں نے آہستہ سے، سرسری طور پر، برسبیل تذکرہ کہی مگر سطلے کے اندر اچانک ہی کچھ عجیب سا ساز گونج اٹھا، اندر ہی اندر ایک عجب سا کیف، عجیب سی طمانیت کی نرم پھوار، بھرے پرے ہونے کا کبھی نہ محسوس کیا جا سکنے والا احساس، اس نے سر اٹھا کر دالان سے باہر اوپر دیکھا، شروع مئی کی چلچلاتی دوپہر میں اسے آسمان پہ بادل کا ایک ٹکڑا سا نظر آیا پھر بادل کا وہ ٹکڑا پھیلنے لگا، پھیلتا گیا پھیلتا گیا اور پھر اس کی آنکھوں کی حدوں کے اندر سمو سکنے والا سارا آسمان گھنے بادلوں سے ڈھک گیا، ہوا ٹھنڈی ہو گئی۔ اس کا جی چاہا وہ اس ٹھنڈے ابر آلود پل میں اپنی اماں کی گود میں لیٹ جائے، اور اماں اس پر اپنے آنچل کا سایہ کر دیں۔ اسی پل سطلے کو بیوی کا خیال آیا۔۔۔

اس مرتبہ سبطین نے اپنی پوسٹنگ پر لوٹ کر پہلا کام یہ کیا کہ ایک بچے کی تصویر بنانی شروع کی! مصوری کا شوق شاید اسے جنم جنمانتر سے ملا تھا۔ شروع شروع اس کے باپ اس پر خفا ہوئے۔ اس کے گھر محلے کا جو پس منظر تھا اس میں اس کی گنجائش نہیں تھی مگر وہ کیا کرتا، طالب علمی کے دنوں میں تو یہ حال تھا کہ سوتے سوتے آدھی رات میں وہ اٹھ جاتا اور تصویریں بنانے لگتا، ان دنوں اپنے پاگل پن سے وہ عاجز تھا مگر وہ شاید بے بس تھا، اسے خوابوں میں طرح طرح کے رنگ برنگے پیکر اور شبیہیں نظر آتیں اور اس کی آنکھ کھل جاتی اور جیسے کوئی ان دیکھی طاقت اس کے ہاتھوں میں برش پکڑا دیتی، بہت دنوں بعد اس تخلیقی ابال میں آہستہ آہستہ کمی آئی، کالج جوائن

کرنے کے بعد جب اسے کچھ سکون ہوا تو اس نے اپنا جائزہ لیا' اسے لگا کہ اس تخلیقی وفور کو اب توجہ اور احتساب دونوں کی ضرورت ہے' کیوں کہ اس کی تصویریں اب لوگوں کو متوجہ کرنے لگی تھیں، پھر بھی وہ سوامی ناتھن' غلام شیخ' ستیش گجرال اور حنیف رامے کی طرح ابھی مقبول نہ ہو سکا تھا' ایسا کیوں ہوا؟ وہ کبھی کبھی سوچتا تو مخمصے میں پڑ جاتا، شاید مجھ ہی میں کوئی کمی ہو' پھر سیلف پروجکشن اور لابی وغیرہ کا خیال آتا مگر وہ بھی اس کے بس کی بات نہیں تھی' غیرت فن کے سبب تو وہ کمرشیل آرٹسٹ نہ بن سکا تو اسے کیسے گوارہ کر لیتا؟ ابھی تک اس کے لئے یہی بہت تھا کہ اچھے اسکیچ پر لوگ تعریف کرتے اور معمولی تصویروں پر حیرت اور مایوسی کا اظہار کرتے، اس لئے کالج جوائن کرنے کے بعد جب اسے کچھ سکون ہوا تو اس نے نئے سرے سے اپنے فن کا جائزہ لیا' تصویریں بنانے سے پہلے سوچنے لگا' ارسٹوکریٹک اور گوتھک موڈ سے وہ شعوری طور پر کنارے ہٹا، سیزان اور پکاسو سے شیر گل اور فدا حسین تک مصوری کے پورے عالمی پس منظر کے بارے میں سوچا، پھر اپنے پس منظر اور پیش منظر کے بارے میں رنگوں کی آمیزش کے بارے میں' برش کے مدھم اور گہرے ٹچ کے بارے میں' خطوں قوسوں اور دائروں کے بارے میں' اس کا فائدہ اسے ہی پہنچا۔ اب اس کی تصویروں کے مختلف ڈائمنشنز پر باتیں ہونے لگیں' مبصروں نے یہاں تک لکھ دیا کہ اب سبطین کی بنائی تصویروں پر سبطین کا نام نہ بھی رہے تب بھی اس کے خطوط کا جو عمود اور صعود ہے اور اس کے پس مناظر کا جو افقی پھیلاؤ ہے' یہی ''سبطین آرٹ'' کا اصل تعارف ہے۔

اب کے سبطین نے جس بچے کی تصویر بنانی شروع کی وہ بچہ ابھی پیدا نہیں ہوا تھا پھر بھی وہ سبطین کے سامنے اپنے پورے سراپے کے ساتھ موجود تھا، اس لئے اسے تصویر بناتے ہوئے ذرا بھی دشواری محسوس نہیں ہو رہی تھی، چارٹ پیپر پر برش ایسے چل رہا تھا جیسے ندی میں کشتی ہوا کے رخ پہ چلتی ہے۔ ایک پورا دن اس میں گزر گیا، محض چند گھنٹوں کا کام باقی تھا کہ اچانک اماں یاد آگئیں: ''ایک چھوٹے سے گھر کا انتظام کیوں نہیں کر لیتے؟۔۔۔ دولہن امید سے ہے' وہاں اسے کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھا دیا جائے گا''۔

وہ تصویر ادھوری چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

تین چار دن کی بھاگ دوڑ کے بعد اسے مکان مل گیا' وہ ایڈوانس دے کر واپس آ رہا تھا تو خیال آیا: ''اب وہ تصویر مکمل کر لی جائے''۔ مگر پھر اماں یاد آگئیں: ''تمہارے باپ یہاں کے

حالات سے اوب گئے ہیں''۔ اس نے سوچا: ''ان لوگوں کو جلد سے جلد یہاں آ ہی جانا چاہئے''۔

سبطین ماں باپ بیوی کو لے کر لوٹ رہا تھا تو ایک ہی خیال میں گم تھا: ''وہ ادھوری تصویر مکمل کرنی ہے'' مگر نئے گھر میں اتر کر اماں بگڑ اٹھیں: ''کل کو ایک بچے کے باپ بن جاؤ گے مگر یہ بھی پتہ نہیں کہ گھر میں سونے کے لئے چوکی چار پائی کچھ بھی چاہئے، چوکی چار پائی پر بچھانے کے لئے بستر چاہئے، کھانا پکانے کے لئے چولہا چاہئے، کھانا کھانے کے لئے برتن چاہئے، پانی پینے کے لئے گلاس چاہئے۔ ارے میاں تم کو نگوڑی تصویروں نے بالکل تصویر ہی بنا دیا ہے؟ اور ہم سب کو بھی شاید تصویروں کی طرح دیوار پر لٹکا دینا چاہتے ہو؟''

اس پر سبطین جو بھاگا تو بھاگتا ہی رہا اور ایک ماہ بعد جب وہ حساب کرنے بیٹھا تو معلوم ہوا کہ اس کے پاس اور ماں کے پاس جو تھوڑا بہت جمع جتھا تھا وہ تو ختم ہوا ہی پی ایف سے نکالا پیسہ بھی ختم ہو گیا۔ دوسری طرف مہینے کا بجٹ بنایا گیا تو معلوم ہوا کہ آمدنی گیارہ سو اور خرچ بارہ سو!

سبطین بڑے چکر میں پڑا کہ یہ کیا ہو گیا؟ مگر جو ہوا وہ تو ہو ہی چکا تھا اور جو ہونا تھا اسے ہونا ہی تھا، بیوی کی دوا شروع ہو چکی تھی، ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ پہلا بچہ ہے احتیاط ضروری ہے ادھر ماں بوڑھی ہو چکی تھیں، گھر کے کام کاج کے لئے دائی کا انتظام کرنا پڑا، آمدنی گیارہ سو خرچ ساڑھے بارہ سو۔ سبطین نے کچھ ٹیوشن پکڑ لئے تو اتنا ہوا کہ آمدنی اور خرچ کا تناسب برابر ہو گیا۔

مگر وہ تصویر؟ سبطین کو یاد آیا اوائل مئی میں وہ تصویر شروع ہوئی تھی۔ چند گھنٹوں کا کام باقی رہ گیا تھا اور جون کا آخری ہفتہ ختم ہونے کو تھا، تصویر مکمل نہ ہو سکی، بیوی کا پانچواں مہینہ چل رہا تھا۔۔۔ سبطین کی زندگی کا یہ پہلا موڑ تھا جہاں Real اور Ideal کے بیچ کا گیپ کھل کر سامنے آ رہا تھا۔ فن مصوری میں وہ سرریلاتی مصور کی حیثیت سے جانا جاتا تھا اور اس وجہ سے اس کے یہاں خوابوں اور علامتوں کے ساتھ ساتھ استعجاب بھی پایا جاتا تھا۔ تجریدیت سے بھی ابھی خدا واسطے کا بیر نہیں ہوا تھا لہٰذا اکثر امیجز پر تجریدیت بھی حاوی ہو جاتی تھی مگر فنی تجرید اور حیاتیاتی تجرید دونوں میں زیادہ کٹھن کون ہے؟ اس پر اسے غور کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا، شاید یہی معاملہ خوابوں اور استعجاب کے ساتھ بھی تھا پھر بھی اسے یقین تھا کہ وہ خود کو سمیٹنے میں کامیاب ہو جائے گا اور اپنے اصل کام کی طرف دل جمعی کے ساتھ متوجہ ہو سکے گا۔ اب تو کئی رسائل اس سے اس کے تخلیقی عمل کے بارے میں اس کا تاثر جاننے کے بھی خواہش مند تھے۔ ایک رسالے نے تو آرٹ کی نئی جمالیات

اور تیسری دنیا کے موضوع پر ایک مضمون کی بھی فرمائش کی تھی، وہ جانتا تھا کہ اس مضمون پر اسے اچھا پیسہ مل سکتا ہے، وہ لکھ سکتا تھا اس کے پاس مواد بھی موجود تھا پکاسو، سرولیم ڈالی اور فدا حسین تک کی تصویروں کے فنی سفر اور اس کے تمام مراحل سے وہ بخوبی واقف تھا، وہ محسوس کر رہا تھا کہ اگر چار پانچ سال جم کر محنت کر لی جائے تو مصوری اس کے لئے مالی فائدے کا بھی سبب بن سکتی ہے، مگر اس کو موقع نہیں مل پا رہا تھا، جولائی شروع ہوتے ہوتے رمضان آ گیا اور رمضان کا معاملہ یہ ہے کہ کوئی روزہ رکھے یا نہ رکھے تقریباً ہر گھر میں ایک ماہ کے لئے دن اور رات کا ماحول تو بدل ہی جاتا ہے۔ خود اس سلسلے میں وہ کچھ بہت زیادہ محتاط نہیں تھا۔ مگر ہوا کیا؟ وہی ڈھاک کے تین پات، اس نے روزہ نہیں رکھا۔ پھر بھی مسئلہ تو بنا رہا، اس کی پہچان تو بہر حال ایک مخصوص فرقے والے کی حیثیت سے تھی، اس پر ستم یہ کہ اس نے مکان بھی ویسے ہی لوگوں کے درمیان لے لیا جو اس کے ہم نام تھے۔

ایسا شعوری طور پر نہیں ہوا مگر بہر حال ہوا تو، اب خود کو یہ سمجھانے سے کیا فائدہ تھا کہ اس کے آبائی شہر میں فرقہ وارانہ تناؤ پیدا ہونے کے سبب اس کے والد کو جو ذہنی دھچکا تھا، اس دھچکے سے ان کو باہر نکالنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ ملی جلی آبادی میں مکان نہ لیا جائے۔ مکان تو لیا جا چکا تھا اور اس کا نتیجہ بھی سامنے تھا کہ وہ بے روزہ دار ہونے کے باوجود گھر سے پان کھا کر باہر نہیں نکل پا رہا تھا، اس کا حل اس کی سمجھ میں یہ آیا کہ دن میں گھر سے باہر نہ نکلا جائے مگر حاصل؟ آنے والوں کا کیا کیا جا سکتا ہے؟ آنے والوں میں زیادہ تر محلے دار یا مسجد و مدرسہ کے لئے چندہ کے محصل۔ اس کو بار بار کلی کرنی پڑتی اور دانت ٹھیک سے مل مل کر دھونا پڑتا۔ عاجز ہو کر ایک ہفتہ بعد ہی اس نے روزہ رکھنا شروع کر دیا۔

رمضان ختم ہونے کو تھا تو اماں گھر لوٹنے کے لئے پر تولنے لگیں۔ باپ نے ماں کی اس خواہش کو رد تو نہیں کیا مگر ایک دن بیٹے سے کہا۔ "دولہن کو گھر جانے سے پہلے ڈاکٹر کو دکھا دو"۔

ڈاکٹر نے سارا معاملہ الٹ دیا۔ کہنے لگی: "پہلا بچہ ہے احتیاط ضروری ہے چھٹا مہینہ ختم پر ہے اور بچہ کمزور ہے۔ آپ اپنے رسک پر جانا چاہتے ہیں تو جائیے"۔

پندرہ جولائی کے بعد کا موسم تھا مگر حبس سے دم گھٹنے لگا۔۔۔۔ تصویر اب تک ادھوری پڑی تھی، بصرف گھٹنوں کا کام۔۔۔۔

ابا نے صورت حال کے پیش نظر گھر جانے کا پروگرام ملتوی کر دیا، بیوی خوش تھی مگر واپس لوٹنے کی خواہش اس کے چہرے سے جھل جھل جھلک رہی تھی البتہ اماں کے چہرے پر سبطین کچھ بھی تلاش نہ کر پایا۔

''اب جب عید بھی یہیں کرنی ہے تو عید کا کچھ انتظام بھی تو کر لینا چاہئے''۔ ابا کے فیصلے کے ایک دو دن بعد ایک شام اماں آہستہ سے بولیں۔

''اب کہاں سے انتظام کروں؟'' سبطے نے ادبدا کر اماں کو دیکھا۔ ''سارا پیسہ ختم ہو گیا۔ پی ایف میں بھی نہیں ہے''۔

''اتنا پریشان کیوں ہوتے ہو؟ ابا اس کا پریشان چہرہ دیکھ کر ہنسنے لگے۔ تمہارا پیسہ میرے اکاؤنٹ میں جمع ہے۔ جا کر لے آؤ''۔

''جو ہے سب نکال لینا''۔ دوسرے دن سبطین گھر کے لئے روانہ ہونے لگا تو ابا نے کہا۔

''کیوں؟ سب کیوں؟ عید کے بعد تو مہینہ ختم پر ہے ہی۔ میری تنخواہ مل جائے گی۔''

''تنخواہ سے کام نہیں چلے گا۔ ولادت کے وقت ممکن ہے ضرورت پڑے''۔

''تو اس وقت تک ہم لوگ یہیں بیٹھے رہیں گے؟''

''تو اور کہاں جائیں گے؟''

''کیوں گھر نہیں جانا ہے؟''

''عجیب بے وقوف آدمی ہو۔ جب چھٹے مہینے میں ڈاکٹر نے اجازت نہیں دی تو آٹھویں اور نویں مہینے میں اجازت دے گی؟''

برسات کی اس بھری گرمی بدن میں کانٹے چبھونے لگی۔

عید کے ایک ہفتہ بعد انگریزی مہینہ ختم ہوا تو اس کی تنخواہ بھی مل گئی۔ سبطین نے حساب کیا، تنخواہ کا پیسہ اور ابا کے اکاؤنٹ میں سے لایا ہوا، اس کا اندوختہ ملا جلا کر اس کے پاس تقریباً پانچ ہزار روپے تھے۔ اسے بڑا اطمینان سا ہوا، اسے لگا اب فی الحال کوئی مسئلہ نہیں ہے، خود کو سمیٹا جا سکتا ہے اور اپنے اصل کام کی طرف متوجہ ہوا جا سکتا ہے۔۔۔۔۔ وہ ادھوری تصویر۔۔۔ اس نے سوچا اب اسے مکمل کر ہی لیا جائے۔ بس کل ہی۔۔۔۔ مگر دوسرے دن سوال یہ اٹھا کہ یہ کاروبار مصوری کہاں پھیلایا جائے۔ دو کمرے کا اس نے مکان لیا تھا، ایک کمرے میں ابا اماں دوسرے

میں وہ اور اس کی بیوی، بیوی کو پہلی ولادت ہونے والی، عورتوں نے شاید بتا دیا تھا کہ اس مرحلے میں عورت کو خوش رہنا چاہیے، سو جب وہ بیوی کے کمرے میں جاتا تو بیوی یا تو رومانٹک ہو جاتی یا ہنسنے ہنسانے کی بات کرنے لگتی، اس نے مناسب نہیں سمجھا کہ اسے خموش کر دیا جائے اور کمرے میں کاروبار مصوری پھیلا دیا جائے۔

ابا کے کمرے میں تو ابا بھی اور اماں بھی، وہ چپ ہوتے تو یہ بولتیں۔

تصویر ادھوری کی ادھوری ہی رہی، پھر بھی وہ ہمت نہیں ہارا تھا، اسے پورا یقین تھا کہ وہ خود کو سمیٹ لے گا، اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ ٹیوشن بڑھا دے گا اور مکان بدل لے گا۔ کم از کم تین کمرہ اشد ضروری تھا۔

ارادہ، عمل اور نتیجے کے تکون پر ابھی وہ کھڑا ہی ہوا تھا کہ اسٹرائک ہو گئی۔ اس کی سن گن کچھ پہلے بھی مل رہی تھی، مگر رمضان عید اور بینک ڈاکٹر وغیرہ کے چکر میں وہ اس لمحے کو بالکل فراموش کر بیٹھا تھا، اب جو اچانک فیڈریشن کی مجلس عاملہ کے اس فیصلے کی خبر ملی تو اس کے تو گویا ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے مگر وہ کیا کر سکتا تھا۔۔۔ اسٹرائک ہو گئی اور تین ماہ کھنچ گئی۔

سبطین اپنی تنخواہ کا بچا ہوا جو پیسہ باپ کے اکاؤنٹ میں سے نکال لایا تھا، پہلے وہ ختم ہوا، پھر باپ کے سیونگ اکاؤنٹ اور پی ایف کی باری آئی۔ آخر ہوتے ہوتے صورت حال یہ ہو گئی کہ بیوی کی ولادت سے ایک ہفتہ پہلے گھر میں سو روپیہ بھی نہیں تھا۔

وہ تو حسنِ اتفاق کہ ضرورت سے چند دنوں پہلے اسٹرائک ختم ہو گئی اور تین ماہ کی تنخواہ یک مشت مل گئی، سبطین نے سوچا کہ ساری احتیاط تو برت ہی لی گئی، دوا اور غذا میں بھی کوئی کمی نہیں ہونے دی گئی ہے تو اب کیا ضروری ہے کہ آپریشن کی ضرورت پڑے۔ اس نے اندازہ لگایا کہ اگر ہزار ڈیڑھ ہزار روپئے میں یہ معاملہ نپٹ جاتا ہے تو اس کے پاس کم از کم ڈیڑھ دو ہزار تو ضرور ہی بچ رہیں گے۔ پھر اس نے جوڑا: ڈیڑھ دو ہزار یہ اور فیڈریشن سے حکومت کے وعدے کے مطابق ڈی اے اور انٹریم ریلیف کا بقایا کم از کم ساڑھے تین ہزار۔ اسے یہ سوچتے ہوئے بہت اچھا لگا کہ تقریباً پانچ ہزار اس کے پاس بچا ہوا رہے گا۔ اسے گمان ہوا شاید اب اپنے حساب سے جینے کا سمے آ گیا، اسے یقین تھا کہ وہ بالآخر خود کو سمیٹ کر اصل کام کی طرف متوجہ ہو سکے گا، چند دن ہوئے پھر ایک رسالے نے درخواست کی تھی تو سبطین نے سوچا تھا کہ وہ ادھوری تصویر مکمل ہو جاتی

تو اسے ہی بھیج دیتا۔

مگر موقع کہاں ملا؟ اسٹرائک ختم ہونے کے بعد نئی مصروفیتیں شروع ہوگئیں اور ان سے ابھی نجات بھی نہیں ملی تھی کہ ہسپتال کی دوڑ شروع ہوگئی۔۔۔۔ نارمل ڈلیوری بھی ہوتی ہے، تب بھی کم از کم تین چار دنوں کا چکر تو رہے گا ہی!

سبطین نے ہسپتال کے ورانڈے سے باہر دیکھا، بادل گھر آئے تھے، ہلکی ہلکی بوند پڑنے لگی تھی، ابھی شام نہیں ہوئی تھی پھر بھی ہسپتال کی چہار دیواری کے اندر لگے پھول کے پودے اشوک اور سرو کے درخت، دائیں سمت بنی لوہے کی بینچ اور بائیں طرف نرسوں کے کوارٹر۔۔۔۔ سب موسم اور ماحول کی دھند میں کھوتے چلے جارہے تھے،'' شاید چشمے پر پانی کی پھوار پڑ گئی ہو''۔ سبطے نے اپنا چشمہ صاف کیا، سامنے کا سارا منظر پھر بھی دھندلا ہی رہا، اسے لگا آنکھ میں کچھ کنکری وکری چلی گئی ہے۔ اس نے جیب سے رومال نکالا، آنکھیں صاف کیں، رومال میں نمی جذب ہوگئی تھی اور فضا میں چاروں طرف نمی سی تیر رہی تھی۔ اسی پل اس کی ماں اس کے پاس آئی:'' کیا سوچ رہے ہو؟''

'' جی۔۔۔۔ جی کچھ نہیں۔۔۔۔ کچھ بھی نہیں''۔

ماں ابھی اس کے پاس سے ہٹی بھی نہیں تھی، کہ ایک نرس اس کے پاس آئی!'' ڈاکٹر صاحب آپ کو بلا رہی ہیں''۔

'' دیکھئے بچہ الٹا ہے آپریشن کرنا ہوگا۔۔۔۔ دستخط کر دیجئے''۔ ڈاکٹر کی آواز بہت دور سے سنائی دی، اس نے ایک سحر زدہ کی طرح کاغذ پر دستخط کر دیا۔

ڈاکٹر آپریشن تھیٹر کی طرف جارہی تھی تو اچانک سبطے کو خیال آیا:'' آپریشن کا مطلب کم از کم چار ساڑھے چار ہزار کا خرچ!''

اسے اپنی بنائی ادھوری تصویر یاد آئی، چہرہ تو وہ بنا چکا تھا۔۔۔۔ موسم دھند میں کھویا ہوا تھا، آسمان پر بادل کا کوئی ٹکڑا نہیں تھا۔

تقریباً ۴۵ منٹ بعد نرس نے سبطین کو اس کا بیٹا دکھایا۔۔۔۔ بیٹا اس کی اپنی سوچی تصویر کے مطابق نہیں تھا۔۔۔!

☆☆☆

آشوب

''ہیلو مسٹر احمد کچھ سنکوچت دکھائی پڑ رہے ہیں؟''

نہیں مسز ورما۔ کوئی خاص بات نہیں۔ بس یونہی..... مسٹر ورما کہاں ہیں؟''

''وہ تو کلب گئے۔ آپ نہیں گئے؟''

''نہیں۔ آج ذرا کچھ دوسرے کاموں میں الجھ گیا تھا''۔

ضوریز احمد کو آفیسرس کوارٹر کی بالکونی پر تنہا دیکھ کر مسز ورما اپنی حیرت نہیں چھپا سکیں کیوں کہ ضوریز احمد کچھ زیادہ ہی مجلسی آدمی تھے۔ ایسا مجلسی آدمی تنہا اور اداس نظر آئے تو حیرت فطری ردعمل ہے۔

مگر ضوریز احمد بھی کیا کرتے۔ آج مدتوں بعد انہیں اپنا پور پور یاد کے شکنجے میں جکڑا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

ویسے سچ پوچھیئے تو اب ضوریز احمد کو کچھ یاد کرنے کی فرصت کہاں تھی۔ دن بھر دفتری کاموں کی بھیڑ شام میں بہت تھوڑی دیر بال بچوں کے ساتھ گپ شپ پھر کلب، کلب سے لوٹ کر ایک دو ٹی وی سیریل، ایسی تھکاوٹ طاری ہوتی تھی کہ پھر گویا تن بدن کا ہوش بھی نہیں رہتا تھا، صبح اٹھتے اٹھتے سورج نکل ہی آتا تھا، نہا دھو کر ناشتے وغیرہ سے فارغ ہوتے ہوتے کوئی ضرورت مند، نہیں تو کوئی کلینگ یا پھر کبھی پے در پے فون۔

ڈرائیو ضوریز احمد کی ہدایت کے مطابق ہارن بجاتا تو اسے یاد آتا۔ دفتر کا وقت ہو گیا۔ دفتر ہی میں آج وہ کچھ ڈسٹرب ہو گیا تھا۔

نیچے سے بڑھائی ہوئی فائل پر اچانک نگاہ پڑی اور وہ چونک گیا: ''اچھا آج ہی رات!''

اس نے بلا وجہ ہی سب کام جلدی جلدی نپٹائے اور چپراسی سے کہا: "ڈرائیور سے کہو گاڑی نکالے۔" وہ فلیٹ پر وقت سے کچھ پہلے ہی لوٹ آیا۔ مگر اس سے کیا۔ وقت اور چیزیں تو ایک انداز سے چلتی ہیں۔ ہوائی جہاز سے سائیکل تک۔ کسی کا بھی اچانک تو رخ موڑا نہیں جا سکتا۔

بیوی ابھی شاپنگ یا آؤٹنگ سے لوٹی نہیں تھی بڑا بیٹا الائیڈ میں کامیاب ہو کر اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ احمد آباد میں تھا، چھوٹا DPS میں زیر تعلیم تھا، بس بچ گئی بیٹی تو اس کی دنیا تو ایزل برش اور رنگوں میں سمٹی ہوئی تھی۔

وہ صوفے پر نیم دراز ہوا تو کئے پھٹے چہروں اور مناظر کی ایسی یلغار شروع ہوئی کہ وہ اونگھ گیا۔

کیا بات ہے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟" اچانک اسے کاندھوں پر کسی کے ہاتھوں کا لمس محسوس ہوا اور وہ چونک سا گیا۔ بیوی شاید ابھی لوٹی تھی۔

"آں.... ہاں.... نہ..... ہاں ہاں ٹھیک ہوں.... بس ذرا جھپکی سی آ گئی تھی۔"

"اٹھیے، منہ ہاتھ دھو لیجیے، میں چائے بنواتی ہوں"۔ بیوی بہت ہی پر تکلف انداز میں کہتی ہوئی اندر چلی گئی۔

ڈرائیور سے کہو۔ گاڑی نکال لے"۔ ناشتے کے اختتام پر بیوی نے نوکر سے کہا تو ضوریز احمد نے نوکر کو اشارے سے روک دیا" نہیں آج کلب کا موڈ نہیں ہے"۔

پھر ضوریز احمد کمرے سے نکلے تو بالکونی کے راستے کہیں اور چلے گئے۔ شاید کچھ زیادہ دور، گھر لوٹتے لوٹتے دیر تو ہونی ہی تھی۔ ضوریز ابھی مغل پورہ کے پاس ہی تھا کہ مغرب کی اذان ہونے لگی، ضوریز کے قدم اور تیز ہو گئے۔" اماں انتظار کر رہی ہوں گی....."

اسے یاد آیا۔ چراغوں کے لیے روئی کی بتیاں اس نے بنالی تھیں۔ اب اماں ماچس اور تیل لیے اس کا انتظار کر رہی ہوں گی اور ہاں۔ دو چراغوں میں تو گھی پڑے گا۔

برسوں سے یہی ہوتا آیا تھا۔ گھر میں کوئی لڑکی نہیں تھی، بہنیں تو چار چار پیدا ہوئیں مگر ایک کے سوا کوئی بچی نہیں.... اور وہ ایک بہن.... اس کو ضوریز نے بس ایک مرتبہ دیکھا تھا۔ اماں نے بتایا تھا کہ وہ اس سے پندرہ برس بڑی تھیں۔ وہ جب پانچ برس کا تھا تو ان کی شادی ہو گئی اور وہ اپنے میاں کے ساتھ پاکستان چلی گئیں، پھر وہاں سے سعودی عرب اور پھر سعودی عرب سے

امریکہ، دس سال ہوئے ایک مرتبہ وہ آئی تھیں، چند دن رہیں پھر روانہ، اور باقی تین بہنیں تو بچیں ہی نہیں، بھائی بھی چھ تھے مگر بچے صرف تین، ضوریز نے اس وقت میٹرک نہیں کیا تھا، صہیب ساتویں کلاس کا طالب علم تھا اور خاور دوسری کلاس میں۔

اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کی چچازاد بہن شہیرہ مزار کے احاطے میں داخل ہو رہی تھی۔ ضوریز نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا۔ ساٹن کا خوش نما بیل بوٹے والا گھیر دار فراک پہنے ہوئے شہیرہ اسے اچھی لگی مگر اس نے جلدی سے نظریں پھر لیں.... اونہہ.... بے ایمان!

دراصل دو ہی دن پہلے تعلیمی تاش کھیلتے ہوئے دونوں کا جھگڑا ہو گیا تھا۔ ہوا کیا کہ ضوریز نے ت سے توتا بنایا اور اس پر شہیرہ اکڑ گئی کہ ط سے طوطا ہوگا۔ اب ضوریز لاکھ سمجھاتا کہ ت اور ط دونوں سے طوطا ہوسکتا ہے مگر وہ تو بالکل بے ایمانی پر تل گئی تھی۔ ''ہم سات جنم نہیں بولیں گے۔ آئی ہے تو آوے'' ضوریز نے پکا ارادہ کیا اور چراغ جلا کے فاتحہ پڑھنے لگا۔

شہیرہ چراغ جلا کے کھڑی رہی۔ ضوریز کا جی چاہا کہ فاتحے کو لمبا کردے، سورہ مزمل تو ابھی ایک ہفتہ ہی ہوا، اس نے یاد کی تھی.... مگر پھر خیال آیا کہ صہیب وہاں پھلجڑی لیے بھن بھن کر رہا ہوگا اس لیے اس نے فاتحہ مختصر کی اور جب وہ دعا مانگ کر چلنے لگا تو شہیرہ نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ ''لو کھاؤ گے؟ چنے کا حلوہ ہے۔'' شہیرہ ضوریز کو دیکھ نہیں رہی تھی، بس اس کا ہاتھ اس کی طرف بڑھا ہوا تھا۔ ایک لمحے کے لیے ضوریز ٹھٹھکا پھر آہستہ سے حلوہ لے لیا۔

چاند کی چودہ تاریخ کھلے آسمان کے نیچے سفید چہار دیواری سے گھرے احاطے میں سفید مزار پر بیلا اور چنبیلی کے سفید پھول۔ ضوریز کا سفید کرتا پجامہ، سفید ٹوپی اور چاند کی دودھیا سفید چاندنی۔ رنگوں کی بھی شاید اپنی زبان ہوتی ہے اور ہر رنگ شاید کچھ نہ کچھ کہتا ہے۔ شاید یہ سفید رنگ کہتا ہے۔ ہری اوم شانتی.... شانتی.... شانتی.... مگر وہاں شہیرہ بھی تھی..... ہرے رنگ کے ساٹن کا خوشنما بیل بوٹے والا گھیردار فراک پہنے.... اچانک ضوریز کو یاد آیا۔ حضورؐ کے روضے کے گنبد کا رنگ بھی ہرا ہے۔

اچانک شہیرہ اسے اور اچھی لگی۔

''پھلجڑی چھوڑو گی؟'' اس نے جیب سے نکال کر دو پھلجڑیاں اسے دیں۔ شہیرہ نے خوشی سے لے لیں۔ ''شہیرہ کیا کر رہی ہو بیٹا؟ جلدی آؤ۔'' چچی کی آواز سنائی دی۔ ضوریز بھی گھر

کی طرف لپکا صہیب میاں بے چینی سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔

ضوریز کے پہنچتے ہی صہیب کی چھینا جھپٹی شروع ہو گئی اور پورا آنگن رنگ برنگی روشنیوں سے جگمگانے لگا۔ پھلجھڑی، انار، رنگ برنگی ماچس،، سانپ ٹیبلٹ جس میں آگ دکھاتے ہی وہ سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا بڑھنے لگتا۔ آسمان تیری، چٹپٹیا، مہتابی صیب چاہتا تھا کہ سب وہی چھوڑے۔ ضوریز نے اماں کو پکارا "دیکھیے اماں منع کر رہے ہیں تو نہیں مانتا۔ ذرا سی ٹیڑھی ہوئی تو کمرے میں گھس جائے گی" اس وقت ابا گھر میں داخل ہوئے۔ صہیب تو بالکل سٹک ہی گئے۔ ضوریز نے بھی اپنے کو سنبھالنے کا پوز دیا۔

"تم مانتی نہیں ہو۔ ہر سال پیسے کی بربادی کرتی ہو"۔ ابا اماں کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

"تھوڑا سا منگا دیا ہے۔ ابھی تو سب بچے ہی ہیں"۔

"صحیح اور غلط کے درمیان ابھی سے فرق کرنا سکھاؤ"۔ کمرے سے ابا کی آواز آئی۔

اماں کچھ بولیں نہیں۔ وہ جانتی تھیں کہ ابا کو یہ ناپسند ہے مگر وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ ابا کا طریقہ اصلاح صوفیانہ ہے وہ آہستگی کے ساتھ طبیعتوں کی اصلاح کے قائل تھے۔

ضوریز جلدی ختم کرو۔ فاتحہ پڑھنے نہیں جانا ہے" جی ابا"۔ اب ابا سے وہ انکار کیسے کرتا؟

مگر اسے یاد آیا اس نے اسرائیل سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ۸ بجتے بجتے اس کے پاس چلا آئے گا اور پھر وہ، اسرائیل، فاخر، مظہر سب دوست املی آدم خاں جاتے جہاں گولہ داغا جاتا ہے۔ آتش بازی کا کیا زوردار اور دھواں دھار مقابلہ ہوتا ہے۔ الگ الگ محلوں والے اپنی اپنی پارٹیاں اور اپنے اپنے آتشی اسلحے لے کر آتے ہیں اور ان میں سب سے اہم "تو مرہا" ہوتا ہے۔ کیا اچھلتا ہے آواز کرتا ہے اور کبھی تیر کی طرح کبھی بگولے کی صورت یا تو سیدھ میں یا دائرے میں اچھلتا اور آواز کرتا کتنی تیزی سے اور کتنی دور تک جاتا ہے اور مرہا تو خیر بڑے چھوڑتے ہیں مگر وہ..... کرّی کرّی..... کرّی بھی اپنا زور کیا کچھ کم دکھاتی ہے؟

اتنی سی ننھی سی، بڑے ابا کی بیڑی کی شکل کی..... مگر فطرت میں ایسا فتور..... اسے ہنسی آ گئی۔

دراصل اسے ایک شب برات یاد آ گئی تھی۔ اس کے ایک چچازاد بھائی نے کرّی چھوڑی تو وہ محلے کے ایک بزرگ کے پیجامے میں گھس گئی۔ کیا شامت آئی تھی اس دن بھائی صاحب کی۔

بھائی صاحب بھاگے جاتے تھے اور چچا ان کا پیچھا کرتے جاتے.....اور گالیاں الگ.....ایک سے ایک نادر گالی۔ بڑے ابا کو خبر ملی تو انہوں نے ایک اور اعلان کر دیا۔ آنے دو اس کمبخت کو۔ آج ٹانگ چیر کے رکھ دوں گا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس رات بھائی صاحب بس چھپتے ہی پھرے۔ ان کی ساری شب برات غارت ہو گئی۔

''ابا''۔ ضوریز آہستہ سے ابا کے پاس گیا جو مصلے پر بیٹھے تھے۔ شاید ابھی سلام پھیرا تھا۔ کیا ہے''؟ ابا نے اسے دیکھا وہ چپ چاپ کھڑا رہا۔ کچھ بولا نہیں۔

''کیا بات ہے؟ بولو''۔ ابا ہلکے سے مسکرائے۔

''ہم اسرائیل، فاخر کے ساتھ فاتحہ پڑھنے جائیں؟''

''ہم سب سمجھتے ہیں۔ فاتحے کا بہانہ کیوں بناتے ہو؟ تم تو آتش بازی کا مقابلہ دیکھنا چاہتے ہو''!

''بس ابا۔ دور دور سے۔ اور تھوڑی دیر''

''بیٹا۔ طبیعت پر کنٹرول کرنا سیکھو''۔

''بس ابا۔ اس سال''۔ ضوریز باپ سے لپٹ گیا ابا ہنسنے لگے۔

''اس طرح کے وعدوں کا یہ تیسرا سال ہے''۔

ضوریز نے کان چھوا ''نہیں ابا اب کے ایک دم سچا وعدہ''

''اچھا جاؤ۔ مگر یہ بتاؤ کہ کتنے بجے لوٹو گے؟''

''بارہ سے ساڑھے بارہ کے بیچ ضرور''

''نہیں۔ بارہ تک ضرور لوٹ آؤ۔ بیٹا شب برات کی رات عبادت میں گزارنی چاہیئے''۔

''اچھا ابا۔ ٹھیک ہے''۔ ضوریز گھر سے سرپٹ بھاگا۔

پروگرام تو دراصل ساڑھے گیارہ یا زیادہ سے زیادہ بارہ تک ہی کا تھا۔ ابا سے اس نے اس لیے ساڑھے بارہ کہا تھا کہ وہ آدھ گھنٹہ تو کم کریں گے ہی۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ پونے آٹھ بجے تھے۔ پروگرام کے مطابق وہ پہلے خالہ جان کی طرف دوڑا، کل ہی وہ کہہ کر آیا تھا کہ چنے اور سوجی کا حلوہ میرے لیے الگ رکھ دیجیے گا۔ اور پھر وہ.....شب برات کی پربی۔ ابھی تو وہ بھی اس نے خالہ جان سے نہیں وصولی تھی۔ وہ بھاگم بھاگ خالہ جان کے یہاں پہنچا۔

''کہاں رہ گئے تھے؟اتنی دیر سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں''۔

خالہ جان نے اسے پیار کیا اور چنے سوجی کا حلوہ اس کے سامنے رکھ دیا۔ وہ اس کی پسند سے واقف تھیں کہ یہ لڑکا شب برات کی شام رات کیا دو تین دن بعد تک میدے اور گڑ کا حلوہ تو چھوتا ہی نہیں اور پھر تین چار دنوں کے بعد گڑ کا حلوہ بھی اس سے چھپا کر نہیں رکھا جا سکتا۔

''ہم جا رہے ہیں خالہ جان''۔ضوریز نے کچھ حلوہ کھایا کچھ جیب میں رکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''کھالیا''؟ خالہ جان نے پوچھا۔

''ہاں کھالیا''

''جھوٹ امی جھوٹ''۔ خالہ زاد بھائی بہن چلائے..... ''بھائی جان نے جیب میں رکھ....''

''چپ''!ضوریز نے جلدی سے دو کا منہ دبایا، تیسرے بھائی کو پیٹنے کی دھمکی دی اور چوتھی بہن کو آنکھ سے دھمکایا۔

لولو۔ پربی لے لو۔تم تو ہوا پر سوار رہتے ہو''۔ خالہ جان ہنستی ہوئی اس کے پاس آئیں۔

ضوریز نے جلدی سے پربی لی اور دوڑتا ہوا باہر نکل گیا، باہر لوگوں کی آمد و رفت مزارات پر جانے کے لیے شروع ہو چکی تھی اور سامنے شاہ جمعہ پیر کا مزار رنگ برنگے قمقموں سے جگمگا رہا تھا لیکن ابھی زیادہ تعداد بوڑھوں اور ادھیڑ عمر کے مردوں کی تھی اسے معلوم تھا کہ عورتوں اور جوانوں کی ٹولیاں تو املی آدم خاں میں آتش بازی کے مقابلے کے بعد تقریباً ساڑھے دس گیارہ کے درمیان مزارات کا رخ کرتی ہیں۔

ضوریز خالہ جان کے گھر سے نکل کر اس گلی کی طرف مڑ گیا جو اسرائیل کے مکان کی طرف جاتی ہے۔

گلی جب مڑتی ہے تو آدمی مڑتا ہے۔آدمی جب مڑتا ہے تو پچھلا موڑ پس دیوار ہو جاتا ہے اور پچھلا موڑ جب پس دیوار ہو جاتا ہے تو پچھلا منظر بھی پس پشت چلا جاتا ہے...ضوریز وقت کے رہوار پر سوار تھا اور وقت ہر منظر کو پچھلا منظر بناتا چلا جا رہا تھا۔

ضوریز کامیابی کی سبز پری کی تلاش میں گھر سے نکلا تو گھر اس کے لیے جادوئی سفر

میں چھوڑی ہوئی منزل بن گیا جسے پلٹ کر دیکھنے والا پتھر بن جاتا ہے، ضوریز پر تحرک اور ترقی کا ''پیر تسمہ پا'' سوار تھا۔ اب آفیسرس کوارٹر میں وہ کونڈہ، تیرہ تیزی، بارہ وفات اور شب برات کو کیا یاد کرتا؟ اردو پیپر آتا نہیں تھا۔ ملنے والے اس طرح کی باتیں کرتے نہیں تھے، بیویاں اس قسم کی باتیں یاد رکھتی ہیں تو اس کی بیوی خود ہی کونونٹ کی تعلیم یافتہ ریٹائرڈ جج کی بیٹی، باقی بچے اس کے اپنے بچے وہ تو خیر کبھی ماضی پسند رہے ہی نہیں اور پھر ویسے بھی ان کا ماضی کیا! ٹرانسفر یبل جاب کی وجہ سے چھوڑے ہوئے چند بڑے شہر، سرکلر روڈ، سرپنٹائن روڈ، فرینڈس کالونی اور سرکٹ ہاؤس ایریا میں بسے کچھ فلیٹس اور ان فلیٹس میں گزرا وقت..... جسے ابھی تک آنسوؤں کی نمی اور یادوں کی پھپھوند نے نہیں چھوا تھا۔

خود اس نے بھی ماضی کا استقبال بہت کم کیا، سچ یہ ہے کہ اس کا موقع ہی کب ملا، وہ تو آج دن میں نیچے سے بڑھائی فائل پر دستخط کرتے ہوئے یاد آیا...'' اچھا آج ہی رات..... آج ہی شب برات ہے؟''

ضوریز نے بالکونی پر سے اپنے چاروں طرف نگاہ کی: نزدیک و دور تک چاروں طرف خوب صورت سرکاری فلیٹس اور کوارٹروں کا ایک لمبا سلسلہ، ان فلیٹس اور کوارٹرس کے چاروں طرف چہار دیواری میں خوب صورتی اور سلیقے سے اگائے گئے خوب صورت پھولوں کا خوب صورت منظر، چیڑ، آشوک اور دیودار کے درخت فضا کے سکون و سریت میں اضافہ کر رہے تھے۔ سارا علاقہ میونسپلٹی یا کارپوریشن کی طرف سے لگائے گئے اسٹریٹ بلبس سے جگمگا رہا تھا۔ ہر فلیٹ اور ہر کوارٹر کا مین گیٹ بند تھا اور گھروں کے روشن دانوں سے ٹیوب کی دودھیا روشنی چھن چھن کر آ رہی تھی، بعض گھروں کے بعض کمروں سے نائٹ بلب کی ہلکی سبز روشنی رات کے زیادہ ہونے کا پتہ دے رہی تھی۔

ضوریز کو یاد آیا: شہیرہ نے اس دن سبز رنگ کا فراک پہنا تھا۔

ضوریز بالکونی پر کھڑا تھا۔ گھروں میں ٹی وی چل رہا تھا۔ شاید کوئی فلم دکھائی جا رہی تھی۔ فضا میں نغمہ تیر رہا تھا۔

''دن کو کھاؤ پیو، رات کو آرام کرو''۔

''بیٹا۔ شب برات کی رات عبادت میں گزارنی چاہیے''۔ ابا کی آواز سنائی دی۔

"کیا بات ہے؟ نصیب دشمناں طبیعت تو ناساز نہیں؟ آج آپ کچھ ڈسٹرب دکھائی دے رہے ہیں؟" اس نے شانوں پر بیوی کے ہاتھوں کا لمس محسوس کیا اور چونک پڑا۔ (بیوی خود کو Over Cultered پوز کرنے کے موڈ میں ہوتی تھی تو لکھنوی ہونے کا ثبوت دینے لگتی تھی)۔

"آں.... ہاں.... نہیں.... نہیں ٹھیک ہوں.... بس یونہی.... چلو آتا ہوں"۔ اب وہ نو بجے رات میں اپنے سے بھی کچھ زیادہ آزاد خیال عورت کو یہ بتا کر بھی کیا کر لیتا کہ "آج شب برات ہے"۔

بیوی کچھ دیر ٹھہری پھر اندر چلی گئی، ضوریز کچھ دیر بالکل خموش کھڑا رہا، پھر آہستہ سے جیب سے ماچس نکالی، ایک کاڑی جلائی، اپنا ہاتھ فضا میں بلند کیا اور آہستہ سے بدبدایا:

A tribute, a tockn gesture a sign of rememberance پھر کمرے میں آکر الماری کے اوپری حصے میں بہت دنوں سے رکھی جانماز نکال کر اس کی گرد جھاڑنے لگا۔ مگر ٹھیک اسی پل اسے خیال آیا:

"جلدی سوجانا ضروری ہے۔ کل ساڑھے چھ بجے منسٹر صاحب کے ساتھ ایئرپورٹ جانا ہے۔ قومی سطح کی ایک بڑی شخصیت کا استقبال کرنے!!"

☆☆☆

نجات.....کوئی نجات!

اندھیرا بڑھتا چلا آ رہا تھا۔۔۔

اس نے حوالات میں لوہے کے چھڑ لگے دروازوں سے باہر دیکھنا چاہا تو سارا منظر اندھیرے کی دھند میں کھوتا نظر آیا اسے کچھ دکھائی نہیں دے پا رہا تھا حوالات سے لگے ہال میں بیٹھے منشی اور کھڑے کھینی ٹھونکتے سپاہی، باہر لگی ٹیبل کرسیاں، کرسی پر اکڑوں بیٹھا داروغہ... یہ سب کچھ اس نے محسوس کیا اس نے پھر حوالات کے باہر نظر جمائی تو دھند کے درمیان سے عجیب گڈمڈ تصویریں ابھرتی دکھائی دیں.... پیٹ کے بل رینگنے والے کیڑے۔۔۔ کئی منھ والے بڑے بڑے خوفناک راکھشس..... بلبل جس کی دونوں ٹانگیں چیر دی گئیں، اس نے خوف سے گنگنا کر آنکھیں بند کرلیں اندھیرا بڑھتا چلا آ رہا تھا۔

اچانک حوالات کا دروازہ کھلا اور چار سپاہی اندر آئے اس کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی اس نے محسوس کیا وہ کانپ رہا ہے اپنے کو سنبھالنے کی ہر کوشش بیکار جا رہی تھی، اس نے ایک مرتبہ پھر سپاہیوں کو دیکھا، ایک کے ہاتھ میں ڈنڈا تھا.....وہ چاروں اسے گھورتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے اور وہ پیچھے ہٹ رہا تھا، پیچھے ہٹتے ہٹتے وہ دیوار سے ٹکرا گیا۔

''سچی بات بتا دے!'' ایک سپاہی پھنکارا۔

''کون سی بات بھائی؟'' اس کے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

بھائی کے بچے چالاکی مت کر''! دوسرے نے کالر پکڑ کر گردن پر مٹھیوں کا دباؤ دیا..... دباؤ بڑھتا گیا جیسے کوئی آنتوں کو کپڑے کی طرح نچوڑ رہا ہو۔

وہ بڑی طرح چھٹپٹانے لگا تو پہلے نے دوسرے کا ہاتھ ہٹا دیا اسے لگا جیسے کسی نے پتے

صحرا سے اٹھا کر اسے ٹھنڈے پانیوں کے چشمے کے نیچے بٹھا دیا ہو۔

''سیدھی طرح سے صحیح بات کیوں نہیں بتا دیتا؟''

''آخر کون سی بات یہ پوچھنا چاہتے ہیں؟'' اس نے جلدی جلدی لمبا لمبا سانس لیتے ہوئے سوچا۔

''ارے سالا مر جائے گا نہیں تو اگل دے'' تیسرے نے اسے دھمکی دی

اس نے پھر سوچا'' میں انھیں کیا بتا سکتا ہوں؟ مجھے بیچ راستے سے اٹھا لائے اور اب یہ بھی نہیں بتاتے کہ انھیں کس بات کا جواب چاہیئے نہ دوالا نے نکلتا نہ ان کے چنگل میں پھنستا۔ اسے خود اپنے آپ پر غصہ آیا۔

''بہت ڈھیٹ لگ رہا ہے یہ ایسے نہیں بتائے گا'' چوتھے کا لہجہ بہت خطرناک تھا۔

''بتائے گا تو اس کا باپ۔۔۔ما۔۔۔اچانک ایک سپاہی گالی بکتا ہوا اس پر چڑھ دوڑا اور اس سے پہلے کہ وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتا اس نے دونوں پیر میں اپنا سر پھنسا کر اسے گرا دیا اس کا بیلنس تو پہلے ہی گڑ بڑا چکا تھا سپاہی نے جھکائی دے کر چھوڑا تو سر کے بل گر پڑا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اچانک سر پر پہاڑ ٹوٹ پڑا ہو اور پھر اس سے پہلے کہ وہ سر پر ابھرنے والے گومڑ کو کم از کم ٹٹول پاتا وہی سپاہی اچھل کر اس کے سینے پر چڑھ گیا اور اس کے بال مٹھیوں میں پکڑ کر اسے گیند کی طرح ٹکرانے اور اچھالنے لگا، اور وہ بس پھٹی پھٹی بھیانک آواز میں چیختا رہا اور سب قہقہہ لگاتے رہے اور اسے گالیاں بکتے رہے۔

یہ سارا کچھ کتنی دیر تک چلتا رہا اسے یاد نہیں، اسے صرف اتنا یاد تھا کہ وہ شام میں چار ساڑھے چار کے آس پاس ہتھے چڑھا اور وہ جب اسے مرے چوہے کی طرح ایک کونے میں پھینک کر حوالات سے باہر نکلے تو ایک گاڑھا گندہ اور لجلجا اندھیرا اس کے چاروں طرف پھیل چکا تھا اور باہر کتے بھونک رہے تھے۔ اچانک وہ اچھل پڑا اور اس کی چیخ نکل گئی۔ پورا بدن پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا، چوٹ اندر اندر اسے اس طرح کاٹ رہی تھی جیسے نوچے بھبھوڑے جسم پر پروا کے جھونکوں کی مار..... بے بسی کے شدید احساس نے اس پر گریہ طاری کر دیا.....اچھلا تو وہ اس لئے تھا کہ کتے اس کا جسم چاٹ رہے..... حلق غلاظت اترنے کا احساس.....مگر بے ساختہ اچھلتے ہی درد کا احساس گھن پر غالب آ گیا اور پھر وہ بہت دیر تک بلک بلک کر روتا رہا۔ باہر کتے بھونک رہے تھے۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا قصور کیا ہے؟ دو گھنٹے کے لئے کرفیو ختم ہوا تو وہ اپنی بیمار بہن کی دوا لینے نکلا اور واپسی میں ان کی زد میں آ گیا..... کیا اسے کرفیو ختم ہونے پر بھی نہیں نکلنا چاہئے تھا؟ مگر بہن کی دوا جو ختم ہو چکی تھی، پھر انہوں نے کرفیو ختم ہونے کا اعلان کیوں کیا؟ آخر مجھ سے کس بات کا جواب چاہتے ہیں؟۔

اس کے پاس صرف سوالات تھے۔ وہ سوچتا رہا اور درد سے تڑپتا رہا۔

اچانک پھر حوالات کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور وہ خوف سے لرز پڑا۔ ''یہ آخر مجھ سے کیا کہلوانا چاہتے ہیں''۔

''کیوں بے؟ ہوش ٹھکانے آیا''؟ شکاری ٹارچ کا پورا فوکس اس کے منہ پر پڑا۔

''دیکھو لاٹ صاحب کی اولاد کو۔ کیسا آرام سے لیٹا ہوا ہے''۔

ایک سپاہی نے بوٹ سے اسے ایک ٹھوکر مارتے ہوئے کہا اور وہ بلبلا کر رونے لگا.....

دوسرے نے تڑاخ سے ایک جھانپڑ مارا۔ ''سالے بہت نخرہ ہم لوگ دیکھ چکے ہیں، بھومیکا مت باندھ...... سچی بات بتا دے''۔

''ارے کیا بتاؤں؟ خدا کے لئے کچھ بتائیے تو''۔ وہ بے ساختہ چیخ پڑا۔

''چیخ مت!'' ایک ہاتھ نے گردن دبائی تو اس کی آنکھیں نکل پڑیں''۔ لاش کا بھی پتہ نہیں چلے گا''۔

وہ ایک ٹک سامنے والے کو دیکھتا رہا..... قصائی کی چھری تلے قصائی کو دیکھتا جانور!۔

''بول! کرفیو کا النگھن کر کے تو چھپتے چھپاتے بینک پر بم مارنے جا رہا تھا نا''؟

نہیں..... نہیں..... نہیں! سپاہی کو ایک زوردار جھٹکے سے کنارے پھینک کر وہ چیخا.....

''خدا کی پناہ! ارے میں نے آج تک بم دیکھا بھی نہیں..... میں بے قصور ہوں سپاہی جی، میں نے کرفیو کا النگھن نہیں کیا، دو گھنٹے کے لئے جو کرفیو اٹھا اسی میں بہن کی دوا لینے نکلا تھا''۔ وہ عجیب انداز میں بولے چلا جا رہا تھا جیسے ذبح کیا ہوا جانور دم توڑنے تک نرخرے سے آواز نکالتا رہتا ہے۔

''ای سسرا ایسے نہیں مانے گا..... اس کو الٹا لٹکا کر اس کی ناک میں مرچ کا دھواں دو''۔

حکم دینے والا غالباً انسپکٹر تھا۔

اسے الٹا لٹکا دیا گیا، اس کی ناک اور آنکھ میں مرچ کا دھواں جاتا رہا اور اس کا حال

اب یہ تھا کہ کبھی وہ رونے لگتا، کبھی سسکیاں بھرتا، کبھی چیختا، کبھی دمے کے پرانے مریض کی طرح کھانستا، کبھی اس طرح چھٹپٹانے لگتا جیسے شعلوں میں گھرا آدمی، یا کسی پرشور دریا میں گر جانے والا آٹھ برس کا بچہ۔

اور اس سے ذرا پرے ہٹ کر بیٹھے لوگ کھینی ٹھونکتے رہے۔

ہوش آیا تو صبح ہو چکی تھی۔۔۔۔ وہ ایک کونے میں زمین پر پڑا ہوا کوٹھری کی چھت کو ایک ٹک تکے جا رہا تھا۔۔۔ عجیب بے کیفیتی کیفیت کا حصار۔۔۔۔ کوئی خیال، کوئی فکر، کوئی خوف، کوئی امید، کوئی احساس۔۔۔ نہیں کچھ بھی نہیں!۔

"ایسی کیفیت کیوں ہے؟" اس کے پاس صرف سوال تھا۔۔۔ جواب کوئی جواب۔!

اچانک وہ چونکا۔۔۔ ایک سپاہی حوالات کا تالا کھول رہا تھا۔۔۔ "پھر یہ جواب مانگیں گے"۔

یک بارگی تمام حسیات جاگ اٹھیں مگر فوراً ہی ہر احساس پر خوف کا احساس غالب آ گیا۔۔۔ "اب اذیت کی کون سی شکل باقی بچی ہے؟"

"چل بے۔ ایس پی صاحب بلا رہے ہیں"۔ سپاہی نے تالا کھولتے ہوئے زور سے ڈانٹ کر کہا وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور سپاہی کو تکنے لگا۔۔۔ کیا وہ چل سکے گا؟ مگر انکار کا مطلب۔۔۔"

"ابے الو کی طرح منہ کیا دیکھ رہا ہے؟ باہر چل!"

باہر ورانڈے میں۔۔۔ ایک ٹیبل اور اس کے گرد کئی کرسیاں۔۔۔ ایک شخص کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور باقی سب کے سب مودبانہ کھڑے ہوئے تھے، سپاہی نے اسے لے جا کر ٹیبل کے پاس کھڑا کر دیا۔

"تم کرفیو کے درمیان باہر کیوں نکلے؟" اس نے چونک کر کرسی پر بیٹھے ہوئے شخص کو دیکھا، وردی تو وہ بھی پہنے ہوئے تھا مگر اس کا لہجہ وردی والا نہیں تھا۔

"بینک لوٹنے والے کس گروہ سے تمہارا سمبندھ ہے؟" اسے حیرت ہوئی کیسی عجیب عجیب باتیں پوچھ رہا ہے یہ شخص؟

اس نے سوچا، اس کو ساری بات بتا دے، اس پر جو ظلم ہوا ہے سب بیان کر دے۔

مگر عین اسی وقت اس کی نگاہ سامنے اٹھ گئی، میدان میں کچھ بچے کھیل رہے تھے، اسے اپنا اکلوتا بچہ یاد آ گیا، پھر بیوی یاد آئی، پھر بہن یاد آ گئی۔۔۔ باجی کتنا پیار تھیں، پتہ نہیں کیسی

ہیں، میں تو ان سے کہہ کر نکلا کہ بس گیا اور آیا۔۔۔اس کا کہاں پتہ تھا کہ ایسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤں گا۔۔۔۔پتہ نہیں کسی کو خبر مل سکی یا نہیں؟ خبر کیسے ملے گی؟ پانچ بجے شام میں تو اسے تھانے لایا گیا، وہ کرفیو لگ جانے کا وقت تھا۔۔۔سب گھر کی طرف دوڑ رہے ہوں گے، اس کو کس نے دیکھا ہوگا؟۔

''حضور! کل سے یہی کر رہا ہے، تھکا کر رکھ دیا ہے اس نے، کوئی جواب ہی نہیں دیتا''۔

''مگر اس کا بیان تو ضروری ہے''۔

''جی سر'' سب نے ایک ساتھ ہنکاری بھری۔

''اور آپ لوگ کہہ رہے ہیں کہ جواب ہی نہیں دیتا۔ تو بیان کیسے لیجئے گا؟۔

''لے لیا جائے گا سر!'' وہی شخص بولا جس نے اس کی ناک میں مرچوں کا دھواں دلوایا تھا۔

وہ سر سے پیر تک کانپ گیا، جو کچھ اس کے ساتھ ہو چکا تھا اس کا تصور ہی رونگٹا کھڑا کر دینے والا تھا۔۔۔اور یہ۔۔۔یہ پھر اپنے مطلب کی باتیں اگلوانا چاہیں گے۔۔۔''

''بہر حال! قانون کے گھیرے سے بچ کر ہی چلنا چاہیئے''۔ ایس پی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''جی سر! اس کا تو خیال رکھا گیا ہے۔'' سب نے گندے گندے دانت نکال کر ہنستے ہوئے کہا۔

''آج اس کا چارج شیٹ کاٹ ہی دو۔۔۔کوئی لینے نہیں آیا؟'

نہیں سر۔۔کوئی نہیں آیا۔ لگتا ہے ارد گرد کے لوگ بھی اس سے ڈرے ہوئے اور پریشان ہیں۔

''کسی نیتا کا بھی فون نہیں آیا؟''

''نہیں سر!''

''حیرت ہے۔۔ویسے ٹھیک ہی ہے، تم لوگوں کو آسانی ہو جائے گی'' ایس پی نے مسکرا کر کہا۔

''جی سر!'' انسپکٹر کھلکھلا کر ہنسا۔

اس نے حیرت سے سب کچھ سنا مگر اسے یاد صرف اتنا رہ گیا کہ وہ ابھی پھر اس کا بیان لینے کی کوشش کریں گے، اس کا جوڑ جوڑ پھوڑے کی طرح دکھنے لگا، اسے لگا اب وہ مر جائے

گا۔۔۔جو کچھ ہوا وہی ناقابلِ برداشت۔۔۔۔اور اب پھر وہی سب کچھ۔۔۔اور اگر جیل چلا گیا تو مقدمہ۔۔۔ پرائمری اسکول کا ایک معمولی ماسٹر۔۔۔جیل جانے کا مطلب ہے سپنشن ۔۔۔ وہ کانپ اٹھا۔۔۔ سب بھوکے مرجائیں گے۔۔۔ اس کی نگاہ پھر سامنے میدان کی طرف مڑ گئی۔۔۔ بچے کھیل رہے تھے۔۔۔اسے پنا اکلوتا بچہ یاد آ گیا۔۔۔۔''

ایس پی کرسی سے اٹھ کر ٹہلتے ہوئے آگے بڑھا، سب اس کے پیچھے پیچھے تھے۔۔۔

جب وہ چلنے لگتا تو وہ سب چل پڑتے، جب وہ رک جاتا سب رک جاتے۔۔۔۔

اس نے اپنے چاروں طرف دیکھا۔۔۔ تین طرف کرسیاں۔۔ ایک طرف ذرا کھلا اسپیس!۔

سامنے تھانے کا عقبی دروازہ!

سامنے میدان میں بچے کھیل رہے تھے۔۔''ابا''۔۔۔اس کے بچے نے پکارا۔

''تم دوا لینے گئے تو کہاں پھنس گئے؟'' باجی کی آواز۔

''باہر مت جائیے۔ خدانخواستہ آپ کو کچھ ہو گیا تو ہمارا کیا ہوگا؟ بیوی کی سسکی۔

جیل جانے کا مطلب ہے سپنشن۔۔۔ عقبی درواز!۔

عقبی دروازہ۔۔۔ میدان میں کھیلتے بچے۔۔۔ ابا ابا۔۔۔ دوا لائے۔۔۔ باہر مت جائیے۔۔۔ عقبی دروازہ۔۔۔ بیان لے لیا جائے گا سر۔۔۔ چارج شیٹ کاٹ دو۔۔۔۔ عقبی دروازہ۔۔۔ عقبی دروازہ۔۔۔ دروازہ۔۔۔۔؟

اسے لگا کہ وہ چکرا کر گر جائے گا۔۔۔ ٹیبل کا سہارا لینے کے لئے ذرا آگے بڑھا۔

''ارے بھاگا'' اچانک ایک سپاہی چیخا۔

''دوڑو۔۔ پکڑو'' انسپکٹر پھٹی پھٹی آواز میں چیخا اور پھر خود بھی دوڑ پڑا۔

وہ بھاگ رہا تھا اور اس کے پیچھے پیچھے پورا تھانہ بھاگ رہا تھا۔

ایس پی صاحب بھی اچھل کر اپنی جیپ پر چڑھ گئے اور جیپ اس کے پیچھے دوڑ پڑی وہ دوڑ رہا تھا۔۔۔دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ جیسے کسی نے اسے پر لگا دیئے ہوں۔

وہ دوڑتے دوڑتے اچھلا اور کچھ اوپر اٹھ کر پھر سینے کے بل نیچے گر پڑا۔۔۔ گولی غالباً ایس پی صاحب ہی نے چلائی تھی۔

آگ کے گولے جیسی کوئی شئے اس کے اندر اترتی چلی جارہی تھی۔۔۔رگ رگ میں جلن اور تناؤ۔۔۔اس نے مڑ کر دیکھا، وہ چاروں طرف سے گھرا ہوا تھا، انسپکٹر اور ایس پی ریوالور تانے، اس کی طرف نشانہ لئے ہوئے چوکنا ہو کر بڑھ رہے تھے۔۔۔۔

"ہوشیاری سے۔۔۔بہت خطرناک ہے" ایس پی نے انسپکٹر کو کہا۔

"تمہارا کھیل ختم ہو چکا۔۔اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو" انسپکٹر نے دور ہی سے پکار کر کہا۔

اسے ہنسی آگئی۔۔۔آخری وقت میں شائد اس کی اوقات بڑھ گئی ہے۔۔۔مگر اس کے پاس جان کے علاوہ کیا ہے؟ اور جان بھی کیا؟ یہ تو لاش ہی اٹھائیں گے۔۔۔اس کی بند ہوتی آنکھیں نم ہو گئیں۔۔۔اس نے بڑی مشکل سے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔۔۔مگر آنکھیں تو اب بند ہونے کی راہ پر تھیں۔۔۔اسے بہت دور سے آتی آوازیں سنائی دینے لگیں۔۔اباابا۔۔ دوا لائے۔۔۔باہر مت جائیے!۔

دھند کی گہری چادر اس کے چاروں طرف تنتی چلی جارہی تھی۔۔۔اس نے مند مند آنکھوں سے دیکھا۔جوان اسے چاروں طرف سے رسیوں میں کستے چلے جارہے تھے۔

اسے کیا ثابت کیا جائے گا؟ فسادی؟ یا دہشت گرد؟

اگر وہ زندہ رہتا تو شاید اتنا تو ضرور ہی سوچتا۔۔۔!

☆☆☆

بچاؤ بچاؤ

میں عام زبان میں ایک مذہبی آدمی ہوں، داڑھی رکھتا ہوں، نماز پڑھتا ہوں، ماتھے پر نماز پڑھنے کا نشان بھی اب نمایاں ہو گیا ہے، کبھی کبھی لوگ تقاضہ کرتے ہیں تو مذہب کے حوالے سے تقریر بھی کر دیتا ہوں۔ کچھ مذہبی مضامین بھی چھپ چکے ہیں۔ روز کی محفلوں میں لوگ مذہب پر میری باتیں شوق سے سنتے ہیں۔

دراصل میں نے مدرسے میں مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے بعد کالج کی راہ لی اور اس راستے سے ہی معاش کی سبیل ڈھونڈھی اس لئے اب گویا میرے دو چہرے ہیں۔ ایک چہرہ سرکاری ملازم کا اور دوسرا اوسط مذہبی علم رکھنے والے بظاہر متشرع مسلمان کا۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ میں نے معاش کی خاطر کالج کی راہ لی تو کالج کے زمانۂ طالب علمی ہی سے ہندوؤں سے میری ملاقاتیں بھی رہیں اور دوستیاں بھی۔ کالج کے دنوں میں رمیش، راہل اور شنکر پرشاد میرے اچھے دوستوں میں تھے۔ راہل سے کالج کے بعد پھر میری ملاقات نہ ہو سکی۔ رمیش یو پی میں سرکاری نوکر ہے اور دو چار برس پر کبھی کبھی ملاقات ہو جاتی ہے۔ شنکر میرے ہی شہر کے ایک اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہے اور اب آر ایس ایس کا بہت سرگرم ممبر بن گیا ہے۔ جب بھی اپنے آبائی وطن جاتا ہوں تو اس سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ ہم دونوں جب ملتے ہیں تو کالج کے دنوں کو یاد کرتے ہیں اور کچھ ایک دوسرے کے بال بچوں کا حال پوچھتے ہیں۔

پھر نوکری کے سلسلے میں بہت سے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ان میں ایک تو جنسی دھر ہیں جن سے ملنے کو جی چاہتا ہے حالاں کہ کئی لوگوں نے کہا کہ وہ لالہ ہیں اور بڑے چتر ہیں لیکن میں جب بھی ان سے ملا تو لگا کہ یہ آدمی کہیں میرے اندر ہی ٹک گیا ہے۔ دوسرے ستیش جی ہیں

جن سے میں قریب ہونا چاہتا ہوں مگر وہ خود ہی ذرا ریز رو سے رہتے ہیں اس لئے ہر بار میں چاہ کر بھی ان کے اندر دور تک نہیں جا تا۔ اور تیسرے دوست ہیں ڈاکٹر سپتا نند پریمی صاحب۔ یہ مہاشئے میرے کالج کے دنوں کے ساتھی ہیں نہ ہی نوکری میں میرے کلیگ۔ ایک بالکل الگ سی صورتِ حال میں میرا ان کا سامنا ہوا اور پھر آہستہ آہستہ تعارف جان پہچان میں بدلا اور جان پہچان نے تعلق کا روپ دھارا، پھر پتہ نہیں کیسے اس تعلق میں یاد یا چاہت بھی شامل ہوگئی۔ حالاں کہ ان کے بارے میں بھی بھانت بھانت کی باتیں سننے کو ملیں۔ مگر میں جب ان سے ملا تو لگا کہ اس آدمی میں تو وہ سب کچھ نظر ہی نہیں آتا جو ان کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے۔ بہت دنوں بعد کسی کے آگے ان کا چرچہ چلا تو وہ آدمی خود بولا کہ ''پریمی جی برہمن ہیں'' تو اور حیرت ہوئی کہ یہ آدمی برہمن ہوتے ہوئے بھی چھوا چھوت کیوں نہیں کرتا؟

قصہ مختصر یہ کہ پریمی جی بہت آہستہ آہستہ مگر ستیش جی کی بہ نسبت زیادہ مضبوطی کے ساتھ میرے اندر جگہ بناتے گئے۔ سچ کہتا ہوں، ان سے بات کر کے ہر بار لگا ''یہ آدمی جیسا بھی ہو جھوٹا نہیں ہے۔''

تو جب پریمی جی کا فون آیا کہ ''حق صاحب۔ ہولی اب جا رہی ہے۔ بھینٹ ملاقات نہیں ہوگی؟'' تو میں تھوڑی دیر کے لئے گڑبڑا گیا۔ ہولی میں رنگ ونگ کا ایسا چکر رہتا ہے کہ میں دو تین دن گھر ہی میں دبکا رہتا ہوں۔

''ہولی کی بدھائی ہو۔ ملاقات کیوں نہیں ہوگی؟ آپ ہولی منالیں تو پھر ہم آپ ملیں گے''۔ میں نے بات ٹالنی چاہی۔

''نہیں ڈاکٹر صاحب۔ ہماری آپ کی ملاقات ہولی میں ہونی چاہئے''۔

''بھائی۔ کیوں اس سفید داڑھی کو رنگوانا چاہتے ہیں؟ آپ کا گھر جس علاقے میں ہے ادھر جا کر میں بچ پاؤں گا؟''

''ارے۔ آج کچھ نہیں ہوگا۔ آپ اطمینان رکھئے۔''

''ایسا؟''

''ہاں۔ بالکل ایسا!''

''تب جیسا آپ کا حکم، کس وقت آؤں؟''

''چھ بجے آیئے!''

''چھ بجے؟''

''ہاں ہاں۔ چھ کے آس پاس آیئے۔ میں نے اپنے گھر پر ایک ہاسیہ کوی گوشٹی کا پر بندھ بھی کیا ہے۔ کرشن چودھری، سنیل، ستیندر، سوم ناتھ سبھی رہیں گے۔ ڈی ایم صاحب نے بھی آنے کا وعدہ کیا ہے۔ آپ بھی آجایئے''۔

پریمی جی کا لہجہ میرے تئیں ایسا یقین بھرا تھا کہ میں انکار نہ کر سکا اور پونے چھ کے قریب روانہ ہو گیا حالاں کہ میں سوا پانچ اور ساڑھے پانچ کے درمیان نکلنا چاہتا تھا مگر عصر کی نماز سے فارغ ہوتے ہوتے کچھ لوگ آگئے اور ان کو نپٹاتے نپٹاتے دیر ہوگئی۔ بیچ میں بار بار خیال آتا رہا کیوں کہ میرے گھر سے پریمی جی کا گھر کم از کم تین چار میل کی دوری پر ضرور واقع ہے اور چوں کہ پورا علاقہ آبادی سے بھرا ہوا ہے اور موڑ پر موڑ کاٹتا ہے اس لئے ان کے گھر تک پہنچنے میں آدھ گھنٹہ لگ ہی جاتا ہے۔ میں سویرے اس لئے بھی نکلنا چاہتا تھا کہ پریمی جی کے گھر جانے کے لئے میل ڈیڑھ میل صرف ہندو علاقے سے گزرنا پڑتا ہے اور باوجودے کہ پریمی جی نے اطمینان دلایا تھا پھر بھی یہ اندیشہ تو بنا ہی ہوا تھا کہ آج ہی رات میں ہولی جلنے والی ہے تو اب اس وقت شام میں ہولی منانے والے ہولی کے پورے موڈ میں ہوں گے۔ مگر اب اتفاقات پر کس کا بس، دیر ہونی تھی ہوگئی۔

پریمی جی کے یہاں میں سوا چھ کے بعد ہی پہنچ سکا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی کھل اٹھے، سب دوستوں سے ملایا اور پھر کھانے پینے کا سلسلہ چلا۔ میٹھا، نمکین، پوری کچوری، پھل، کوی گوشٹی شروع ہوئی اور ختم ہوتے ہوتے ساڑھے آٹھ بج گئے۔ میں چلنے لگا تو سوم ناتھ بولے'' حق صاحب۔ آپ تو ادھر ہی چل رہے ہیں۔ چلئے میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں''۔

سوم ناتھ سے میری پہلی ملاقات تھی۔ بات چیت کے دوران وہ باجپائی کی حمایت میں بھی بول رہے تھے اور پی بھی رکھی تھی۔ جب انہوں نے ساتھ چلنے کا پروپوزل رکھا تو میں انکار نہ کر سکا مگر یہ بات کچھ عجیب سی لگی۔ میں پہلی ملاقات میں اتنی بے تکلفی کا عادی نہیں تھا۔ پھر بھی انہوں نے منہ کھول دیا اس لئے میں انکار نہ کر سکا۔

''کدھر چلنا ہے؟'' میں نے اسکوٹر اسٹارٹ کرتے ہوئے ان سے پوچھا۔

"آپ چلئے نا۔ میں بتاؤں گا" انہوں نے اسکوٹر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

میں چل پڑا۔ میں نے سمجھا تھا کہ میں جس راستے سے آیا ہوں اسی راستے میں کہیں یہ رک جائیں گے۔ مگر ایسا ہوا نہیں۔ کچھ دور چل کر سومناتھ بولے "دائیں مڑ جایئے" میں مخمصے میں پڑ گیا۔ مجھے سیدھے جانا تھا اور وہ دائیں مڑنے کو کہہ رہے تھے۔ سوچا یہیں کہیں آس پاس ان کا گھر ہوگا۔ جی میں ایک بات آئی۔ ان کو اتر جانا چاہیئے تھا۔ یہاں سے ٹہلتے ہوئے چلے جاتے"۔ مگر میں چپ رہا۔ اسکوٹر تو دائیں مڑ ہی چکا تھا۔ اس کے بعد صورت حال یہ ہوئی کہ سوم ناتھ جی بولتے رہے میں سنتا رہا، اور اسکوٹر مڑتا رہا۔ کچھ وہ مانو دھرم کی بات کر رہے تھے، کچھ باجپائی کی حمایت کا راگ الاپ رہے تھے، کچھ لالو پرشاد کے خلاف بول رہے تھے۔ ان کی بات سنتے رہنے کے درمیان میں کئی طرح کی کیفیتوں سے گزرا۔ کبھی لگتا یہ آدمی بی جے پی کا حمایتی ہے، پھر لگتا کہ N.D.A میں شامل پارٹیوں میں کسی کا حصہ ہے پھر وہ موضوع بدل دیتے اور بالکل صوفی سنت جیسی باتیں کرنے لگتے بیچ بیچ میں طبیعت الجھ جاتی۔ میں اور میری گاڑی دونوں اتنا موڑ کاٹ چکے تھے کہ میرا جانا پہچانا راستہ میرے لئے دھند میں کھویا منظر بن چکا تھا، سوم ناتھ لگاتار بول رہے تھے۔ بولتے بولتے انہوں نے پوچھا: لگتا ہے میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے؟" میں چپ رہا تو وہ بولے "آپ کبھی پارٹی میں بھی رہے ہیں؟" میں نے مختصر سا جواب دیا۔ "ہاں کمیونسٹ پارٹی میں تھا" سوم ناتھ چہک کر بولے "میری میموری مجھے دھوکا نہیں دیتی۔ میں نے آپ کو پارٹی والوں کے ساتھ ہی دیکھا ہے"۔

"آپ بھی کمیونسٹ پارٹی میں ہیں؟" میں اپنی حیرت نہ چھپا سکا۔

"میں تو اب سی پی آئی مارکسسٹ (مالے) میں ہوں"۔

اچانک اسکوٹر کا پہیہ سڑک پر پانی سے چھپے ایک گڈھے میں گیا اور اسکوٹر تقریباً اچھل پڑا۔ میں نے بڑی مشکل سے اسکوٹر کنٹرول کیا۔ اسکوٹر پھر آگے دوڑ رہا تھا اور میں سوم ناتھ کے جملوں کا قیدی تھا۔ باجپائی اچھا کر رہے ہیں۔۔۔ کانگریس کو لالو کا ساتھ نہیں دینا چاہیئے تھا۔۔۔ این ڈی اے والوں کو تو دھوکا ہو گیا۔۔۔ میں سی پی آئی مارکسسٹ لینسٹ میں ہوں۔۔۔"

سوم ناتھ نشے کی ترنگ میں تھے۔ مجھے لگا یہ آدمی ہر وقت پیے رہتا ہے۔ کسی وقت ہوش میں نہیں رہتا۔

تقریباً ۲۰ منٹ تک کئی طرح کے موڑ مڑنے اور موڑنے کے بعد ایک جگہ سوم ناتھ نے رکنے کا اشارہ کیا۔

''تو اب میں جاؤں؟'' سوم ناتھ جی اسکوٹر سے اتر گئے تو میں نے پوچھا۔

''نہیں۔ ذرا رکئے گا۔'' کہتے ہوئے سوم ناتھ سڑک پار کر کے سامنے ایک کچے مکان کے دروازے پر گئے اور دستکیں دینے لگے۔

''یا اللہ۔ اب کیا معاملہ ہے؟ انہوں نے پہنچانے کو کہا میں نے پہنچا دیا۔ اب یہ کیوں روک رہے ہیں؟''

میں نے سوچا اور خود کو بے بس سا محسوس کر کے اپنے اردگرد دیکھنے لگا۔ خالص ہندوؤں کا محلہ تھا، مسلمان کیا کوئی سکھ بھی کہیں پر نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی، سوا نو بج چکے تھے۔ ہولیکا دس کے بعد جلنے والی تھی، پوری فضا ہولی کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ لڑکوں کی ٹولیاں گیت گاتی ہوئی گزر رہی تھیں اور سب مجھے اجنبی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ ان کا اجنبی نگاہوں سے دیکھنا غلط بھی نہیں تھا۔ سوا نو ساڑھے نو کے درمیان ایک داڑھی والا مسلمان نما آدمی جب اسکوٹر کھڑا کر کے چاروں طرف دیکھتا نظر آئے گا تو شک ہونا واجب ہے، کیا پتہ کوئی فسادی۔۔۔ کوئی آتنک وادی۔۔۔ آئی ایس آئی ایجنٹ۔۔۔''

مجھے ہنسی آ گئی مگر پھر فوراً ہی ہنسی پر بریک لگ گئی۔

نشے میں دھت دولڑکے میرے اسکوٹر کے پاس آ کر رک گئے تھے اور نشے کے جھونک میں زمین آسمان کا قلابہ ملا رہے تھے۔ ایک بولا: ارے جانتا ہے یار۔ پرسوں مالتی ملی تھی۔ میں نے کہا: میری جان کہاں ہو آج کل۔۔۔ سرکس آیا ہوا ہے۔۔۔ چلو۔۔۔ تم کو گھما لاؤں۔ تو سالی پوز مارنے لگی۔ ہم کو تو پہلے ہی سے خبر تھی کہ آج کل۔۔۔ رنجیت پر لٹو ہو رہی ہے۔ سالا ہم کو بھی غصہ آ گیا۔ کہا ''سالی ہم کو پہچانتی نہیں ہے؟'' پورا شہر میرے ٹھینگے پر رہتا ہے۔ تو کیا سمجھتی ہے اپنے کو؟ دوسرے کو یہ ڈینگ شاید بری لگی۔ برا سا منہ بنا کر بولا بھتنی کے، کتا بھونکنے پر تو پاد دیتا ہے اور یہاں ڈینگ ہانک رہا ہے؟ اس پر پہلے کو غصہ آ گیا۔ اس نے دوسرے کا کالر پکڑ کر جو دھکا دیا تو وہ مجھ پر آ گرا اور میں اسکوٹر سے لڑھک کر منہ کے بل زمین پر گر پڑا۔

''سوری۔۔۔ سوری بھائی صاحب۔ پہلے کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ جلدی جلدی

میرے پیر چھونے لگا۔''

''کوئی بات نہیں ۔۔۔کوئی بات نہیں ۔۔۔''میں نے جلدی سے خفت بھری ہنسی کے ساتھ زمین پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''ارے مولبی صاحب ۔۔۔آداب ۔۔۔آداب'' دوسرے نے شاید سمجھ لیا کہ میں مسلمان ہوں۔

''ہیں ؟مولبی صاحب ؟ ارے ہاں مولبی صاحب ۔۔۔۔سلام ۔۔۔سلام۔۔۔ سلام وعلیکم''۔پہلا بھی دوسرے کی آواز سن کر چونکا،میری طرف غور سے دیکھااور پھر بالکل جوکر کی طرح جھک جھک کرآداب کرنے لگا۔

''آداب ۔۔۔آداب !'' مجھے ہنسی بھی آرہی تھی اور خوف بھی آرہا تھا۔''یہ سوم ناتھ نے کس چکر میں پھنسادیا؟خودتو گھر کے اندر چلا گیااور میں یہاں؟''

اسی سمئے سوم ناتھ کا چہرہ مکان کی ایک کھڑکی پرآ کرٹکا'' آپ جائیے حق صاحب۔۔۔ مجھے کچھ دیر ہوگی''

میں نے بے سوچے سمجھے کک ماری اورایکسلیٹر پر ہاتھ کادباؤ بڑھادیا۔مگر اسکوٹرآگے بڑھانے کے چکر میں پڑ گیا۔میں اس علاقے میں پہلی مرتبہ آیا تھا۔میرا اسکوٹر بھاگا جارہا تھا۔مگر راستہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

آتے وقت سوم ناتھ لگا تار بولتے رہے اوران کی بات سننے اور جواب دینے میں راستے کاذرا بھی دھیان نہیں رہا۔میں رک کرکسی سے راستے کے بارے میں پوچھنا بھی نہیں چاہ رہا تھا کیوں کہ اس سے ادھر والوں کواندازہ ہوجاتا کہ میں اس علاقے کا نہیں ہوں،اس لئے صرف اندازاً موڑ پر موڑ مڑتا رہا۔میں سوم ناتھ جی کے گھر سے ساڑھے نو بجے روانہ ہوا تھا۔اب دس بج چکے تھے۔ہولیکا کے جلائے جانے کاسلسلہ شروع ہوچکا تھا۔ہولی کے گیت زورزور سے گائے جارہے تھے۔جے جے کارکی آوازفضامیں گونج رہی تھی۔جہاں تک نگاہ کام کرتی وہاں تک ہندوشردھالوؤں کے جتھے کے جتھے اچھلتے کودتے خوشی مناتے نظرآرہے تھےاور میرا اسکوٹر دوڑ رہا تھااور میرے چاروں طرف رات تھی اور میرے من میں ایک عجیب قسم کی بے اطمینانی تھی۔۔۔رہ رہ کرایک ہی خیال۔۔۔میں بالکل ہندوؤں کے علاقے میں ہوں۔۔۔یہ اکھنڈ ہندو چھیتر ہے

۔۔۔آج ہولی کی رات ہے۔۔۔یہ ہندو علاقہ ہے۔۔۔''

خدا خدا کر کے بغیر سوچے سمجھے موڑ پر موڑ مڑتے مڑتے میں ایک ایسی سڑک پر پہنچ گیا جو میری جانی پہچانی سڑک تھی، میں اس سڑک پر کئی بار آیا گیا تھا۔

''مسلم ایریا تک پہنچنے میں یہاں سے پانچ سات منٹ لگیں گے''۔ دل میں ایک ڈھارس سی بندھی۔

اب میں پوری رفتار سے گاڑی بھگا رہا تھا۔

میں جب مسلم علاقے میں داخل ہوا تو گھڑی دیکھی ۔۔۔ساڑھے دس بجنے والے تھے۔ ساری دوکانیں بند ہو چکی تھیں، ہو کا عالم۔ سن سناٹا!

یاد آیا کہ اس علاقے میں ان دنوں مسلم کرمنلس نے بہت سر اٹھا رکھا ہے۔ چھوٹے بڑے تقریباً درجن بھر جرائم پیشہ لڑکوں کے نام مجھے یاد آ گئے ۔۔۔ پھر یاد آیا کہ ان سب میں بھی بنے میاں اور گلن خاں تو بہت خطرناک قسم کے کرمنل بن گئے ہیں۔ اس علاقے میں کئی قتل ہو چکے تھے کئی اسکوٹر چھینے جا چکے تھے، کئی لوگ سرِ شام لوٹے جا چکے تھے۔ کئی گھروں میں بنے میاں اور گلن خاں کے گرگے گھس کر زبردستی ڈاکہ ڈال چکے تھے۔ ایک ڈی ایس پی میری جان پہچان کا تھا اس نے ایک مرتبہ برسبیلِ تذکرہ بتایا تھا کہ پولس والے اس علاقے میں وردی پہن کر کبھی بھی تنہا آنے کو تیار نہیں ہوتے۔

اب میری گاڑی اور بھی زیادہ تیز رفتاری سے بھاگ رہی تھی۔ اور میری زبان پر ایک ہی دعا تھی ''یا اللہ! مجھے بنے میاں اور گلن خاں سے بچانا!''

☆☆☆

کب ٹھہرے گا درد اے دل!

شباہت کی آنکھوں میں نیند کا دور دور تک کہیں پتہ نہ تھا۔اور پھوپھی بچوں میں محو تھیں..... چھاجوں برستا پانی اور جنگل کی اندھیری رات.....''

''پھوپھی۔اب سو جایئے۔سب لوگ سو چکے''۔

''ارے بیٹی میں بخت ماری تو کب کی سو چکی ہوتی، پر بچے سونے دیں تب نا''۔

''پھوپھی۔شباہت آہستہ سے بولی۔''سب بچے سو چکے''۔

''ایں۔'' پھوپھی نے چونک کر بچوں کو دیکھا اور خود ہنس دیں۔دھت تیرا بھلا ہو، میری بھی مت ماری گئی۔''

پھر پھوپھی نے لحاف سر تک کھینچ لی.....شباہت کی آنکھوں میں نیند کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔

اس نے گھڑی دیکھی دس بج چکے تھے۔دسمبر کی آخری تاریخوں کی کٹ کٹاتی سردیاں اور اس پر بارش کا زور، شباہت نے کان لگائے چاروں طرف برف آلود ہوا کی سائیں سائیں اور زوردار بارش بجلی اور گرج کے ساتھ۔اس نے ہمت کر کے ذرا سی کھڑکی کھولی..... باہر چاروں طرف دور دور تک چھاجوں برستا پانی اور جنگل کی اندھیری رات.....اس نے پھوپھی کی طرف دیکھا۔وہ نیند میں رو رہی تھیں۔شباہت نے ہڑبڑا کر کھڑکی بند کر دی اور لحاف کے اندر گڑمڑا کر دوہری ہوگئی۔خوف کی ایک تیز لہر اس کے رگ وپے میں دوڑنے لگی تھی پتہ نہیں نیند میں رونے والے کے اندر سے جو دوسرا آدمی نکل آتا ہے اس کی کیا جون ہو۔اس نے آنکھیں بند کر کے بے خیال ہونا چاہا تو پھوپھی کی آواز سنائی دی۔چھاجوں برستا پانی اور جنگل کی اندھیری رات!

اور پھر تمام رات وہ سو نہ سکی۔

ذرا سا نیند کا ایک جھونکا آتا اور پھر جیسے چونک کر وہ جاگ پڑتی۔ رات بھر بھیانک خواب اسے پریشان کرتے رہے۔ ایک نئی سجائی دلہن، ایک لاش کے پاس۔ پھر اس لاش اور سجی سنوری دلہن کے چاروں طرف آگ کے بلند شعلے، وہ چونک کر جاگ پڑتی۔ درود پڑھ کر اپنے کو دم کرتی۔ اٹھ کر بچوں کو دیکھتی۔ پھر ہواؤں پر کان لگاتی۔ وہی چھاجوں برستا پانی..... پھر کسی طرح سونے کی کوشش کرتی..... نیند کا ایک جھونکا۔ آگ میں گھری دلہن کا چہرہ..... پانچ برس کی معصوم بچی۔ بے تحاشا مار کھاتے ہوئے اور روتے ہوئے..... لبنان میں اپنے ماں باپ بھائی بہن کی بمباری میں جلی ہوئی لاشوں کے پاس بیٹھا ایک معصوم...... سجی سنوری دلہن لاش کے پاس خموش .... ایس او ایس! ساری رات سوتی رہی اور جاگتی رہی..... وہی چھاجوں برستا پانی اور جنگل کی اندھیری رات!

شباہت کبھی اپنے بارے میں سوچتی کبھی اس کے بارے میں۔ درد ایک ایسا جھرنا بن چکا تھا جس کا پانی ہوا کے جھونکوں سے چاروں طرف جھوم جھوم کر گرتا ہے۔ اسے پھر وہ یاد آئی۔ راگنی! اس کی دوست اور خود شباہت..... دونوں کا بچپن ایک ساتھ گزرا۔ ایک ساتھ میٹرک سے بی اے تک..... اور اب!

اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دے..... کیسا تڑپ کر اس نے دیکھا تھا۔ جیسے ڈوبنے والا آخری مرتبہ پانی کی سطح سے دنیا کو دیکھتا ہے۔

"انکل۔ اس کو بچا لیجیے انکل!"

"بیٹی، پرکھوں کی پرمپرا توڑنا بہت مشکل ہے۔"

"مگر اس کا قصور کیا ہے؟"

"تم خوش نصیب ہو بیٹی۔ ہم اس سلسلے میں بدقسمت ہیں۔"

وہ انکل کے کندھے سے لگ کر سسک سسک کر رو پڑی۔ سوال راجستھان کی راجپوت پرمپرا کا تھا۔ سب کچھ اس کے سامنے ہوا۔

راگنی کا شوہر اسے بہت چاہتا تھا۔ مرنے لگا تو خاص طور پر وصیت کی..... "راگنی کو ستی کرایا گیا تو میری آتما بے چین رہے گی"۔ مگر سوال بیٹے کی آتما کے بھٹکنے کا نہیں تھا..... سوال پرمپرا کا تھا۔ شباہت نے ری ایکٹ کیا تو راگنی کے پتاجی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا"۔ بیٹی تم مہمان ہو میں یہ

پسند نہیں کروں گا کہ یہاں کوئی بھی تمہارے ساتھ کسی قسم کی بدتمیزی کرے"۔

کبوتر حسرت سے دیکھتا رہتا ہے۔ اور چیل اس کا بچہ لے جاتی ہے۔

چھاجوں برستا پانی اور جنگل کی اندھیری رات!

ساری رات اسی عالم میں گزری۔ جانے وہ کب سوئی کب جاگی!

یہ اس رات کی واردات تھی جس رات راگنی نے عام معمولی لڑکی سے ستی ماتا تک کا سفر کیا!

جو کچھ ہوا وہ شباہت کے لئے انتہائی ناقابل برداشت تھا۔ اس لیے نہیں کہ راگنی اس کی دوست تھی بلکہ اس لیے کہ کچھ دن پہلے یہی دکھ اسے بھی دھجی دھجی کر چکا تھا۔ راگنی والا حادثہ اس کی "عدت" ختم ہونے کے ٹھیک تیسرے دن ہوا اور وہ اندر سے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی۔

"کاش راگنی شباہت ہوتی۔"

اس سمے اس کے اندر ایک بہت منہ زور خواہش نے سر اٹھایا تھا، مگر وقت تو اس کے ہاتھوں سے پہلے ہی پھسل چکا تھا۔ افسوس! اگر اس کا ذرا بھی اندیشہ ہوتا تو وہ راگنی سے زبردستی لکھوا کر رکھ لیتی۔ مگر اس کے شوہر کی وصیت نے اسے مطمئن کر دیا۔ اس کا کسے پتہ تھا کہ معاملہ شوہر اور بیوی کا نہیں دراصل سماج کا ہوتا ہے!

ایسی ہی اٹ پٹی فکروں میں دن پر دن بیتتے رہے۔ ہر رات بچوں کی ضد پر پھوپھی شروع کرتیں..... چھاجوں برستا پانی.....اور ہر رات شباہت کی نیند اچٹ جاتی اور ہر دن اوٹ پٹانگ فکروں میں بیت جاتا۔

اور تب کئی جاگتی راتوں اور سلگتی دوپہروں کے بعد ایک صبح عجیب سی بات ہوگئی۔ اس کا دیور انتخاب احمد بغیر پکارے اس کے کمرے میں چلا آیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اسے بڑا عجیب سا لگا۔ کسی کے بھی کمرے میں کوئی صبح سویرے بغیر پکارے نہیں جایا کرتا۔ اس نے بڑی حیرت سے پوچھا۔" ارے تم بغیر پکارے کیسے چلے آئے؟"

" آپ کے کمرے میں کوئی مرد تو نہیں!" انتخاب نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

یعنی شخصی آزادی کے لیے ضد کا ہونا ضروری ہے؟" اس کے من میں ایک عجیب سے سوال نے سر اٹھایا۔ اس روز تمام دن وہ بے چین رہی اور انتخاب کا جملہ بار بار یاد آتا رہا۔" آپ کے کمرے میں کوئی مرد تو نہیں!"

اور اس رات مہینوں بعد پہلی مرتبہ اس کا دھیان اپنی دیورانیوں کے کمروں کی طرف گیا۔ ان کے کمروں سے سرگوشیاں ابھر رہی تھیں..... بیچ بیچ میں بھنچی بھنچی ہنسی..... دسمبر کی سرد رات میں اسے شدید گرمی کا احساس ہو۔ ایسا لگا اس کے بدن پر چیونٹیاں رینگ رہی ہیں یا جیسے کسی نے دونوں کانوں کی لویں پکڑ کر زور سے مسل دی ہوں۔ اس نے ہڑبڑا کر لحاف بدن پر سے پرے پھینک دیا۔ اور تبھی پھوپھی کی آواز کی بازگشت سنائی دی۔

چھاجوں برستا پانی اور جنگل کی اندھیری رات۔"

اس کا جی چاہا کہ وہ پھوپھی سے پوچھے... مگر تبھی اسے یاد آیا کہ پھوپھی سو رہی ہیں۔

پھوپھی گہری نیند سوتی رہیں اور وہ جاگتی رہی اور رات رات بھر اوٹ پٹانگ خواب اسے پریشان کرتے رہے..... زندگی کے وہ سہانے دن جو انتساب احمد کے ساتھ بیت گئے۔ لپ چھپ کرتے آتے رہے اور جاتے رہے اور ایک عجیب سا رومانی حزن مسلسل اس کے چاروں اور جھوم جھوم کر برستا رہا۔ اٹھارھویں برس اس کی شادی ہوئی اور چوبیسویں برس وہ بیوہ ہو گئی۔ ان چھ برسوں میں انتساب احمد نے اسے ٹوٹ ٹوٹ کر پیار کیا۔ دونوں کے پیار کی نشانی، اس کے بچے سامنے پلنگ پر سوئے تھے اور وہ جاگ رہی تھی۔

شباہت کیوں جاگتی رہتی ہے؟ آخر اس کا مسئلہ کیا ہے؟ انتساب احمد کے والدین نے اسے اپنی مرحوم اولاد کی نشانی سمجھ کر ہاتھوں ہاتھ لیا۔ گھر میں جیسا دوسرے کھاتے ویسا ہی وہ کھاتی جیسا دوسرے پہنتے ویسا ہی وہ پہنتی۔ جن اسکولوں میں دوسرے بھائیوں کے بچے پڑھتے انہیں میں اس کے بچے بھی پڑھتے۔ جس کمرے میں وہ انتساب کے ساتھ رہتی تھی اسی میں انتساب کے بعد بھی رہی۔ سسرال اور میکہ دونوں جگہ سے ایک خاص رقم ہر ماہ اسے دی جاتی اور کوئی پلٹ کر اس کا حساب نہ پوچھتا۔ پھر وہ پریشان کیوں ہے؟ رات رات بھر کیوں جاگتی رہتی ہے۔ اس کی دھلی دھلی ہر صبح کسی نہ کسی طرح میلی کیوں ہو جاتی ہے؟

شباہت کے پاس سوال تو ہے مگر جواب نہیں!

اسے نہیں معلوم ایسا کیوں ہوتا ہے مگر ایسا ہو ہی جاتا ہے۔

اب اسی دن: پہلی جنوری کی صبح! سب نے اٹھتے ہی ہر سال کی طرح ایک دوسرے کو مبارک باد تو نہ دی۔ مگر دس بجتے بجتے دیورانیاں اپنے شوہروں اور بچوں کے ساتھ پلنگ پر ضرور

روانہ ہوگئیں..... نہ انہیں کسی نے روکا نہ اسے کسی نے کہا۔

"مگر بچے تو جا سکتے تھے؟"

کیا صرف عورت ہی نہیں، بچوں کے لیے بھی پورے گھر کی ضرورت ہے؟ اچانک اس کے اندر ایک بڑے ہی منہ زور اور سرکش جذبے نے سر ابھارا۔ اس نے بچوں کو تیار کرایا اور خود بھی تیار ہو کر جب کمرے سے باہر آئی تو ساس نے بڑی حیرت سے پوچھا۔ "کہاں جا رہی ہو بیٹی؟"

"آج پہلی جنوری ہے امی۔ بچوں کو ذرا گھما لاؤں!"

"نہ بیٹی نہ۔" ساس نے بڑی نرمی، محبت اور آہستگی سے اس کے کندھوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر کہا۔ "اچھا نہیں لگتا بیٹی؟"

"مگر عدت تو پوری ہو چکی۔"

"ہاں بیٹی۔ مگر سال ڈیڑھ سال ہم لوگوں کے یہاں اسے اچھا نہیں سمجھا جاتا"۔

پرکھوں کی پرمپرا توڑنا بہت مشکل ہے بیٹی!" راگنی کے پتاجی کی آواز آئی۔

شباہت ایسے تڑپی جیسے کسی نے زنگ آلود تلوار الٹی طرف سے اس کے پیٹ میں گھونپنے کی کوشش کی ہو..... پورے وجود میں سانپ کے زہر کی طرح پھیلتا اور دوڑتا درد..... اس نے بے تاب ہو کر صدیوں پر محیط ناقابلِ عبور دیوار پھاندنے کی تمنا کی..... کوئی ہے؟

اسے آج راگنی بہت یاد آئی اور پھر اس کے پتاجی' "تم خوش نصیب ہو بیٹی ہم لوگ اس سلسلے میں بدقسمت ہیں"۔ اس نے چھپٹا کر اپنے چاروں طرف دیکھا۔ جانے کیوں اسے شبہ ہو گیا کہ انکل اس کی تڑپ دیکھ رہے ہیں..... اس نے البم میں سے راگنی کی تصویر نکالی اور بہت دیر تک اسے دیکھتی رہی۔ پھر تصویر البم میں رکھتے ہوئے سوچا۔ "اب دو ٹوک فیصلہ بہت مشکل ہو گیا ہے!"

اور پھر یک بارگی بہت سی الجھنیں اور شائیں اس پر حملہ آور ہو گئیں۔ انتساب احمد کے انتقال کے بعد سارے فیصلے تو دوسروں نے کر ڈالے..... مگر اس سے پوچھا بھی جاتا تو وہ کیا کر لیتی؟ بیوہ ہونے کے بعد لڑکی کی وراثت ماں باپ کی طرف لوٹ جاتی ہے۔ کیا اسے بھی میکے لوٹ جانا چاہیے تھا۔ لیکن ماں باپ کتنے دن تک؟ ماں باپ کے بعد بھائی بھوجائی کا رویہ صحیح رہے گا۔ اس کی کیا ضمانت؟ تو گویا اسے سسرال میں ہی رہنا چاہیے؟ مگر سسرال میں اس کا کیا ہے۔ اس کا نہ سہی بچوں کا تو آخر یہی گھر ہے؟ مگر بچے تو محجوب ہو چکے؟ لیکن اگر دادا کے گھر سے بھی دور

ہو گئے تو مزید محرومی ان کی تقدیر بنے گی؟ مگر یہاں رہے تو ان کی حیثیت کیا ہوگی؟

سوالات چاروں طرف بکھرے پڑے تھے۔ مگر جواب کا کہیں پتہ نہیں تھا۔

وہ اپنے آپ کو مسلسل اندر اندر کاٹتی رہی۔

اس درمیان پاکستان سے خبر آئی کہ شائستہ باجی کی شادی ہوگئی!

شائستہ باجی شباہت سے دس سال بڑی تھیں۔ یہ خبر سن کر اچانک ایک عجیب سے خیال نے سر اٹھایا۔ شائستہ باجی کی شادی چونتیس برس میں ہوئی..... میں ابھی چوبیس برس کی ہوں' اور پھر فوراً ہی اندر سے جیسے کانپ گئی عجیب قسم کا بدن پر گندگی لگ جانے کا احساس یا غیر محرم کے آگے ستر کھلنے کی شرم..... اس لمحے میں اس کا اپنا آپ بھی اس کا غیر بن گیا..... چھی..... یہ میں نے کیسے سوچ لیا..... مگر سوچ پہ کس کا اختیار.....؟ بعد کے دنوں میں بھی شائستہ باجی اسے کئی بار یاد آئیں۔ مگر وہ کیا کر سکتی تھی۔ شائستہ باجی کی خبر کے بعد بھی تو اماں ابا کو وہ یاد نہیں آئی..... احتساب احمد کے انتقال کے بعد وہ صرف ایک مرتبہ موضوع گفتگو بنی۔ دونوں سمدھیوں اور سمدھنوں نے گفتگو کی۔ ابا اماں کو اپنی عزت پیاری اور ساس سسر کو اپنے بیٹے کی خریدی چیز کو سینت کر اور بچار کھنے کی فکر۔

وہ سسرال میں ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔ اور میکے والے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے روانہ ہو گئے۔

اماں مورے باوا کو بھیجو کہ ساون آیا ری.....؛

باوا تو آئے لیکن اسے لیئے بنا چلے گئے۔

اکیلے کوس گئی اماں دوئے کوس گئی میں، پردہ اٹھائی کے دیکھا نیروا بڑی دور..... نیروا بڑی دور..... اکبر کی جواں لاش پہ بیوہ کا وہ رونا۔

چھاجوں برستا پانی اور جنگل کی اندھیری رات!

اس رات اس نے خواب دیکھا۔

دو کشتی سمندری طوفان کی زد میں، ایک کشتی کچھ ہی دیر بعد الٹ گئی اور سمندر کے تھپیڑوں کی نذر ہو کر غرقاب ہوگئی..... مگر دوسری کشتی بھنور میں گھری ڈوبتی رہی ابھرتی رہی..... ابھرتی رہی ڈوبتی رہی۔ اس نے خواب ہی میں بے تاب ہو کر سوچا اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے..... مگر کشتی کی عجب قسمت۔ بھنور میں گھری چکر پہ چکر کھاتی رہی اور طوفان کا زور

بڑھتا رہا!..... کشتی اور بھنور۔ بھنور اور کشتی!

وہ چیخ کر جاگ پڑی.....اس کی چیخ سن کر پھوپھی بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں....." کیا ہوا بٹی؟ کیا ہوا؟"..... وہ کیا جواب دیتی وہ تو ابھی تک خواب کے سحر میں گرفتار تھی.....اور پھوپھی ....انتساب احمد کی پھوپھی، جنہیں شباہت کی تنہائی کے خیال سے اس کے کمرے میں سلایا جاتا تھا۔اپنا زمانہ یاد کر کے کپکپا گئیں۔

اور تب۔ اسی آسیب زدہ حالت میں شباہت نے پھوپھی کو دونوں ہاتھوں سے جکڑ لیا"۔

"وہ کہانی پوری سنایئے..... چھاجوں برستا پانی....."

بٹی بہت رات ہو چکی۔آج سو جاؤ کل سنا دوں گی"۔

"نہیں پھوپھی آج سنایئے۔وہ پھٹی پھٹی آواز میں چیخی۔

" اچھا اچھا سناتی ہوں۔دھیر دھرو۔دھیرج سے بیٹھو۔" پھوپھی نے گھبرا کر کہنا شروع کیا....." سوتا سنسار، جاگتا پاک پروردگار، سات سمندر پار ایک بادشاہ تھا اس کی سات بیٹیاں تھیں۔ایک رات کھانا کھاتے ہوئے بادشاہ نے بیٹیوں سے پوچھا

" تم سب کس کا دیا کھاتی ہو؟" چھ نے کہا " آپ کا دیا"۔مگر ساتویں نے کہا۔

" خدا کا دیا"۔

بادشاہ ساتویں بٹی کے جواب پر خفا ہوا اور اس اندھیری رات ہی میں اسے جنگل میں پھنکوا دیا۔ جب بادشاہ کے کارندے اسے جنگل میں چھوڑ کر آرہے تھے تو جھما جھم بارش شروع ہو چکی تھی.....ساتویں بٹی نے اپنے چاروں طرف دیکھا..... چاروں طرف چھاجوں برستا پانی اور جنگل کی اندھیری رات! پھر مدتوں اس جنگل میں سورج نہیں نکلا۔چاروں طرف چھاجوں برستا پانی اور جنگل کی......"

مگر پھوپھی، کب تک یہ پانی چھاجوں برستا رہے گا اور کب تک وہ لڑکی جنگل کی اندھیری رات سے جھوجھتی رہے گی"۔شباہت نے بے چین ہو کر بیچ میں ٹوکا دیا۔

" بٹی اب صبر۔" پھوپھی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کیا۔" بیچ میں مت بولو۔ جنگل کی اندھیری رات جس کی تقدیر بنتی ہے اسے جھوجھنا پڑتا ہی ہے بٹی..... شہزادی بھی جھوجھتی رہی....اور تب کرتا خدا کا یوں ہوا کہ ایک دن ایک شہزادہ اس کے جنگل میں آنکلا"۔

"مگر پھوپھی.....؟ شباہت نے پھر کپکپا کر ان کے ہاتھ پکڑ لیے....." اور جن کے شہزادے آ کر چلے گئے؟"

"امید بنائے رکھنے کے علاوہ چارہ کیا ہے۔ بیٹی؟ اس کے سہارے زندگی تو بیت جاتی ہے؟"

پھوپھی کی آواز میں پت جھڑ کے ان گنت موسموں کی ویرانی شامل تھی۔ پھوپھی کو بیس برسوں بعد خود ان کا اپنا آپ یاد آ گیا..... چھاجوں برستا پانی اور جنگل کی اندھیری رات.....وہ بھی تو بادشاہ کی ساتویں بیٹی تھیں۔ مگر ان کے اندھیرے جنگل میں تو پھر کوئی شہزادہ نہیں آیا۔"

پھوپھی۔۔کیا آپ نے؟ کبھی کوئی لو نہیں لگائی۔کوئی انتظار نہیں کیا۔"

"بیٹی، تیری تو زندگی پڑی ہے۔"

وہ اس وقت انتساب احمد کی پھوپھی نہیں تھیں

گھائل کی گت گھائل جانے۔

"ہم لوگوں کے یہاں اسے اچھا نہیں سمجھا جاتا"۔ اسے ساس کا جملہ یاد آ گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

"جنگل کی اندھیری رات میں شہزادے ایک ہی مرتبہ کیوں آتے ہیں پھوپھی؟"

"بیٹی، ہم ہی نا دروازہ بند کر دیتے ہیں!"

شباہت نے ایک مرتبہ پھر تڑپ کر پھوپھی کو دیکھا، اور بیک وقت دو کیفیتوں میں گھر گئی۔ پورے وجود میں سانپ کے زہر کی طرح پھیلتا اور دوڑتا درد.....صدیوں پر محیط نا قابلِ عبور دیوار پھاند لینے کی تمنا.....کوئی ہے؟ کوئی ہے جو اس کا انگوٹھا چوس لے؟ غیر محرم کے آگے ستر کھلنے کی شرم.....اس نے ہڑ بڑا کر اپنا چہرہ اپنے گھٹنوں میں چھپا لیا۔

اور تب اچانک ایک عجیب سی خواہش نے سر اٹھایا.....کاش وہ رانگنی ہوتی۔

وہ پور پور کٹ کٹ کر اپنے اندر اندر گر رہی تھی.....اور پھوپھی اپنے کٹے پھٹے ٹکڑے ٹکڑے وجود کو چن رہی تھیں اور سوچ رہی تھیں.....حاصل تو کچھ بھی نہیں.....وہی.....چھاجوں برستانی۔

اور شباہت کی آنکھوں میں نیند کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ وہی جنگل کی اندھیری رات! شہزادی جنگل کی اندھیری رات سے کب تک جھوجھتی رہے گی۔۔؟؟

☆☆☆

استعارہ

"عجیب بدتمیز لوگ ہیں۔" گھر میں داخل ہوتے ہوئے اس نے سوچا۔

خواہش تو ہوئی کہ وہ الٹے پیروں لوٹے اور ان سبھوں کو وہاں سے ہٹا کر ہی گھر آئے۔ مگر اسے لگا وہ بہت تھک گیا ہے۔ مارچ کا آخری ہفتہ بینک کے ملازمین کے لیے جان لیوا ہوتا ہے۔ اس نے دروازہ بند کرتے ہوئے ایک مرتبہ پھر سامنے نگاہ کی۔ وہ سب مصروف تھے۔ بیچ بیچ میں زور زور سے بحث یا قہقہہ!

کپڑا بدلتے ہوئے، منہ ہاتھ دھوتے ہوئے۔ کھانا کھاتے ہوئے..... بار بار اس کا خیال ان سبھوں کی طرف مڑ جاتا اور تبھی قہقہے تیر کی طرح دروازوں کے شگافوں سے اندر داخل ہو جاتے۔ پھر پتہ نہیں کس وقت وہ سب چلے گئے مگر اس رات وہ نیند آنے تک پریشان رہا۔ در اصل وہ ایسی باتوں کا عادی نہیں تھا۔ باپ اپنے زمانے کے مشہور قوم پرست، نہرو جی کی ماتحتی میں کام کیے ہوئے، اس کے گھر میں نظریات اور اصولوں کا بڑا چرچا رہا تھا، اور اب....."

نیند آنے تک وہ جانے کیا کیا سوچتا رہا اور بیچ بیچ میں زور زور سے بحث یا قہقہہ... جھما کہ ...فلیش بیک!

مگر دوسرے دن مین روڈ پر تھری وہیلر سے اتر کر کالونی میں داخل ہو کر دائیں بائیں دو موڑ مڑ کر جیسے ہی اپنے کوارٹر والی لائن سے ملحق سڑک پر آیا، اسے لگا کہ اس کے پورے تن بدن میں آگ لگ گئی.....کالونی کی ساخت کچھ اس طور پر تھی کہ کوارٹروں کی ہر صف کے سامنے ایک سڑک اور دو سڑکوں کے بیچ ایک پارک اس کے گھر کے سامنے جو پارک تھا اسی میں لگے ایک سایہ دار درخت کے نیچے......اس کا جی چاہا کہ وہ دوڑتا ہوا ان تک جائے اور ان کی گردن.....آخر ان

سکھوں نے سمجھا کیا ہے؟ کل تو وہ یہ سوچ کر چپ ہو رہا کہ یہ تو ہوا کی لہر ہیں، آج یہاں کل وہاں، نہ گھر نہ گھاٹ، نہ اٹکنارہ۔ ان کا کیا ٹھور ٹھکانہ کل کہیں اور جا بیٹھیں گے...... یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ دوسرے دن بھی یہیں آن بیٹھیں گے..... نہیں آج ان کو ہٹانا ہی ہوگا..... وہ تیزی سے آگے بڑھا..... پھر اچانک یوں رک گیا جیسے کرنٹ لگ گیا ہو..... ارے یہ بھی؟ ممدو بھائی کو کون نہیں جانتا؟ دو قتل اور کئی عدد ڈکیتیاں، مگر کیا مجال کہ پولس ہاتھ بھی لگا سکے..... ہر تھانہ انچارج سے یارانہ..... جب سیاں بھئے کوتوال..... اسے اپنے باپ کی نصیحت یاد آ گئی۔ کیچڑ میں ڈھیلا ڈالو گے تو کیچڑ اڑ کر تم ہی پر آن پڑے گی.....'' مگر یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی.....کوئی بھی ہو اگر چھوٹ دے دی گئی تب تو پورا ماحول چوپٹ ہو کر رہ جائے گا..... پھر ہماری کالونی اور پرانے شہر کے سلمس میں کیا فرق؟ مگر ممدو بھائی؟ ہچکچاہٹ یا شاید خوف کی ایک لہر سی اٹھی۔ پوری کالونی کا ٹھیکہ میں نے لیا ہے؟ مگر اسی کالونی میں تو میرے بال بچے بھی ہیں۔

ایک خیال دوسرے خیال کو کاٹتا رہا۔ اور وہ پیچ و تاب اور کشمکش کی لہروں میں ڈوبتا ابھرتا گھر پہنچا تو بیوی دیکھتے ہی کہنے لگی ''کیا بات ہے؟ طبیعت ٹھیک ہے؟'' ایسی باتوں کا کیا جواب ہو سکتا ہے؟ ٹال گیا۔ مگر اندر اندر جو بھونچال مچا ہوا تھا وہ بھلا کہاں کم ہونے والا تھا۔ ایک عجیب سی بے چینی، جی چاہتا کہ وہ دوڑتا ہوا جائے اور ان سکھوں کی جی بھر کے مرمت کرے...... کمبختوں کی اتنی ہمت کہ شرفاء کے محلے میں قدم جمالیں.....اور تبھی کاٹ چھانٹ کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو جاتا.....اس رات بھی گئی رات تک وہ بے چین رہا۔

اور تیسرے دن اس کی کیفیت اس شخص کی ہو رہی تھی جسے کوئی بلا وجہ ستون سے باندھ کر ماں بہن کی گالیاں دے.....''

وہ چاہنے کے باوجود صرف اس لیے احتجاج نہیں کر سکتا کہ ان میں ممدو بھائی بھی ہے۔ تف ہے ایسی زندگی پر..... ایسی ملازمت پر، اس سے بہتر تھا کہ تھانے کا سپاہی ہوتا..... آخر ممدو بھائی بھی تو آدمی ہی ہے؟ مگر اس نے جن لوگوں کا قتل کیا وہ بھی تو آدمی ہی تھے؟ اسی کی طرح طاقت ور تھے؟ تو پھر کیا ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہا جائے؟ اس کے تدارک کی کوئی نہ کوئی صورت تو نکلنی ہی چاہیے؟؟ وہ گھر جانے کی بجائے پڑوسی کے گھر کی طرف مڑ گیا: آپ لوگ تین دنوں سے یہ سب کچھ دیکھ رہے ہیں اور چپ ہیں؟''

''کیا ہوا بھئی؟ کیا بات ہے؟ بہت برافروختہ نظر آرہے ہیں؟''

''ارے آپ پوچھتے ہیں کیا ہوا؟ محلے میں جو ہورہا ہے اور آپ کو خبر ہی نہیں''۔

''محلے میں بس ہم آپ ہی بچے ہیں؟ کوئی ہمارے گھر میں گھس رہا ہے؟''

اب اس کے بعد ان سے وہ کیا گفتگو کرتا۔ دوسرے پڑوسی کی طرف مڑا۔

''بھائی محلے کا ماحول خراب ہورہا ہے۔ آپ لوگ کچھ کرتے کیوں نہیں؟''

''ارے جانے دیجئے۔ سب ہم قوم ہیں۔ دوسرے ڈرتے تو رہیں گے''۔

اسے لگا حلق تک غلاظت بھر گئی۔ وہ سرپٹ بھاگا۔ اسے گردھاری لال ٹکری وال یاد آئے۔

گردھاری لال جی نے بہت لپک کر اس کا خیر مقدم کیا۔'' صاحب میں تو بہت پہلے سے چیخ رہا ہوں کہ ایک محلہ سدھار کمیٹی ہونی چاہئے میں نے مہندر بابو..... وہی کھنی مرچنٹ..... ان سے بات بھی کی تھی..... وہ فنانس کرنے کو تیار تھے۔ مگر یہاں تو سماج سیوا کی کسی میں بھاونا ہی نہیں ہے، اچھا ہوا کہ کم از کم آپ کو تو خیال آیا، میں شرما جی اور سردار اقبال سنگھ سے بات کرتا ہوں۔ ان لوگوں کی پہلے سے خواہش ہے کہ میں اس کمیٹی کا ادھیکش بن جاؤں۔ مگر یہ الگ سی بات ہے۔ البتہ میں آپ کو سکریٹری بنانے کا سجھاؤ ضرور رکھوں گا''۔

اسے لگا وہ کچھ دیر اور وہاں ٹھہرے گا تو اس کا دم نکل جائے گا۔ مہیش پرشاد سنگھ سنتے ہی غصہ ہو گئے بگڑنے لگے۔'' اب مجھ سے کیا کہتے ہیں؟ آپ ہی لوگوں نے شری چورسیا کو میونسپلٹی الیکشن میں کامیاب کیا ہے؟ اگر آج آپ لوگوں نے مجھے نہ ہرایا ہوتا تو میں انہیں بتا دیتا''۔

اسے شری چورسیا یاد آئے، مگر وہ تو وارڈ کمشنر ہوئے، وائس چیرمین ہوئے پھر کسی بورڈ کے چیرمین ہو کر راجدھانی چلے گئے۔ اس نے گھر کی طرف مڑتے ہوئے دیکھا۔ آج تعداد میں بھی اضافہ ہو چکا تھا اور آواز بھی بلند تھی۔

''کون صحیح ہے؟''سوال کا جھکڑ جھور اندھیرا جھک آیا تھا اور جواب کا چاند کہیں نہیں تھا۔

ساری رات وہ اندھیروں سے جھوجھتا رہا۔ ساری رات بیہودہ قہقہے اس کے کانوں میں زہر آلود تیر کی طرح چبھتے رہے۔ وہ دو قدم چلتا اور پھر کسی گہری کھائی میں گر پڑتا۔ رات بھر وہ چونک چونک کر اٹھتا رہا۔ برے اور ڈراونے خواب۔۔۔ آخر اسی کے در پئے کیوں ہیں؟

اور کسی کے لئے یہ مسئلہ کیوں نہیں؟ اس نے اپنے آپ کو سمجھانا چاہا: ''یہ بہت چھوٹی سی بات ہے''۔ اس بات پہ ایک عجیب سے سوال نے سر اٹھایا: ''جیسے چھ سات فٹ کے لمبے آدمی کی کانی انگلی میں میلا لگ جائے؟'' دھت تری......وہ ناچ ناچ گیا.....وہ چکرا تا رہا، سر جھٹکتا رہا اور اژدہا بار بار پھنکارتا رہا۔ ساری رات کچھ عجیب سی بے چینی اس کے اندر سر پٹختی رہی.....ساری رات وہ جھوجھتا رہا!

دوسرے دن وہ ٹاؤن پریسڈنٹ سے ملا تو انہوں نے سمجھایا۔ ''دیکھئے اول تو یہ کہ ہماری کچھ مجبوریاں ہیں۔ ہر پارٹی والے اس قسم کے کچھ لوگوں کو اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ ممدو بھائی بھی ہمیشہ ہمارے کام آتا ہے۔ دوئم یہ کہ یہ ذمہ داری نائٹ پٹرولنگ پارٹی کے انچارج کی ہے۔ اسی سے رابطہ قائم کیجئے''۔

پٹرولنگ آفیسر کہنے لگا۔ ''محلے کا اندرونی علاقہ ہمارے بس سے باہر ہے۔ محلے کے کسی بااثر آدمی کو پکڑیے۔''

بااثر فرد مولانا صمصام الدولہ نے فرمایا۔۔

''نہیں صاحب، یہ لوگ ہماری ضرورت ہیں۔ آپ جیسے لوگ گھروں میں گھس جاتے ہیں۔ میدان میں تو ممدو بھائی اور اس کے آدمی ہی نظر آئیں گے۔''

وہ تھک ہار کر محلے کی طرف مڑا تو اچانک ممدو بھائی سامنے آگیا: ''صاحب محلے میں رہنا ہے تو ڈھنگ سے رہیے۔ لفڑا کیوں پھیلاتے ہیں؟''

دونوں پڑوسی گردھاری لال ٹیکری وال مہیش پرشاد سنگھ، ٹاؤن پریسڈنٹ، پٹرولنگ آفیسر، مولانا صمصام الدولہ۔۔۔اور کسے وہ یاد کرتا؟ ملاقات تو انہی لوگوں سے اس نے کی تھی۔

جو کچھ میں چاہتا ہوں وہ اتنا غیر ضروری اور بے معنی ہے؟ مور نے ناچتے ناچتے اپنا پیر دیکھ لیا۔ اسے لگا وہ تو بالکل ننگا ہے۔ پورے بدن میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ اس نے محسوس کیا۔ اس کے پیر تھرتھرا رہے ہیں، اس نے سوچا: ممدو بھائی مجھے دھمکا رہا ہے.....ممدو بھائی.....مولانا صمصام الدولہ اور ٹاؤن پریسڈنٹ کی ضرورت! وہ کیا کرسکتا ہے؟

''حد سے آگے بڑھیے گا تو خراب ہو جائے گا''۔

ممدو بھائی اسے ڈانٹ رہا تھا۔ سامنے اس کے آدمی زور زور سے قہقہہ لگا رہے تھے،

نبلے پر دہلا مار رہے تھے۔ گلاس میں ٹھرا یا کوئی شراب انڈیلی جا رہی تھی اور اس کے دروازے پر:
اس نے دیکھا کہ دروازے پر اس کی بیوی بیٹی اور چھوٹا سا بیٹا سبھی انتہائی خوف زدہ انداز میں اسے تک رہے تھے۔ خوف کی ایک تیز بھنور روپ لہر کے جال میں..... وہ اور اس کا پورا کنبہ لپٹا چلا جا رہا تھا۔۔ اس نے محسوس کیا جیسے سیلاب یا سمندری طوفان یا جنگل کی آگ اس کے اور کنبے کے گرد گھیرا ڈال رہی ہے۔

ایک مرتبہ پھر ..... دونوں پڑوسی گردھاری لال ٹیکری وال، مہیش پرشاد، ٹاؤن پریسیڈنٹ، پٹرولنگ آفیسر، مولانا صمصام الدولہ..... اسے سب یاد آئے...... ایک مرتبہ پھر اس نے دیکھا..... سامنے گھر کے دروازے پر ڈرا ڈرا کھڑا ہوا اس کا پورا کنبہ..... کسی شریر بچے کے ہاتھ میں سہمی ہوئی گوریا..... اور گھر کے ٹھیک سامنے نہلے پہ دہلا، گلاس میں ٹھرا یا کوئی شراب، بے ہودہ قہقہے..... آج تعداد میں اور اضافہ ہو چکا تھا۔ وہ تنہا تھا، اس کے سامنے ممدو بھائی کھڑا تھا اور اسے دھمکی دے رہا تھا۔

پہلے دن دو، دوسرے دن چار، آج چھ، آواز بلند، شراب کی بوتل.....

ممدو بھائی ۔۔۔ ٹاؤن پریسیڈنٹ ۔ صمصام الدولہ"۔ اس ایک پل میں..... ممدو بھائی اسے دھمکاتا رہا۔ اس کو اس کے پڑوسی، ٹاؤن پریسیڈنٹ اور مولانا صمصام الدولہ یاد آتے رہے اور اس نے دیکھا کہ وہ ایک پر شور سمندر میں گر پڑا ہے اور اسے بچانے والا کوئی نہیں۔

"زیادہ لفڑا پھیلاؤ گے تو وہ لونڈیا تمہاری ہے نا" ممدو نے دروازے کی طرف اشارہ کر کے کہا اور اسے ایسا لگا کہ کسی نے اس پر کراسن تیل چھڑک کر جلتی تیلی اس کے جسم پر پھینک دی۔ ایک سکنڈ کے سویں حصے میں ایک بونڈرسا اٹھا۔ بہتیرے عکس ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوئے۔ ایک زوردار بے شکل جھماکا...... بے آواز دھماکا........ اسے صرف اتنا یاد تھا کہ ممدو بھائی اسے دھمکا رہا ہے.........

"وہ لونڈیا تمہاری ہے نا؟"

دونوں پڑوسی، گردھاری لال، مہیش پرشاد، ٹاؤن پریسیڈنٹ، پٹرولنگ آفیسر، صمصام الدولہ..... ٹاؤن پریسیڈنٹ، مہیش پرشاد، پٹرولنگ آفیسر، دونوں پڑوسی، گردھاری..... ٹاؤن پریسیڈنٹ، صمصام الدولہ آفیسر، گردھاری، مہیش، پڑوسی، مولانا، ممدو، ممدو، مولانا، پریسیڈنٹ،

ژائیں.....ژائیں.....ژائیں۔''

چرخی کی طرح عکس ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوتے رہے اور لال بھبھوکا سورج اس کے چہرے پر جھما کا کرتا رہا اور چیختا رہا..... پہچانو تو جانیں..... پہچانو تو جانیں.....اور ممدو کی دھمکی اسے سنائی دیتی رہی۔'' وہ لونڈیا تمہاری ہے نا؟''

اسے لگا وہ جنگل کی آگ میں گھر گیا ہے اور دھڑ دھڑ جل رہا ہے۔ اس نے جھپٹ کر ممدو بھائی کا کالر پکڑ لیا..... '' حرام زادو!''

☆☆☆

جلتے صحرا میں ننگے پیروں رقص

ماتھر گھر آ کر بھی پر سکون نہ ہو سکا۔

بار بار ایسا محسوس ہوتا جیسے گندگی میں لتھڑا کوئی کیڑا اسے چاروں طرف سے جکڑے جا رہا ہو، وہ اندر ہی اندر ایسے تڑپا جیسے مئی اور جون کی سلگتی دوپہر میں کسی مچھلی کو دریا سے نکال کر ساحل کی جلتی ریت پر رکھ دیا گیا ہو، وہ غصے کے بھیانک بھنور میں ابھرتا ڈوبتا رہا....

آخر یہ سارا کچھ کتنی دور تک چلتا چلا جائے گا؟ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے، کیا کمینگی کی کوئی حد نہیں؟ غلط بات کے لیے لوگ اتنے شدت پسند کیسے ہو جاتے ہیں؟ کیسی بے حیائی تھی گپتا کے لہجے میں؟ گندگی میں لتھڑا مادرزاد برہنہ جذبہ.....کیسے ممکن ہے یہ؟ کیا خود وہ بھی ایسا کچھ کر پائے گا جو وہ مجھ سے کرانا چاہتا ہے؟

ماتھر کا سر گھومنے لگا.....اس کا دم گھٹنے لگا.....ہوا بالکل بند تھی!

وہ گئی رات تک تناؤ کی کیفیت میں گھرا رہا، اس بیچ اس کے دوست بھی آئے، ٹی.وی بھی کھلا، بچوں اور بیوی سے گھر کے مسائل پر باتیں بھی ہوئیں، مگر اس کے اندر گرم ہواؤں کے جھکڑ چلتے رہے.....دو چار پل تو ایسے آئے کہ وہ ڈرائنگ روم میں سب کے ساتھ باتیں کرتے کرتے اپنے آپ سے بے خبر ہو گیا.....اسے ایسا لگا جیسے کسی کشادہ سڑک پر چلتے چلتے اچانک وہ کسی گہری بھیانک کھائی میں گر پڑا ہو.....وہ چونک پڑتا اور پھر چند لمحوں پہلے کی بات سے بات کا سرا جوڑنے کی کوشش کرنے لگتا.....ٹی.وی دیکھتے دیکھتے اچانک ہر منظر بجھ جاتا اور اسکرین پر گپتا جھلملانے لگتا.....مادرزاد برہنہ.....غلاظت میں لپٹا....''

گئی رات تک ماتھر ایک جلتے سلگتے صحرا میں ننگے پیروں چلتا رہا۔

دوسرے دن یونیورسٹی میں: اپنا کلاس لے کر چیمبر میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ چپراسی نے ہیڈ کی درخواست لا کر دی، وہ دو دنوں کی چھٹی پر تھے..... اسی وقت پروفیسر چٹو پادھیائے اور پروفیسر رستوگی بھی آگئے۔

''یار رستوگی۔ ہیڈ کا پیریڈ ہے اور وہ چھٹی پر ہیں، ذرا تم اٹینج کرلو، میں ابھی کلاس لے کر آیا ہوں!''

رستوگی جونیر ٹیچر تھا اور خود پروفیسر ماتھر کا شاگرد اس لیے ماتھر اسے دیکھ کر ذرا Atease ہو گیا۔

''ماتھر صاحب! سنا کل کچھ بحثا بحثی ہوگئی۔'' چٹو پادھیائے نے پوچھا۔

''چھوڑو یار۔ اب پھر موڈ آف مت کرو۔'' ماتھر نے سر جھٹکا۔

''نہیں سر.. بتایئے نا.. ہوا کیا تھا؟'' رستوگی نے چھوٹے بھائی کے انداز میں ضد کی۔

''کیا بتاؤں بھئی..... پولیٹیکل سائنس والا گپتا پاگل پن کر......''

اچانک ماتھر رک گیا.. سامنے گپتا کھڑا تھا۔

یک بارگی سبھی نے اپنے آپ کو بڑی عجیب سی سچویشن میں گھرا محسوس کیا۔

گپتا کمرے میں داخل ہو چکا تھا، پیچھے پیچھے وہ لڑکا بھی جس کے داخلے کے لئے گپتا کل سے دلیلیں مہیا کر رہا تھا.. اور ان دونوں کے ساتھ تین اور لڑکے... جیکی کوچر اور پلائی... ماتھر ان تینوں کو اچھی طرح پہچانتا تھا، پچھلے وائس چانسلر نے تینوں کو پانچ سال کے لیے یونیورسٹی سے نکال دیا تھا۔

''نومو شکار... آیئے آیئے گپتا صاحب..... بیٹھئے۔'' چٹو پادھیائے اچانک ہی بہت نروس دکھنے لگا۔

رستوگی نے ماتھر کی آنکھوں میں دیکھا.... ایسا لگا، ماتھر کسی طوفان کا رخ پھیرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

''دیکھتے ہو جیکی''۔ گپتا کی آواز غصے کی شدت سے جیسے پھٹ سی گئی تھی.... ''تم کہہ رہے تھے ماتھر صاحب کو پھر سے سمجھا دیجئے، وہ ساہتیہ کے آدمی ہیں، ٹیکنکل معاملہ ان کی سمجھ میں کم آتا ہوگا... اور یہ کہتے ہیں کہ گپتا پاگل ہو گیا ہے''۔

"گپتا صاحب!" رستوگی دھیرے سے بولا "آپ دونوں سینئر ٹیچر ہیں جو معاملہ ہے آپس میں نپٹالیں، بچوں کو کیوں بیچ میں لاتے ہیں؟"

"اے پروفیسر۔ ذرا ہوش میں رہ کر بات کرو"۔ جیکی بالکل چنگھاڑنے کے انداز میں بولا "تم تین سال سے یہاں لڑکے پڑھا رہے ہو اور ہمیں یونیورسٹی چھوڑے چار سال ہو گئے...بچہ کہتے ہو!"

رستوگی بس ایک ٹک اسے دیکھتا رہا، اسے ایسے جواب کی توقع نہیں تھی....اسے لگا کسی نے اسے بھرے بازار میں ننگا کر دیا۔

"آپ بیٹھیے تو گپتا جی، بتایئے تو کیا معاملہ ہے؟" چتوپادھیائے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے بیٹھاتا ہوا بولا....خود وہ ابھی تک کھڑا تھا۔

"ارے کیا بتاؤں چتوپادھیائے جی....کل سے تو بتاتے بتاتے عاجز ہو گیا ہوں، یہ لڑکا بی۔اے میں فرسٹ کلاس لایا ہے، ہندی اس کا سبجیکٹ ہے، یہ ہندی میں ایم۔اے کرنا چاہتا ہے مگر یہ کہتے ہیں داخلہ نہیں ہوگا"۔

"کیوں نہیں داخلہ ہوگا؟" چتوپادھیائے جلدی سے بولا اور ماتھر سے مخاطب ہوا۔ "اس میں کیا پروبلم ہے بھائی؟ جب اس کا بی۔اے میں ہندی ہے ہی اور اس نے فرسٹ کلاس سے پاس کیا ہے تو پروبلم کیا ہے؟"

"گپتا اصل معاملہ نہیں بتا رہے ہیں۔" ماتھر نے بڑے رسان جواب دیا۔

"مطلب یہ کہ آپ بہت سچے ہیں اور گپتا سر جھوٹے ہیں؟" کوچر نے ہوا میں ہاتھ لہرا کر اور تقریباً چیخ کر کہا۔

"ارے نہیں بھائی کوچر۔ ایسا کیوں سمجھتے ہو؟" چتوپادھیائے مسکراتے ہوئے تقریباً عاجزانہ لہجے میں بولا "گپتا جی کو کون نہیں جانتا، پورے ہندوستان میں ان کی صلاحیت اور ایمانداری کا بول بالا ہے.....بیٹھو بیٹھو.....تم لوگ بیٹھو....ہو جائے گا بھائی....ماتھر صاحب کیوں بلاوجہ کا لفڑا پھیلا رہے ہیں...ایڈمیشن لے لیجیے!"

"چتوپادھیائے! آپ سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ بی۔اے کی ڈگری اصل مسئلہ نہیں ہے۔"

"تو پھر اصل معاملہ کیا ہے؟" چتوپادھیائے نے جھنجلا کر پوچھا۔

"ان کے پاس میٹرک کی سرٹیفکٹ کی جگہ جس ادارے کی سند ہے اس کو ہماری

یونیورسٹی تسلیم نہیں کرتی"۔

"سن رہے ہو پلائی؟" گپتا پلائی کی طرف مخاطب ہو کر بولا" ان کو ایڈمیشن لینا ہے بی۔اے کی سرٹیفکٹ پر اور یہ اسکروٹنی کر رہے ہیں میٹرک کے سرٹیفکٹ کی۔"

"اے پروفیسر صاحب۔آپ ایڈمیشن لیجیے گا یا نہیں؟" پلائی کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"گپتا۔تم میرے دوست ہو۔" ماتھر نے پلائی کو نظر انداز کر کے پھر گپتا کو مخاطب کیا۔ "سینئر ٹیچر ہو، سال دو سال میں پروفیسر ہو جاؤ گے، معاملے کی نزاکت کو سمجھو، میں بی۔اے کی سند کو کہاں غلط کہہ رہا ہوں، مسئلہ یہ ہے کہ میٹرک کی سند کے ذریعے عمر کا مسئلہ طے ہوتا ہے اور ہمارے یہاں جن اداروں کو تسلیم کیا گیا ہے ان میں سے کسی ادارے کی بھی سند اس لڑکے کے پاس نہیں ہے۔"

"سنیے اتنا سدھانت مت بگھاریے۔ہم لوگ بھی جانتے ہیں کہ یونیورسٹی میں کیا کیا ہوتا ہے"۔جیکی کرسی سے اٹھ کر ٹیبل کے پاس آیا اور ٹیبل پر آدھا بیٹھ کر ماتھر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غرانے لگا..." سالا اس یونیورسٹی میں وائس چانسلر کو تو ہم کچھ سمجھتے ہی نہیں اور پروفیسر لوگ ہم کو سبق پڑھانے چلے ہیں.....ہونہہ!"

"گپتا صاحب بھی پروفیسر ہی ہیں جیکی!" رستوگی پھر بہت دھیرے اور نرمی سے بولا۔

"تم چپ رہو جی، بیچ میں مت بولو...تم سے کوئی بات نہیں کر رہا ہے"۔

رستوگی کے اندر ایک آگ کا لاوا سا دھدھک اٹھا، اس نے اپنے چاروں طرف دیکھا...کرسی پر تنہا گپتا...دو کرسیوں پر پیروں پر پیر چڑھائے تمسخرانہ انداز میں مسکراتے ہوئے کوچر اور پلائی...ایک کرسی پر مرے چوہے کی طرح چٹو پادھیائے!

"جب تم پڑھتے تھے تب بھی ہم یہاں کے ٹیچر تھے"۔ماتھر کو آخر جیکی سے مخاطب ہونا پڑا۔" گپتا نے تم کو پڑھایا، یہ صحیح ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم ہم سے اس انداز میں بات کرو، تم صحیح غلط ہم کو مت بتاؤ، ہم جانتے ہیں کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط، ہم وہی کریں گے جو ہماری نظر میں صحیح ہوگا، یہ سامنے چٹو پادھیائے بیٹھے ہیں، ہمارے کلیگ ہیں، ایک ڈپارٹمنٹ کے ہیں لیکن ان کی بیوی کا مسئلہ بھی اٹکا رہ گیا"۔

"تو یہ کوئی بہت اچھا کام تو آپ نے نہیں کیا ماتھر صاحب۔" چٹو پادھیائے اچانک

چراغ پا ہو گیا۔

رستوگی نے جلدی سے چٹو پادھیائے کا پیر دبایا اور آہستہ سے بولا" اس وقت اس کا موقع نہیں ہے۔" چٹو پادھیائے پانی میں بتاشے کی طرح بیٹھ گیا۔

" غلط صحیح ہم کو مت سکھایئے۔" کوچر پھر چیخا" ہم بس اتنا کہنے آئے ہیں کہ آپ گپتا سر کے امیدوار کا داخلہ لے لیجیے"۔

" لے لیجیے ... لے لیجیے"۔ چٹو پادھیائے جلدی سے بولا۔" ارے ہمارا آپ کا کیا جاتا ہے۔ اگر کسی کا بھلا ہو جائے، کیوں گپتا صاحب؟"

چٹو پادھیائے جی۔ ایک صورت اور ہے۔" رستوگی نے کہا۔" ماتھر صاحب کے بجائے یہ ذمے داری آپ قبول کر لیں!"

" کک ...کیا...کیا مطلب۔۔۔"

چٹو پادھیائے اچانک ہی ہکلانے لگا۔

" ہاں یہ ٹھیک ہے" ماتھر فوراً بولا" میں تیار ہوں Next Senior تو آپ ہی ہیں، ہیڈ یہ ذمے داری آپ ہی کو سونپیں گے۔ آپ حل کھوج لیں!"

" رستوگی۔ نیا شوشہ مت چھوڑو، معاملہ ماتھر صاحب کا ہے، مجھے کیوں پھنسا رہے ہو؟"

" نہیں سر۔" رستوگی نے بات کاٹی۔" یہ ہم سب کا معاملہ ہے۔ اور آپ ایڈمیشن کی حمایت کر رہے ہیں تو راستہ بھی آپ ہی نکالیے"۔

چٹو پادھیائے کی حالت دیکھنے کے قابل تھی، نہ ہنستے بن رہا تھا نہ روتے...وہ کبھی ماتھر اور رستوگی کو دیکھتا جیسے کوئی نیا تیرنے والا دریا کو دیکھتا ہے...پھر جیکی کوچر اور پلائی کو دیکھتا جیسے سمندر میں تیرتے آدمی کا سامنا اچانک کسی گھڑیال سے ہو جائے...کچھ دیر خموشی سی رہی...پھر اچانک جیسے چٹو پادھیائے کو خزانہ سا مل گیا...

" ٹھیک ہے میں دیکھ لوں گا" چٹو پادھیائے مسکراتے ہوئے بولا، گپتا جیکی، کوچر اور پلائی بھی مسکرا اٹھے۔

" کیسے دیکھیے گا۔ ذرا ہمیں بھی بتا دیجیے۔" ماتھر نے پوچھا۔

" پچھلے سالوں کا ریکارڈ دیکھوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ میٹرک کی سند کبھی بھی شرط نہیں

رہی گی"۔

"تو پھر نیک کام میں دیر کیوں؟ ریکارڈ منگا کر دیکھ ہی لیجیے"۔ ماتھر نے بھی جیسے اطمینان کا سانس لیا۔

"جاؤ۔ کلرک سے مانگ کر لے آؤ"۔ گپتا نے مڑ کر جیکی سے کہا اور تینوں آفس کی طرف دوڑ پڑے۔

"گپتا۔ ٹیچروں کے درمیان ان بلیک لسٹڈ لڑکوں کو کیوں لاتے ہو؟" ماتھر نے تینوں کے جانے کے بعد بڑے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

"میں نہیں لایا۔" گپتا نے ایک جھٹکے کے ساتھ جواب دیا۔ "یہ لڑکے خود آئے تھے، میرے پاس سفارش لے کر"۔

"گپتا صاحب۔ جس کے لیے آپ کوشش کر رہے ہیں۔ وہ آپ کا بھتیجا ہے نا؟" رستوگی نے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ گپتا کچھ جواب دیتا، جیکی اور کوچر وغیرہ فائل لے کر آگئے، ساتھ میں کلرک بھی تھا، چٹوپادھیائے جلدی جلدی فائل الٹنے لگا... ۴ سال کی فائل دیکھ لی گئی تھی، کہیں کوئی ایسا ثبوت نہیں مل سکا تھا جس سے ماتھر کا دعویٰ غلط ہو پاتا... پانچویں سال کی فائل دیکھی جا رہی تھی کہ اچانک گپتا ان لڑکوں کی طرف مڑا۔" جانتے ہو۔ داخلہ کیوں نہیں ہو رہا ہے؟"

"کیوں سر؟ کیوں؟ تینوں ایک ساتھ بولے۔

"صرف اس لیے کہ تم لوگ میرے ساتھ آئے ہو"۔

رستوگی نے تڑپ کر گپتا کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔" پلیز گپتا صاحب... بات مت بڑھائیے!"۔

ماتھر کا چہرہ غصے کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا... چٹوپادھیائے چوہے دان میں پھنسے ایسے چوہے کی طرح حرکت میں تھا اور جلدی جلدی فائل الٹ رہا تھا، جس کی دم بلی کے منہ میں آگئی ہو۔

"گپتا۔ میں یہ نہیں سمجھتا تھا کہ تم اس حد تک بھی جا سکتے ہو"۔ ماتھر اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا!

"ابھی حد آپ نے دیکھی کہاں ہے پروفیسر صاحب؟ حد دیکھنی ہے تو نرائن گنج تھانہ کا ریکارڈ دیکھیے۔" جیکی ٹیبل کے اس سرے سے اٹھ کر بالکل ماتھر کے پاس پہنچ چکا تھا۔" تین قتل میری حد ہے دو کو چرا اور پلائی کی۔"

اچانک ماتھر کھڑا ہو گیا.. وہ غصے سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔" جیکی.. اب تم لوگ باہر جاؤ۔"

آواز نکلی تو تھی ماتھر ہی کے حلق سے... مگر یہ ماتھر کی آواز نہیں تھی... قصائی کی چھری کے نیچے جانور کی چیخ اس کی اپنی چیخ کہاں ہوتی ہے؟

گپتا کے لئے یہ غیر متوقع صورت حال تھی، اس نے صرف ماتھر کو مرعوب کرنے کے لیے ان سب کو ساتھ لے لیا تھا مگر یہ تو اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا... ساری زندگی تو ماتھر اور رستوگی کے ساتھ ہی گزارنی ہے... ٹیچنگ سرکل میں وہ بدنام ہو جائے گا... معاملہ خراب ہوا تو انکوائری... ٹیچرس ایسوسی ایشن کا سکریٹری ماتھر کا دوست ہے!

گپتا نے تیزی سے آگے بڑھ کر جیکی کو پیچھے گھسیٹا۔" جیکی! کیا بدتمیزی ہے... پیچھے آؤ!"

"آپ ہٹ جایئے سر... میں سمجھ لیتا ہوں۔" جیکی نے ایک ہاتھ سے گپتا کو جھٹکا دیا تو گپتا گرتے گرتے بچا۔

اس ایک پل میں: ماتھر نے اپنے آپ کو ہزاروں لاکھوں من بھاری چٹان کے نیچے دبتا محسوس کیا... پھر اسے ایسا لگا جیسے اسے دہکتے شعلوں کے درمیان پھینک دیا گیا ہو... اس نے محسوس کیا اس کے پیر اس کے قابو میں نہیں ہیں... تھر تھر کانپتے پیر اور آنکھوں کے آگے تیرتے ستارے اور اندھیرے... اور پھر وجود کی کسی ان دیکھی اور ان جانی دشا سے غصے کی ایک انتہائی شدید لہر اٹھی اور اس کے پورے وجود پر چھا گئی... I... SAY... YOU GET OUT! ماتھر پھٹی پھٹی بھیانک آواز میں چیخا۔

اور اسی پل: رستوگی نے عجیب سحر کے عالم میں یہ سب کچھ دیکھا اور اس نے اپنا آپ گم ہوتا محسوس کیا اور پل کے پل میں ماتھر اس کے اندر اتر گیا اور رستوگی کو ایسا محسوس ہوا جیسے جیکی کی ہر نگاہ ریوالور کی گولی ہے جو نشانہ لے رہی ہے ماتھر کا، مگر زخمی ہو رہا ہے خود رستوگی... جیکی کی ہر حرکت سان دھرائے چاقو کی تیز زہریلی نوک ہے، جو چبھ رہی ہے ماتھر کو مگر زخم لگ رہا ہے رستوگی کو... یہ سارا کچھ رستوگی نے ایک پل میں محسوس کیا!

گپتا جو جیکی کے ہاتھ سے جھٹکا کھا کر لڑکھڑا گیا تھا...اب سنبھالا لے چکا تھا، اور اس نے یہ بات اچھی محسوس کر لی تھی کہ جیکی کا کوئی بھی اگلا قدم اب اس کے کیریر اور عزت کا نشانہ لے گا۔

گپتا اور رستوگی دونوں بیک وقت جیکی کی طرف لپکے اور دونوں نے دو طرف سے جیکی کو پکڑ کر، ماتھر کے کمرے سے دھکا دے کر باہر کر دیا۔

ماتھر کی چیخ اور جیکی کی بلند آواز سن کر لڑکے ماتھر کے کمرے کی طرف دوڑ پڑے...'' کیا ہوا سر؟ کیا ہوا؟''۔

جیکی غضب ناک سور کی طرح جھاگ پھینک رہا تھا...'' آپ نے ہمیں لا کر ذلیل کیا... آپ کو ہم دیکھ لیں گے''۔

کوچر نے پہلے گپتا اور پھر ان لڑکوں کی طرف نگاہ کی جو ماتھر اور رستوگی کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے اور بار بار پوچھ رہے تھے...'' بتایئے نا سر...کیا ہوا؟'' پھر کوچر اور پلائی اسے اس طرح کھینچتے ہوئے عمارت کے باہر چلے گئے جیسے اس کی مرضی کے خلاف اسے وہاں سے ہٹایا جا رہا ہو...جیکی کی فرمائشی چیخ ابھی بھی سنائی دے رہی تھی...'' گپتا صاحب! آپ کو ہم دیکھ لیں گے...گپتا صاحب! آپ نے ہم کو ذلیل کیا۔''

رستوگی طلبا کو سمجھا رہا تھا، چٹو پادھیائے کرسی پر گردن جھکائے بیٹھا تھا، گپتا پر دھوپ چھاؤں کی کیفیت طاری تھی، اور ماتھر اندیشوں اور سوالات کے لپکتے دھدھکتے آفتاب کی تمازت کی تمثیل بنا ہوا تھا...

ماتھر نے دسمبر کے ایک سرد ترین دن میں محسوس کیا کہ پورا کمرہ تیز سورج کی تپش سے دھدھک رہا ہے، باہر گرم ہواؤں کے جھکڑ آگ برسا رہے ہیں اور صحرا کی جلتی سلگتی ریت پر ایک بے پیکر ہیولا آگ کی لپٹوں میں گھرا چھٹپٹا رہا ہے۔

آگ کی لپٹوں میں گھرے اور چھٹپٹاتے اس بے پیکر ہیولے کو گپتا اور چٹو پادھیائے کب پہچان پائیں گے؟؟؟

☆☆☆

کہاسے میں خواب

"یار! اب تو محسوس ہو رہا ہے کہ ذہن پر بھی برف لگی ہے"۔ نولیش نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے دونوں کانوں کو رگڑتے ہوئے کہا۔

"ہاں، اس سال کا جاڑا کڑاکے کا ہے۔" مصورا پنے چاروں طرف پھیلی کمبل اپنے جسم کے گرد لپیٹتا ہوا بولا۔

"ارے نہیں یار"۔ گجران والا کی آواز سے جھلاہٹ ٹپک رہی تھی، جاڑا واڑا سالا کیا کڑاکے کا پڑے گا؟ ہم ہی لوگ اب کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔

"اوئے سردارا، تو ذرا سی بات میں طعنے کیوں دینے لگتا ہے؟" نولیش منمنایا۔

"تو اور کیا کروں بادشاہو۔ سالا جاڑا تو پچھلے سال بھی آیا تھا اور پچھلے سال کے پچھلے سال بھی، پر ہم تب تو یوں چیخ و پکار نہ کرتے تھے۔"

"پر سردار جی! پچھلے سال اور پچھلے سال کے پچھلے سال تو ہم ایسی ناگہانی مصیبت میں بھی گرفتار نہ ہوئے۔"

"ہاں سو تو ہے مصورے۔"

گجران والا آہستہ سے بولا اور ٹھنڈک سے پر آب ہوتی آنکھوں کی نمی رومال میں جذب کی اور اپنے چاروں اور دیکھا...دور دور تک کہاسہ گر رہا تھا مانو وہ دھند کی دبیز چادر تلے سب چھپتا جا رہا ہو۔ اسے یاد آیا کہ اس موسم میں پھول کھلتے ہیں، جیون تیرے رنگ نیارے، کہیں پھول کہیں انگارے....." اور یہاں؟" گجران والا کے اندر اندر جانے کس جذبے سے شرابور ہنسی کا فوارہ پھوٹا پھر اندر ہی اندر ہنسی کی ایک اور لہر نے سر اٹھایا۔

''سنجیدہ رہو تو مشکوک، ہنسو تو....''

''یار! جب میں گجران والا میں تھا تو.....'' اچانک گجران والا کو اپنا گھر یاد آ گیا۔

''اوئے سردارا! تو گجران والا کی بات چھوڑ، یہاں کی بات کر'' نولیش نے تیزی سے کاٹ کی۔ گجران والا نے ادبدا کر مصور کی طرف دیکھا، پر مصور نے شاید سنا ہی نہیں، وہ کہیں اور دیکھ رہا تھا۔

پھر کچھ دیر یاروں کے درمیان سناٹا براجمان رہا اور دسمبر کی آخری تاریخوں کی رات جنکشن پر سے ترل ترل گزرتی رہی۔

''لیکن یار، وہ ٹرین کا کیا ہوگا؟'' مصور نولیش کی طرف دیکھ کر بولا۔ نولیش نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ سامنے ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ پرانی فلم پاکیزہ، دکھائی جا رہی تھی''۔

ہیروئن ٹرین میں سوئی ہوئی ہے۔ ٹرین اپنی پوری رفتار سے بھاگتی چلی جا رہی ہے.... ٹرین کے باہر چاروں طرف پھیلی گہری سیاہ اندھیری رات.... اور یہاں جنکشن پر.... مصور نے سوچا۔ رات ایسی روشن ہے جیسے دن.... مگر وہ ٹرین.... کس مصیبت میں پھنسے ہیں؟ چھ ماہ بعد گھر جانا نصیب ہو رہا ہے یونی ورسٹی سے روانہ ہوئے بائیس گھنٹے ہو چکے، چھ گھنٹے تو اسی اسٹیشن پر بیت گئے اگر پروگرام کے مطابق ملتی رہتی تو اب تک تو گھر پر آرام کر رہے ہوتے..... مصور کے اندر ہی اندر بہت شدید قسم کی اکتاہٹ اور تھکن نے انگڑائی لی..... کرپشن کیا ہے؟ دہلی کی ٹرین یہاں تین بجے دن میں پہنچی ہے اور چار بجے پسنجر ٹرین کھلتی ہے جس سے سات بجے گھر پہنچ جایا جا سکتا تھا۔ لیکن یہاں تو دس بج گیا اور ابھی تک ٹرین کا انجن وہاں سے آیا ہی نہیں۔ پوچھنے جاؤ تو ایک ہی جواب..... یہاں چوں کہ ''یارڈ'' نہیں ہے اس لئے انجن وہاں سے آتا ہے.....اور وہاں سے انجن کب آئے گا؟ اس کی کوئی خبر نہیں۔

منظر سے پرے ایک گوریا اڑنا چاہتی ہے مگر وہ جس شاخ پہ بیٹھی ہے وہاں شکاری نے ''لاسا'' لگا دیا ہے۔ چڑیا بار بار پر پھڑ پھڑاتی ہے اور جہاں ہے اس سے ایک قدم آگے نہیں بڑھتی۔

''پرانی فلموں کا تو جادو ہی عجیب ہے۔ دیکھ یار مصور! کیا منظر پیش کیا ہے کمال نے'' نولیش لذت کی مدھوشالا میں پیالے پر پیالہ خالی کئے جا رہا تھا..... جب کائنات اپنی پلکیں جھکانے لگتی ہے جیسے کوئی شریر لڑکی کسی پاگل لڑکے سے آدھے سچے آدھے جھوٹے لہجے میں من کی

بات بہت دھیرے سے کہہ کر ہولے سے اپنی پلکیں بس ذرا سی اوپر اٹھائے پھر سیکنڈ کے نناوے حصے میں سج سج جھکائے..... کہیں دور شہنائی کی آواز میں رلی ملی مانجھیوں کی الاپ، ندیوں کا جلترنگ، ٹھنڈی ہوا کے جھکورے، کسی پہاڑی کا دامن، دامن میں پھولوں کی بہار، آسمان پر ڈوبتے سورج کی دھند، اور ست رنگی دھنک کی چھوٹ....

''یار! اتنی خوب صورتی تو بس فلموں ہی میں ہوتی ہے''۔ گجران والا مضحکہ خیز انداز میں بولا۔

''نہیں یار، اب ایسا بھی نہیں۔ اپنے اوٹی، شملہ، دارجلنگ اور گلمرگ کا حسن بھی تو ہے''۔

''اوئے مصور حسین خاں خیالی، تو دارجلنگ اور گلمرگ کو تو الگ ہی کردے پیارے''۔

''اوئے پتر دی گجران والا'' مصور ہنسا ''تو ذرا اپنا ٹینشن کم کر۔ ہر وقت کڑواہٹ؟''

''کیا کروں خیالئے؟ مجھے تو کسی دکان پر ابھی تک میٹھا پچ ملا ہی نہیں''۔ گجران والا عجیب سی ہنسی ہنسا، پھر قریب آتے نوجوان کی طرف ہنستے ہوئے مخاطب ہوا'' کہو پیارے شاعر رہبر بھارتی صاحب، کیا خبر لائے؟''

''خبر یہ ہے'' نوجوان بنچ پر بیٹھتا ہوا بولا'' کہ جب ٹرین خالی ہوگا تو انجن آئے گا''

''تو گاڑی جائے گی'' گجران والا گا کر بولا، پھر مصور کی طرف جھکا ''لو میٹھا پچ کھالو''۔

مصور کے چہرے پر ایک رنگ آیا اور ایک چلا گیا۔ مہینے کی آخری تاریخوں میں دیر سے طلوع ہوتے چاند پر سے بادلوں کا پرے کا پرا لپ چھپ کرتا آ رہا تھا اور جا رہا تھا اور فضا میں چاروں طرف دھند چھائی ہوئی تھی..... گمان کی دھند!

اسٹیشن پر لوگوں کا اژدہام، سب اپنی اپنی منزلوں تک پہنچنے کے لئے بے چین، اور ٹرین کا یہ حال کہ.....

''اٹینشن پلیز! ہوڑہ دہلی کا لکا میل اپنے نردھارت سمئے سے چار گھنٹہ ولمبھ سے آئے گی''۔

''لو، اور بھی ستم زدہ روزگار ہیں'' گجران والا منمنایا۔

''پر یہ نہیں ہے۔'' مصور نے نولیش کی طرف اشارہ کیا۔

''اس کو کیا فکر ہوگی؟ یہ تو ہر جگہ کو اپنے باپ کی جائیداد سمجھ کر جم جاتا ہے، دیکھو کتنے اطمینان سے آلتی پالتی مارے بیٹھا ہے، ٹی وی دیکھ رہا ہے''۔ گجران والا ہنسا'' اور یہی کیا؟ یہاں سے وہاں تک سب تو مست ہی نظر آرہے ہیں''۔

''گیارہ بج رہے ہیں، انجن ابھی تک نہیں آیا''۔ ذرا دور پر بیٹھے ایک آدمی نے بے چین ہو کر گھڑی دیکھی، اور پھر چونک کر سامنے دیکھنے لگا۔'' یہ چراغ بجھ رہے ہیں مرے ساتھ جلتے جلتے''۔ اسے یاد آیا، جانے وہ لڑکی اب کہاں ہوگی! کتنا انتظار..... صدیوں پر محیط.... ایک کبھی نہ ختم ہونے والا انتظار..... رات باقی تھی جب وہ بچھڑے تھے'' یہ چراغ بجھ رہے ہیں......''

اچانک گجران والا تیزی سے اٹھا اور اپنی پاس والی بنچ کی طرف بڑھا۔

''بھائی صاحب'' اس نے اس بنچ پر بیٹھے سب سے معمر آدمی کو مخاطب کیا '' آپ بھی تو ۳۴۲ ڈاؤن سے جانے والے ہیں نا؟''

''جی؟'' معمر آدمی نے ٹی وی اسکرین پر سے نگاہ ہٹا کر اس کی جانب دیکھا۔

''آپ بھی تو ۳۴۲ نمبر والی ڈاؤن پسنجر سے جانے والے ہیں نا؟'' گجران والا نے اپنا سوال دہرایا۔ جی..... تو؟؟''

گجران والا تھکے انداز میں اپنی جگہ جیسے ڈھہ گیا، شاید اس کی ہمت جواب دے رہی تھی ''پرسھوں کو کیا ہوا؟'' من میں ایک سوال نے سر اٹھایا، مگر رسوائی جواب کی تقدیر.... جواب کون دے گا؟ اور کیوں دے گا؟ مان لیا ٹرین لیٹ ہے، تسلیم کہ وہاں سے انجن آنے میں اتنی دیر نہیں ہونی چاہیئے، مگر پھر بھی تو یہ مشین کا معاملہ ہے، آدمی کے اپنے بس میں نہیں ہے، محکمے کے بس میں جو کچھ ہے وہ تو محکمے نے کیا ہی، گدے دار کرسیاں ٹھنڈ سے بچنے کے لیے شیڈس، لیٹ رننگ ٹرینس کی بوریت سے نجات پانے کے لئے ٹی وی......''

''یہ چاند یہ نظارے......''

گجران والا نے اپنے چاروں طرف دیکھا، جاڑے کی چاندنی کا مصرف کیا ہے؟ گجران والا میں گرمیاں آتیں تو..... اسے اپنا دیہات یاد آ گیا۔ گرمیوں کی راتوں میں جیسے جیسے چاند اوپر آتا جاتا، اور رات گرتی جاتی، کھیتوں کا حسن بڑھتا جاتا۔ دور دور تک پھیلے کھیت، جن میں فصلیں کٹ چکی ہوتیں، یا نئی بوائی ہو چکی ہوتی، مینڈھ پر غریب کسان اپنی محنت کے لیکھا جوکھا

میں گم رہتے یا مستقبل کا خواب بنتے اور گاؤں کے سائیں (زمین دار) چار پائیوں پر بچھی سوزنی اور اس پر بچھی بھک سفید چادروں پر بیٹھے لسی یا حقہ پیتے اور دنیا جہان کی باتیں کرتے ....اور کہیں دور سے ندی کے بہنے کی آواز آتی، اور جب جب، ہوا ندی کو چھو کر ان تک پہنچتی تو محنتی کسانوں کے تپتے چہروں پر سورج کی چھوٹ پڑنے لگتی..... پھر کہیں دور کسی کچی سڑک پر دھیرے دھیرے چلتی کسی بیل گاڑی کی آواز آتی .... مچھر چوں، پھر بیلوں کے گلے میں بندھی گھنٹیوں کی موسیقی گونجتی اور کچے پکے مکانوں کی دیواروں اور چھپروں پر، کھیتوں اور کھلیانوں پر، چاروں اور چاند طلوع ہوتا رہتا اور چاندنی بکھرتی رہتی۔ نظارہ درمیاں تھا۔ گجران والا ناسٹلجک ہو رہا تھا۔

"یہ چاند..... یہ نظارے۔"

ٹی وی پر فلم جاری تھی۔ مصور بھی منظر اور نغمے کا اسیر ہو چکا تھا۔ اچانک گجران والا نے کچکچا کر مصور کو جھنجھوڑ ڈالا:

"ابے او پتر دی پھپھوندزادے، ہم پر تو الزام لگا تا ہے کہ ہمیں گھڑی گزر جانے کے بعد ہوش آتا ہے..... پھر تجھے کیا ہوا ہے؟"

"یار! ہمارے جاگنے کی تو ابھی باری ہی نہیں آئی ہے"۔ مصور آہستہ سے بولا۔

"سالے! فراری قنوطی، سوئے رہنے کے لئے بہانے تراشتا ہے"۔

"نہیں یار، وہ تو خیر میں نے محاورہ کہا تھا۔ سویا کون بدبخت ہے؟ ہم تو جاگتے رہتے ہیں اور دیکھتے رہتے ہیں"۔

"صرف دیکھ مت، کچھ کر بھی پیارے"۔

"یار ہم کیا کریں؟ اور ہم کیا کر سکتے ہیں؟ جنھیں جو کرنا ہے وہ تو کر ہی رہے ہیں"۔

"صاف صاف بات کر، علامت اور استعارہ شاعری کے لئے چھوڑ دے"۔

"یار! کم از کم استعارے کی تو جان بخش دے"۔

"اچھا اچھا بخش دیا..... تو بتا تو کسے کیا کرنا ہے؟ اور کون کیا کر رہا ہے؟"

"ارے یہی، اپنا نولیش کمار ٹی وی دیکھ رہا ہے اور اپنا رہبر بھارتی سو رہا ہے... کہ خواب دیکھنے کے لئے سونا ضروری ہے"۔

''اور تم سالے ابھی تو وہی کر رہے ہو..... جو کرتے رہے ہو!''

''یعنی؟''

''تجزیہ.......... اتنے دنوں میں تجزیے کے سوا اور کیا کیا ہے تم نے؟''

نگران والا کی اس بات پر مصور کچھ بھی نہ بولا۔ وہ کہہ بھی کیا سکتا تھا۔

کچھ دیر سب چپ رہے۔ پھر اچانک نگران والا اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنی بنچ سے آگے بڑھا، کچھ آگے بڑھ کر پھر کھڑا ہو گیا اور بلند آواز میں چیخا:

''۴۴۳ نمبر والی ڈاؤن پسنجر سے جانے والے بھائی ذرا میری طرف متوجہ ہوں''۔

فلم بہت دل چسپ موڑ پر پہنچی ہوئی تھی.... انہی لوگوں نے لے لیا دوپٹہ میرا۔

بہت سے لوگوں کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ کچھ نے ایک منٹ کے لئے اس کی طرف دیکھا پھر ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ کچھ ایسے بھی تھے جن کی توجہ ٹی وی کی طرف کی طرف بھی تھی اور اس کی طرف بھی۔ دو چار آدمی اس کی جانب ہمہ تن گوش ہو کر متوجہ تھے۔

''یار! یہ کیا کھڑاگ پھیلا رہا ہے؟ اس سے کیا ہونے والا ہے؟'' نولیش نے اکتا کر مصور سے کہا۔

''یہ کھڑاگ کھڑا کرنے سے پہلے سوچتا کہاں ہے؟'' مصور نے جواب دیا مگر نولیش شاید سن نہ سکا وہ پھر ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

رہبر بھارتی خراٹے لے رہا تھا اور رتھا اور نگران نوالا چیخ رہا تھا:

''..... یارڈ یہاں سے صرف چھ میل کی دوری پر ہے اور یہ چھ میل کی دوری ۹ گھنٹے میں طے نہ ہو سکی اور آپ لوگوں کے کان پر جوں تک نہیں رینگ رہی ہے۔ آپ اپنے آپ کو اتنا کمزور کیوں سمجھتے ہیں؟ اگر ہم سب لوگ ایک ساتھ آواز بلند کریں تو محکمے کا ناطقہ بند ہو جائے گا۔ ہمارے دستور میں شہریوں کو بنیادی سہولتیں فراہم کرنے کا عہد کیا گیا ہے اور یہاں محکمہ عہد شکنی کر رہا ہے....''

''بہت بور کر رہا ہے یار!''۔

''نہیں، بات تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔''

''مگر سنتا کون ہے؟''۔

''سب تو اپنی جگہ جمے بیٹھے ہیں۔''

''تم ہی کیوں نہیں اٹھ جاتے؟''۔

''میں پہل نہیں کروں گا، کوئی اٹھے تو میں بھی اٹھوں گا''۔

''تم پہل کرنے سے ڈرتے کیوں ہو؟''۔

''اور تم؟''۔

''اور تم کیوں نہیں؟''۔

''تھارے رہیو اے بانکے یار......''

چار پانچ آدمی گجران والا کے پاس آئے'' کچھ دیر ٹھہریئے، فلم اب ختم ہونے والی ہے اس کے بعد ہم لوگ آپ کے ساتھ چلیں گے۔''

گجران والا نے بوکھلا کر انہیں دیکھا'' ابھی تک انہیں اس کا احساس نہیں کہ پہلے ہی بہت تاخیر ہو چکی۔'' اس نے ایسا محسوس کیا جیسے اندر اندر کوئی عمارت اچانک زمیں بوس ہو گئی ہو...وہ آہستہ سے پیچھے ہٹا، اپنی بنچ کی طرف آیا اور مصور کے پاس بیٹھ گیا۔''

''کیا ہوا؟'' مصور نے پوچھا۔

''پتہ نہیں یار۔اب کس کی جاگنے کی باری ہے؟'' اس نے بہت آہستہ سے جواب دیا اور شاید ٹھنڈک سے پر آب ہوتی آنکھوں کی نمی رومال میں جذب کی اور اپنے چاروں طرف نظر دوڑائی۔دور دور تک کہاسہ گر رہا تھا !

☆☆☆

گونگا بولنا چاہتا ہے

گونگے نے بڑی بے چینی سے پہلو بدلا۔

دوسروں نے شاید اس کی بے چینی محسوس نہیں کی یا اس کی بے چینی شاید قابلِ توجہ ہی نہیں تھی۔ جو بھی ہو مگر وہاں موجود لوگوں پر اس کی بے تابی کا کوئی اثر دکھائی نہیں دیا۔ معاملہ ہی اتنا اہم تھا کہ اس کے سامنے ایک گونگے کی بے چینی کیا معنی رکھتی۔

جنوری کی انتہائی سرد رات، تقریباً ۹ بجے کا عمل، محلے کے بیچوں بیچ ''ماشاء اللہ'' ہوٹل میں بالکل کنارے، ایک گول میز پر جس کے چاروں طرف آٹھ دس کرسیاں......ایک پر پھدو مستری، دوسری پر جلیل خاں ٹھیکیدار، تیسری پر بیچو ٹیلر، چوتھی پر محلے کی مسجد کا موذن عید محمد، پانچویں پر جمو جراح، چھٹی پر ہار ہوا وارڈ کمشنر کھدر پوش پہلوان نما سوشل ورکر عبدالروف، ساتویں پر قوالوں اور رمضان میں ''قافلہ'' والوں کو ''سحری'' لکھ کر دینے والا دو چار محلے میں مشہور شاعر جمال غوغائی، آٹھویں پر چراغ دین بیڑی ساز....اور نویں پر بے چینی سے پہلو بدلنے والا گونگا!

گونگا بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا مگر گونگا جو ٹھہرا، بولتا کیا، البتہ اس کی اپنی مصیبت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ وہ بول نہیں سکتا تھا مگر سن سکتا تھا اور سمجھ سکتا تھا۔ یہ کیسے ہوا یہ ایک الگ کہانی ہے جس کے بیان کا یہ موقع نہیں ہے۔

تب تو بس ایک ہی مسئلہ سامنے تھا کہ امریکہ کیسے ہارے گا؟

جب سے عراق نے کویت کو بادشاہت سے آزادی دلائی، اس وقت سے جنگ شروع ہونے اور خطرناک ہو جانے تک تقریباً پانچ چھ مہینے کی مدت تو ضرور گزری، ان پانچ چھ مہینوں کے درمیان ماشاء اللہ ہوٹل کی گول میز کبھی خالی نہیں رہی۔ ہوٹل کھلنے سے بند ہونے تک باری باری

سے گروپ پر گروپ آتا رہتا اور ایک پیالی چائے میں امریکہ کے اسکڈ میزائیل بیڑے، ہوائی جہاز اور ٹینک ڈبوتا رہتا۔ شروع شروع میں تو ہوٹل کا مالک رمضان علی خاں خاصا چیں بجبیں ہوا: سالے ایک پیالی چائے پئیں گے اور ایک گھنٹہ تک بقراطی جھاڑیں گے۔'' اس نے بڑے بڑے حرفوں میں لکھوا کر چاروں طرف دیواروں پر چسپاں کر دیا:

''سیاست پر گفتگو منع ہے''۔ مگر ہر دن اور ہر وقت وہی بات، وہی موضوع۔ تنگ آ کر ایک گروپ کو ٹوک دیا: ''بھائی دیکھتے نہیں؟ سیاست پر گفتگو منع ہے''۔ تو ان میں سے ایک نے ہنس کر کہا: ''اجی سیاست پر گفتگو کون کر رہا ہے؟ یہاں تو جنگ پر بات ہو رہی ہے''۔

رمضان علی گڑبڑا کر رہ گئے.... ''سیاست اور جنگ کے فرق کا مسئلہ!''

دوسرے گروپ سے انہوں نے دوٹوک کہا: ''ہوٹل کھانے پینے کی جگہ ہے خوش گپی کی نہیں''۔ اس پر ایک من چلا بول اٹھا: ''رمضان بھائی! کربلا اور نجف پر بمباری کے تذکرے کو آپ خوش گپی کہتے ہیں؟''

رمضان علی کے پاس اپنے دفاع کے لئے کچھ نہیں رہ گیا مگر وہ کاؤنٹر پر بیٹھے مسلسل کھولتے رہتے اور کبھی آہستہ کبھی زور سے بگڑتے رہتے۔ تب ایک دن ان کے بیٹے نے انہیں سمجھایا: ابا! اگر دس آدمی ایک پیالی چائے پر ایک گھنٹہ بیٹھتے ہیں تو گویا ایک گھنٹے میں دس پیالی۔ ہوٹل صبح سات بجے سے رات دس بجے تک کھلا رہتا ہے یعنی ۱۵ گھنٹے.... اس طرح ایک دن کی صرف چائے کی کمائی ۷۵ روپے ہوتی ہے تو پھر بحث سے ہمارا کیا نقصان ہو رہا ہے؟''

یہ نکتہ رمضان علی کی سمجھ میں آ گیا اور بحث جاری رہی۔

اس رات بھی بحث جاری تھی اور ایک ہی مسئلہ سامنے تھا کہ امریکہ کیسے ہارے گا۔ کچھ دیر پہلے ریڈیو خبر نشر کر چکا تھا کہ امریکی فوجیوں نے بغداد کے ایک بنکر پر ایسا حملہ کیا کہ اس کے اندر چھپے ہوئے ہزاروں افراد پل بھر میں، موت کے منہ میں چلے گئے۔ اس خبر سے کچھ دیر کے لئے سب پر سکتہ طاری ہو گیا۔ مانو سب کو سانپ سونگھ گیا، کوئی کچھ بول نہیں پا رہا تھا، چاروں طرف ایک عجیب سی بے بس خموشی پسری تھی۔ پھر ٹیبل پر پسری خموشی کے سینے میں جیسے چاقو سا کھب گیا.... شاعر جمال غوغائی کی آواز گونجی؟ جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا۔ جمال غوغائی کی آواز پر جیسے عبدالرؤف چونک اٹھا اور ٹیبل پر ایک زوردار مکا مار کر چیخا: ''ایک مردہ لومبا ایک زندہ

لوممبا سے زیادہ طاقت ور ہے"۔ اس پر عبد محمد موذن بہت بھاری اور گمبھیر آواز میں بولا:

"بھائی! یہ ساری خبریں تو اسی شیطانِ اعظم امریکہ کی دی ہوئی ہیں۔ عراق کی خبریں کہاں آ پا رہی ہیں جو ہم یقین کر لیں کہ واقعی اتنے لوگ مارے گئے۔" یہ سنتے ہی چراغ دین بیٹری ساز کچھ اس طرح اسٹارٹ ہو گیا جیسے کسی فلیتے کو آگ دکھا دی ہو: "ارے عراقیوں نے تو ان کے چھکے چھڑا دیئے ہیں۔ اسرائیل کو کیا مار رہا ہے.... دے ٹھس پر ٹھس.... اور اسرائیل امریکہ کی مجال نہیں ہو رہی ہے کہ عراقیوں کو چھو دیں، اور وہ سالا نجدی کی اولاد الگ بلبلاتا پھر رہا ہے، کبھی دہران سے بھاگ رہا ہے، کبھی ریاض سے، اور یہ شیطان بش کہتا ہے کہ ہم نے ہزاروں کو مار ڈالا ..... جھوٹا لاغی....."

ٹھیک اسی وقت جمال غوغائی کا بیٹا ہوٹل میں داخل ہوا: "ابا ابا۔ بابو کو پھر دورہ پڑ گیا ہے۔ اماں بلا رہی ہیں"

"ارے تو اماں سے کہہ کہ اُو دوا دے دے جو طاق پر رکھی ہے"۔ جمال غوغائی کے لہجے سے اکتاہٹ ٹپک رہی تھی۔

"اُو دوا تو دے دیہن"۔

"اچھا تیں چل۔ ہم آویں ہیں"

"جمال بھائی۔ شادی بھی سالی مصیبت ہے"۔ پھدو مستری بولا

"یار مصیبت میں مجا بھی تو ہے"۔ بیچو درزی کھی کھی کر کے ہنسا۔ اس کے سارے دانت پیلے ہو رہے تھے۔

"ہنسو مت۔" عبدالرؤف چیخا۔ "یہ ہنسنے کا وقت نہیں ہے۔ فیصلے کی گھڑی ہے۔ تم کو یاد نہیں، خلافت کے زمانے میں کیا ہوا تھا..... بولیں اماں محمد علی کی، جان بیٹا خلافت پہ دے دو۔ پھر جان دینے کی باری آئی ہے۔

"مگر یار عبدالرؤف۔" جمال غوغائی بہت مدھم آواز میں بولا: "خلافت پر جان دے کر ملا کیا؟"

عبدالرؤف آنکھیں نکال کر غرّایا: "تم شاعر لوگ کی یہی بہت خراب عادت ہے۔ عمل کے وقت پیچھے ہٹ جاتے ہو"

"نہیں یار۔ پیچھے ہٹنے کی کیا بات ہے؟ اور میرے آگے رہنے سے بھی کیا ہو جائے گا۔ میں تو بس یونہی پوچھ رہا تھا۔

جمال غوغائی اتنا بول کر چپ ہو گیا، گونگا پہلو پر پہلو بدلتا رہا اور ماشاء اللہ ہوٹل میں بھانت بھانت کی آوازیں گونجتی رہیں.... صدام تو مرد مجاہد ہے.... پھر ایک نئی کربلا درپیش ہے.... اب کے صدام بیت المقدس کو آزاد کرا کے دم لے گا.... مگر کویت پر اسے قبضہ نہیں کرنا چاہیئے تھا.... کویت اور سعودی کے حکمراں تو ایک نمبر کے عیاش ہیں، صدام نے اپنی دولت کا صحیح استعمال کیا....."

عین اسی وقت کسی اسٹیشن سے خبریں آنے لگیں...." بنکر پر حملہ اتنا شدید تھا کہ بم آٹھ فٹ موٹی چھت پھاڑ کر اندر گھس گیا۔ اندازے کے مطابق اس بنکر میں ۷۰۰ استرہ سو اشخاص نے پناہ لے رکھی تھی۔

اطلاعات مظہر یہ ہیں کہ پناہ لینے والوں میں زیادہ تعداد عورتوں اور بچوں کی تھی۔ امریکہ نے اس بنکر کو فوجی تنصیب کیا ہے"۔

اسی وقت عید محمد موذن جلیل خاں کو بتا رہا تھا کہ میری مسجد کا جو صدر ہے وہ بہت جھوٹ بولتا ہے۔ مگر مقامی تبلیغی جماعت کا امیر ہے اور محلے میں تبلیغی جماعت کا اثر دن بدن بڑھتا جا رہا ہے اس لئے اس کی حمایت کو بھی لوگ مل جاتے ہیں۔

عراق پر امریکی حملہ جاری تھا۔

گونگے نے بے چینی سے پہلو بدلا، ٹھنڈ کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ اس نے اپنے بیٹے کی، کلکتہ سے بھیجی کمبل اپنے اردگرد کس کر لپیٹ لی اور جمال غوغائی کو گھر جانے کا اشارہ کیا جس کے بیٹے پر کھانسی کا دورہ پڑا ہوا تھا۔

جمال غوغائی نے گونگے کے اشاروں پر کوئی توجہ نہیں دی۔ اس وقت تو وہ وہاں موجود لوگوں کو کل کے مظاہرے میں پڑھی جانے والی نظم سنا رہا تھا۔ ہم مرد مجاہد ہیں / ہم عدل کا ساماں ہیں / ہم عزم کا عنواں ہیں / ہم نے ہی زمانے کو / اخلاق سکھایا ہے / ہم جب بھی اٹھے / تب تب / ہر فتح ہماری ہے / ہر ملک ہمارا ہے / ہم مرد مجاہد ہیں....."

گونگے کو پھر وہ بچہ یاد آیا۔۔

آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے لوگ اٹھتے گئے۔ رات گہری ہوتی جا رہی تھی۔ ٹھنڈ اور بڑھ گئی تھی۔ عید محمد موذن کا سب سے برا حال تھا، ایک ہاف سوئٹر اور اس پر ایک سوتی چادر جمال غوغائی کے بدن پر پرانی ہی سی مگر گرم چادر تو تھی۔ پھدو مستری پرانا فل سوئٹر پہنے تھا اور کمبل اوڑھے ہوئے تھا۔ سرد ہوا سب کے بدن چیرتی ریڑھ کی ہڈی میں اترتی چلی جا رہی تھی۔ بس جنگ کی باتیں کچھ گرمی پیدا کرسکتی تھیں مگر خبریں بھی تو نہیں آپا رہی تھیں!

''لوگوں پر بم گرتا ہوگا تو کیسا تڑپ کر دم توڑتے ہوں گے؟'' جمال غوغائی بدبدایا

گونگے نے چھپا کر اسے دیکھا.... یہ اب تک گھر نہیں گیا۔ اس کا بیٹا بیمار ہے''

''بھائی اللہ کی مرضی میں کس کا دخل؟'' پھدو مستری نے ٹھنڈا سانس لیا اور اچانک ایسا لگا جیسے سردی دوگنی ہوگئی۔

''برف گرنے لگی۔'' گونگے نے آسمان طرف دیکھ کر سوچا.... آسمان بالکل صاف تھا مگر گونگے کو ایسا محسوس ہوا جیسے آسمان گدلا گیا ہے.... گاڑھا مٹ میلا دھواں.... اسے لگا اس کا دم گھٹ جائے گا۔

''دیکھو، یاد رکھنا۔ کل جلسے میں سب لوگ آنا''۔ جمال غوغائی نے یاد دلایا۔

''ہاں بھائی۔ کل ہمارے شاعر کو خوب داد ملنی چاہیئے''۔ عبدالرؤف ہنسا۔

پھر سب آہستہ آہستہ کسی نہ کسی موڑ پر مڑتے گئے۔

جمال غوغائی جب اپنے گھر پہنچا تو ساڑھے دس بج چکے تھے۔ سب بچے سو گئے تھے۔ صرف بیوی بیمار بچے کو لئے جاگ رہی تھی۔ دروازہ اسی نے کھولا مگر کچھ بولی نہیں۔ جمال غوغائی اس کا چہرہ دیکھ کر جھینپ گئے۔''ذرا دیر ہوگئی، بابو کیسا ہے؟''۔

بیوی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ گود میں لئے بچے کے منہ پر سے آنچل ہٹا دیا۔ ہڈیوں کا پنجر، ستا ہوا بے جان چہرہ جیسے کسی نے کپڑے کو کس کر نچوڑ دیا ہو۔ کمزوری کے سبب آنکھ پوری طرح نہ کھل رہی تھی نہ بند ہو رہی تھی۔ پیاس کے غلبے کے سبب منہ کھلا ہوا۔ خشکی سے زبان کانٹے کی طرح کھد کھدی!

''کھانسی رک گئی ہے نا؟''۔

''پندرہ منٹ سے تو رکی ہوئی ہے''۔

اچانک جمال غوغائی چونکے: بی بی سی کا وقت ہو رہا ہے"۔

بی بی سی سے خبریں نشر ہونے لگیں...." دوسری جنگِ عظیم کے بعد سب سے بڑا ہوائی حملہ!"

بچے پر پھر کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔

" ہم آخری دم تک جنگ کریں گے"۔

بچے کا بدن اینٹھنے لگا۔

" ہم مردِ مجاہد ہیں"۔ جمال غوغائی نے اپنی نظم یاد کی اور کل کے جلسے کے بارے میں سوچا۔

بیوی بچے کی تکلیف دیکھ کر رونے لگی۔

" عراق کا آسمان امریکی طیاروں سے بھرا ہوا ہے"۔ خبریں مسلسل آ رہی تھیں۔

" اللہ کی مرضی میں کس کا دخل؟" پھر دمستری کا حملہ یاد آیا۔

" بیوقوف عورت کیوں روتی ہے؟ اللہ چاہے گا تو بابو کو کچھ نہیں ہوگا"۔

جمال غوغائی نے بیوی کو ڈانٹا۔

" نئی دنیا کا" تازہ شمارہ سامنے پڑا تھا.... نوسٹر یڈمس کی پیش گوئی!۔

" امریکہ کی کامیاب جنگی حکمتِ عملی کے سبب جنگ کا پلڑا امریکہ کے حق میں جھک چکا ہے"۔ مبصر اپنی رائے پیش کر رہا تھا۔

بچہ کھانستے کھانستے دم توڑنے کی منزل میں آ گیا مگر مرا نہیں۔

عراق اور امریکہ کی جنگ جاری تھی۔ اللہ کی مرضی میں کس کا دخل؟

جمال غوغائی کے بصری اور بی بی سی کے صوتی منظر نامے میں گونگا کہیں فٹ نہیں ہوتا..... اس لئے نظر بھی نہیں آتا۔ مگر وہ کہیں تو ہوگا۔ اور جہاں ہوگا وہاں پہلو پر پہلو بدل رہا ہوگا۔ بولنے کی خواہش رکھنے والے گونگے کا یہی تو اصل مسئلہ ہے کہ وہ دوسروں کی باتیں سمجھ لیتا ہے مگر دوسرے اس کی بات نہیں سمجھ پاتے.....!!

☆☆☆

لڑکی کو رونا منع ہے

بدر الدجیٰ صاحب اپنے کمرے میں، ایزی چیئر پر بیٹھے ہوئے تھے، ہاتھوں میں کوئی کتاب تھی، کتاب کھلی ہوئی تھی، پہلی نظر میں یہی محسوس ہوتا تھا کہ دجیٰ صاحب کتاب پر نظریں ٹکائے ہوئے ہیں، مگر ان کی نظر کتاب کرسی سے آگے باہر کی زمین کے اس حصے پر ٹکی ہوئی تھی، جہاں ایک کاکروچ کو، جو پتہ نہیں کیسے الٹ گیا تھا، چونٹیوں کے ایک غول نے گھیر لیا تھا، شروع کے چند لمحات تک کاکروچ چھٹپٹاتا رہا اور بار بار سیدھا ہونے کی کوشش بھی کرتا رہا، مگر چیونٹیوں کے ہجوم کے تابڑ توڑ حملے نے اسے بالکل ادھ مرا سا کر دیا اور جو کسر باقی رہ گئی تھی، وہ چیونٹیوں کی ہر تازہ کمک پوری کیے جا رہی تھی۔

دجیٰ صاحب کی کرسی سے ذرا پرے، ڈبل بیڈ کے ایک حصے پر ان کی اہلیہ رافعہ احمد شاید عصر کی نماز سے فارغ ہو کر دعا میں مصروف تھیں، ان کے ہاتھ آسمان کی طرف بلند تھے اور چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

کمرے کے سامنے اوسط درجے کا دالان تھا جس کے ایک حصے میں دجیٰ صاحب کا چھوٹا لڑکا خاموش بیٹھا تھا، حالاں کہ اس کا لباس بتا رہا تھا کہ وہ کہیں جانے کے لیے تیار ہے، مگر بیٹھنے کا انداز بتا رہا تھا کہ کہیں جانے کا ارادہ نہیں ہے۔

اسی دالان کے وسط میں واقع کمرہ دجیٰ صاحب کی بیٹی برجیس کا ہے۔ برجیس کمرے ہی میں تھی، ابھی کچھ دیر پہلے وہ مسہری پر چپ لیٹی تھی، پھر اٹھ کھڑی ہوئی، ٹی وی کا سوئچ دبایا، ریموٹ پر انگلی رکھی اور بی بی سی سے خبریں آنے لگیں، پانچ سات منٹ بعد اس نے ٹی وی بند کر دیا۔ کتابوں کے ریک پر سے کوئی کتاب اٹھالی، اس کا ایک صفحہ کھولا، دو صفحوں کے بیچ ایک

تصویر تھی، برجیس کچھ دیر تک وہ تصویر دیکھتی رہی پھر اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں، اس نے کتاب بند کردی اور دریچے پر ٹنک کر باہر دیکھنے لگی۔

فضا میں گرد و غبار کی آمیزش تھی، سہ پہر جا رہی تھی، شام کی آمد آمد تھی، مگر موسم کی سختی، تمازت اور رات پنے پن میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ برجیس دریچے سے سر ٹکائے کھڑی رہی۔ اس کے آپے سراپے میں ایک عجب سا خالی پن بھنور یا بگولے کی طرح چکراتا پھر رہا تھا۔ وہ موجود تھی کمرے میں، دیکھ رہی تھی کمرے سے باہر اور کمرے کے باہر جہاں اس کی نظر ٹکی تھی وہاں وہ کچھ نہیں دیکھ پا رہی تھی۔ ایک حاضر غیب میں تبدیل ہو گیا تھا اور ایک غیاب لپ جھپ کرتا اس کی طرف دوڑا چلا آ رہا تھا۔

چھوٹی پھوپھی پاکستان سے آئیں تو گھر میں جیسے بھونچال سا آ گیا۔ دراصل چھوٹی پھوپھی پندرہ برس کے بعد آئی تھیں اور پندرہ برس پہلے بھی وہ پندرہ سولہ برس پر ہی آئی تھیں۔ دراصل ۱۹۶۰ء کے بعد پھوپھا کا جی اچاٹ ہوا اور وہ سب لوگوں کی مخالفت کے باوجود مشرقی پاکستان چلے گئے۔ پڑھے لکھے آدمی تھے اور محنتی بھی، دو تین برس میں کافی ترقی کی، اونچا عہدہ بھی پایا اور مال و دولت کی فراوانی بھی ہوئی۔ اس زمانے میں پھوپھا ہندوستان میں رہ جانے والے ہر مسلمان کو بیوقوف سمجھتے تھے اور پاکستان چلے آنے کا مشورہ دے ڈالتے تھے۔ کئی غریب اور بیکار رشتہ داران کی بات مان بھی گئے، مگر دجی صاحب پر بہنوئی کی باتوں کا کوئی اثر نہ پڑا۔ دجی صاحب پی ڈبلیوڈی میں اوورسیر تھے۔ معتدل مزاج، اوسط آمدنی اور اوسط درجے کی طرز رہائش کے عادی، ولی فرشتہ نہیں تھے، مگر شیطان بھی نہیں تھے۔ مشہور یہی ہے کہ کسی کام کے ہو جانے پر کوئی کچھ بخشش دے دیتا تو شکریے کے ساتھ قبول کرتے، مگر کبھی کسی کام کے لیے کسی سے کوئی تقاضا نہیں کیا، زبردستی نہیں کی، کام روکا نہیں، اس لیے خلق خدا میں ان کی پہچان ایک شریف آدمی کی تھی۔ اللہ نے تین بیٹیوں اور دو بیٹوں سے نوازا تھا، دو بیٹی اور ایک بیٹے کی شادی کر چکے تھے۔ بڑا بیٹا شری ہری کوٹا میں سائنٹسٹ تھا، چھوٹا تعلیم مکمل کر کے نوکری کی تلاش میں تھا اور چھوٹی بیٹی کا بی۔اے کا امتحان ختم ہوا تھا کہ چھوٹی پھوپھی پاکستان سے آ گئیں۔

چھوٹی پھوپھی پاکستان جانے کے بعد پہلی مرتبہ ۱۹۷۱ء کی جنگ کے بعد آئی تھیں۔ لٹی پٹی، کپڑے لتے کو بھی محتاج۔ برجیس اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئی تھی، اماں نے بتایا تھا کہ اس

وقت پھوپھا کی بولتی بند تھی۔ دجی صاحب شریف آدمی، چاہتے تو پھوپھا کی پچھلی اینڈ بینڈ باتوں کا حساب چکا سکتے تھے، مگر انہوں نے بالکل ہونٹ سی لیے اور بہن بہنوئی کی دل جوئی کی ہر ممکن کوشش کی، یہاں تک کہ ایک لمحہ ایسا بھی آیا کہ پھوپھا صاحب پھر ہندوستان میں رہنے کی بات سوچنے لگے تب دجی صاحب نے اس خیال کی کھل کر مخالفت کی۔ ان کا کہنا تھا کہ پاکستان جانا ہی نہیں چاہئے تھا، لیکن اب چلے گئے تو وہیں رہو، ہندوستان میں لک چھپ کر رہنا دوسری غلط بات ہوگی۔ پھوپھا صاحب نے پتا نہیں کیسا محسوس کیا، مگر غور کیا تو دجی صاحب کی اس ہدایت پر عمل کرتے ہی بنا۔ دجی صاحب نے بہن بہنوئی کی ہر ممکن طور پر مدد کی۔ ہندوستان آنے جانے تک۔ دجی صاحب نے ایک پل کے لیے بھی بہن بہنوئی یا ان کے بچوں کو مصیبت زدہ ہونے کا احساس نہیں ہونے دیا۔

رب کا کرم کہ پاکستان جانے کے بعد پھوپھا صاحب نے پھر ایک بار سہارا لیا اور آہستہ آہستہ اوپر اٹھنے لگے۔ اسی زمانے میں پھوپھی دوبارہ ہندوستان آئی تھیں۔ برجیس اس وقت سات آٹھ برس کی رہی ہوگی۔ اسے یاد تھا، جانے کے وقت پھوپھی اور اس کی امی گلے مل مل کے روئی تھیں۔ بعد میں ماں نے بتایا تھا کہ وہ زمانہ بنگلہ دیش میں لٹنے پٹنے کے بعد پاکستان میں پھوپھا صاحب کے دوبارہ قدم جمانے کی کوشش کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں بھی دجی صاحب نے بہن بہنوئی کو ایک پیسہ خرچ نہیں کرنے دیا تھا۔ اس بات کو چودہ پندرہ برس گزر چکے تھے۔

پچھلے پانچ برسوں میں خدا نے پھوپھا صاحب پر پھر فضل و کرم کی بارش کی۔ سو اب کے جو پھوپھا صاحب ہندوستان آئے تو گویا فرض اور قرض دونوں چکانے کے موڈ میں تھے۔ اول تو تمام بال بچوں کے ساتھ آئے۔ فرداً فرداً سب کے لیے تحفہ تحائف لے کر آئے۔ علاوہ اس کے جی کھول کر خرچ بھی کیا، عزیزوں رشتہ داروں سے ملنا جلنا، سب کے گھر آنا جانا، روز پھوپھا کی طرف سے کسی نہ کسی رشتہ دار کی دعوت۔ چھوٹی پھوپھی پاکستان سے آئیں تو گھر میں جیسے بھونچال سا آ گیا۔۔۔

حالاں کہ سب سے بڑا بھونچال تو برجیس کا چھوٹا پھوپھی زاد بھائی ریحان تھا۔ گیارہ برس کا نٹ کھٹ شیطان، بہت ذہین، تیز، دیکھنے میں اسمارٹ، مگر شرارتی ایک نمبر کا۔ اس کی رگ رگ میں جیسے پارہ بھرا تھا۔ ایسا لگتا جیسے نچلا بیٹھنا اس نے سیکھا ہی نہ ہو۔ برجیس سے اس کی دانت

کافی دوستی بھی تھی اور دونوں ایک دوسرے کو چڑانے سے بھی باز نہ آتے۔

مگر اس دن تو ریحان کے چڑانے پر برجیس بالکل ہاتھ پیر سے اکھڑ گئی۔ پہلی مرتبہ تو جی چاہا کہ ایک جھانپڑ کس کر رسید کردے، مگر بچہ اور مہمان سمجھ کر طرح دے گئی۔ صرف ڈانٹ کر اتنا کہا: ''ریحان تمیز سیکھو، بڑی بہن سے بدتمیزی نہیں کرتے۔''

''میں بدتمیزی نہیں کر رہا ہوں۔'' وہ چپ ہونے کے بجائے کان پر ہاتھ رکھ کر الاپنے لگا: ''خدا بڑی بہن کو بھابھی بنائے تو میں کیا کروں؟''۔

''تری تو....'' جھلاہٹ میں برجیس نے ریحان پر تکیہ کھینچ مارا۔

''بھابھی والی حرکت ابھی سے شروع؟'' ریحان نے ہنستے ہوئے تکیہ ہاتھوں پر روکا اور بھاگنے کے بجائے برجیس کے نزدیک آ گیا اور بہت سنجیدہ ہو کر بولا: ''میں جھوٹ نہیں کہہ رہا ہوں، مذاق بھی نہیں کر رہا ہوں۔ ابا، امی، ماموں جان، ممانی جان، سب نے یہ طے کر لیا۔''

اتنا کہہ کر وہ کمرے سے یہ جا اور وہ جا اور برجیس کمرے میں تنہا، بھونچکی، روہانسی چہرہ لیے بس اس دروازے کو تکتی رہی جس سے ریحان باہر نکلا تھا۔

جس دن یہ واقعہ ہوا، اس کے دو تین دن بعد پھوپھی جان وغیرہ پاکستان روانہ ہو گئیں، بقیہ کے چند دنوں میں برجیس نہ چاہتے ہوئے بھی ریحان سے کنی کاٹتی رہی اور ریحان برجیس کے گرد منڈلاتا رہا جس دن کی بات ہے اس دن تو اس نے ریحان کی شوخی سمجھ کر سر جھٹک دیا تھا، مگر پھر رات میں جب وہ پھوپھی کی مسکراہٹ، پھوپھا کی توجہ اور پھوپھی زاد بہنوں کے جملوں پر غور کرنے لگی تو سب کا سرا ریحان کی کہی بات سے جڑنے لگا۔ اور پھر آخری دن تو مطلع ہی صاف ہو گیا۔

صبح کے ناشتے کے بعد سب ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے۔ امی نے پکار کر کہا: ''برجیس! چائے یہیں لے آؤ۔'' برجیس نے چائے بناتے بناتے سوچا: ''لو آج یہ کیا سوجھی۔ روز تو چائے ڈائننگ ٹیبل پر ہی پی جاتی تھی۔'' بہر حال امی کا حکم تھا اس لیے وہ چائے لے کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔

ڈرائنگ روم میں سامنے ہی صوفے پر عرفان بیٹھے ہوئے تھے۔ عرفان کے بغل میں ان کے بڑے بھائی فیضان، تھری سیٹر صوفے پر دجی صاحب، پھوپھا صاحب اور ایک کنارے

ریحان میاں براجمان تھے۔ اس کے سامنے والے تھری سیٹر صوفے پر امی اور پھوپھی جان اور سامنے کے صوفے کی مخالف سمت میں رکھے دو صوفوں پر عرفان کی دونوں بڑی بہنیں۔

برجیس سب کو چائے دے کر جانے لگی تو پھوپھی نے اسے پکارا۔ "آؤ بیٹا۔ تم بھی بیٹھو۔" پھوپھی نے اپنے پاس کی خالی جگہ کی طرف اشارہ کیا۔ امی کا انداز بھی حامی بھرنے والا تھا۔ انکار کی کوئی وجہ نظر نہیں آئی۔ وہ خاموشی سے خالی جگہ پر جا بیٹھی۔

کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں، پھر اچانک پھوپھی نے ٹیبل پر پڑا اپنا پرس اٹھایا اور اس میں سے سونے کا ایک ہار نکال کر برجیس کے گلے میں ڈال دیا۔ برجیس ایک منٹ کے لیے ہک بک رہ گئی۔ "پھوپھی جان یہ کیا؟ آپ میرے لیے تو سوٹ لا ہی چکیں"۔ اس نے حیرت کے لہجے میں انکار کرنا چاہا تو پھوپھی نے ڈانٹ دیا: "تو کیا ہوا؟ میں اپنی بیٹی کے لیے ایک ہار نہیں لا سکتی؟"

ابھی وہ اس ایک وار سے سنبھلی بھی نہیں تھی کہ ریحان کی سب سے بڑی بہن تحسین آپا نے ایک ڈبہ کھول کر اس کی گود میں رکھا اور ہنستے ہوئے بولیں۔

"آج ہم لوگ جا رہے ہیں۔ یہ الوداعی تحفہ ہے۔" ڈبے میں کان کے خوب صورت سے ٹاپس جھلملا رہے تھے۔ تحسین آپا کے بیٹھتے بیٹھتے بعد والی بہن سلطنت آپا اس کے پاس آ گئیں اور ایک خوب صورت سا مانگ ٹیکا اس کے ہاتھوں پر رکھ دیا اور بڑی شائستگی سے ہنس کر بولیں: "میں تو امریکہ چلی جاؤں گی۔ کب لوٹوں کوئی ٹھکانہ نہیں، جب تمہاری شادی ہو تو اسے میری طرف سے پہن لینا۔"

برجیس سمجھ بھی رہی تھی کہ کیا ہو رہا ہے، شرم سے چہرہ دو آتشہ بھی ہوا جا رہا تھا کہ یہ ہو رہا ہے، مگر نہ تو وہ کچھ کہہ پا رہی تھی، نہ ہی اپنی شرم برقرار رکھ پا رہی تھی۔ برجیس کے کچھ خاص رشتہ دار جانے کے وقت اسے صرف کچھ تحفہ ہی تو دے رہے تھے۔

ایک مرتبہ ان جانے میں اس کی نگاہ ریحان کی طرف اٹھ گئی۔ وہ بدمعاش آہستہ آہستہ مسکرائے جا رہا تھا۔

اچانک اسے احساس ہوا کہ ریحان کے سب بھائی بہنیں بیٹھے ہیں۔ وہ آپ ہی آپ شرم سے دوہری ہو گئی۔ امی نے شاید اس کی پریشانی محسوس کر لی۔ آہستہ سے بولیں: "جاؤ بیٹا۔ ذرا بوا کا ہاتھ بٹا دو۔ دوپہر کا کھانا ذرا سویرے کھا لیا جائے تو کچھ آرام کا موقع مل جائے گا اسٹیشن

کے لیے تو تین بجے ہی روانہ ہونا ہے۔"

اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ، برجیس جو سرپٹ بھاگی تو اپنے کمرے میں آ کر ہی دم لیا، مگر اسے پتہ نہیں تھا کہ ابھی آزمائش کا ایک لمحہ باقی ہے۔

دوپہرہ کھانا نسبتاً سویرے ہی تمام ہوا، سب نے ذرا آرام کرلینے کی غرض سے کمروں کا رخ کیا۔ برجیس بھی اپنے کمرے میں چلی آئی۔ وہ صبح سے کچھ عجیب سی کیفیت کے حصار میں تھی۔ ریحان کے مذاق نے جو گمان کی صورت پیدا کی تھی وہ اب یقین میں بدلتا چلا جارہا تھا، مگر اسے اس بات پر غصہ آرہا تھا کہ کوئی خود اس سے کھل کر کچھ کہتا کیوں نہیں۔ ویسے اپنے باپ ماں کی عادت سے واقف تھی۔ دونوں ہی غم یا خوشی کسی بھی لمحے میں آپے سے باہر ہونے والوں میں نہیں تھے۔ ماں باپ کے کمرے میں آتے جاتے اس نے دونوں کی جو سرگوشیاں سنیں اس سے بھی اندازہ ہوا کہ کسی خاص معاملے میں ماں باپ مطمئن ضرور تھے، مگر وقت سے پہلے اعلان کو غیر ضروری سمجھ رہے تھے۔ امی کا ایک جملہ تو اس خاص معاملے کی طرف بالکل واضح اشارے کررہا تھا۔ ہوا یوں کہ گزشتہ شب جب برجیس باپ کے لیے دودھ لے کر ان کے کمرے کے پاس پہنچی تو اچانک ٹھٹھک گئی۔ کمرے کا پردہ برابر تھا اور امی کے آہستگی کے ساتھ کچھ بات کرنے کی آواز آرہی تھی۔ یہ ایک نئی بات تھی کیوں کہ دجی صاحب کے کمرے کا پردہ اس طرح بالکل برابر کبھی نہیں رہتا تھا کہ اندر کا کچھ بھی دکھائی نہ دے۔ وہ ایک منٹ کے لیے ٹھٹھک گئی۔ ٹھٹھک کے کھڑے ہوجانے کے اس لمحے میں اسے ماں کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھیں: "اچھی بات ہے۔ ان لوگوں کی شرافت ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ ہمیں منہ نہیں کھولنا پڑا۔ ہم انکار بھلا کیوں کریں؟ لیکن ہمارے بچے باہر ہیں۔ اعلان تو ان کی موجودگی میں ہی ہوگا۔"

اتنا ہی سن پائی تھی کہ اچانک مخالف سمت سے کسی کے آنے کا احساس ہوا اور وہ ہڑبڑا کر پکار اٹھی ....." امی!"

"ہاں بیٹا۔ آؤ۔" امی یا ابو کسی کی آواز آئی۔ دونوں نے اسے پیار بھری نظروں سے دیکھا اور دجی صاحب مسکرا کر بولے: "بیٹا۔ تم میرا کولسٹرول بڑھا کر دم لوگی؟"

"جی نہیں۔" برجیس نے دودھ کا گلاس باپ کے منہ سے لگاتے ہوئے کہا:

"Its Fat FreeMilk" جب وہ باپ کو دودھ پلا کر کمرے سے نکل رہی تھی تو باپ

کا جملہ سنائی دیا: ''اللہ خوش بخت بنائے.... اپنے گھر خوش رہے۔''

اس رات وہ اپنے بستر پر تکیے میں منہ چھپا کر سسک سسک کر روئی.... اس رات بار بار سنے گیت کا ایک بول اسے بار بار یاد آتا رہا.... بھیا کو دیہو محلا دو محلا.... پھر یاد آتا.... اس سے تو کسی نے کچھ کہا نہیں.... مگر یہ ہار، ٹاپس، مانگ ٹیکا؟ برجیس کے گرد ایک عجیب کیفیت کا گھیرا تنگ ہوتا جارہا تھا.... وہ یہ سوچ کر رونا چاہ رہی تھی کہ اسے اتنی دور، دوسرے ملک میں پھینکا جارہا ہے، مگر وہ رو نہیں پارہی تھی کہ آخر کسی نے یہ کہا تو نہیں تھا کہ اس کی ڈولی غیر ملک کی مٹی پر رکھی جائے گی اور اس کا ڈولا غیر ملک کی مٹی سے ہی اٹھایا جائے گا۔ پھر وہ سوچتی چلو خوش ہوا جائے، آخر ہار، ٹاپس، مانگ کا ٹیکا کا ہے کو ملا ہے؟ مگر پھر گڑبڑا جاتی۔ کسی بندے نے بھی پھوٹے منہ یہ نہ کہا کہ: ''برجیس بی بی۔ مبارک باد، تم ہماری بہو بن رہی ہو..... ہماری بھابھی بن رہی ہو۔''

''مگر ریحان نے تو کہا:'' آخر اسی چھوٹے بچے نے سہارا دیا جس پر برجیس نے تکیہ کھینچ مارا تھا۔

کل رات پھپھک پھپھک کر رونے والی برجیس، آج دوپہر میں بستر پر پڑی آپ ہی آپ مسکرادی۔

چاروں طرف سناٹا تھا۔ گرمی کی دوپہر میں کھانے کے بعد، بستر سے ٹیک لگانے پر عموماً نیند آ ہی جاتی ہے اور جب ہر کمرے میں کولر بھی چل رہا ہو تو پھر نیند کو روکنے والا کون ہوتا ہے۔ سب سو رہے تھے، چاروں طرف سناٹا براج رہا تھا۔ صرف برجیس جاگ رہی تھی اور کچھ عجب سی بے نام کیفیت کے حصار میں تھی...... اندر اندر دھیرے دھیرے ہلکورے لیتا کوئی عجب سا سر..... شہنائی کی دھن جیسا کچھ..... اسے لگا وہ جہاں ہے وہاں نہیں ہے.... پھر اسے لگا وہ جہاں ہے وہاں کچھ عجیب رنگ.... پھر محسوس ہوا کہ رنگ نہیں کچھ عجب رنگ کے بادل.... پھر شبہ ہوا، شاید پھوار .... شاید تپتی سلگتی زمین پر پانی کے کسی قطرے کی ایک ہلکی سی.... مدھم سی چاپ.... دستک..... دستک.... وہ چونک اٹھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی..... اس نے غور کیا تو اس کا شک یقین میں بدل گیا۔ کوئی بہت آہستگی کے ساتھ اس کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

برجیس کے کمرے کا دروازہ بند نہیں تھا، صرف پردہ برابر تھا۔ دروازہ بند کر کے سونے کی، کسی کی عادت ہی نہیں تھی۔

"پھر یہ دستک؟" اچانک وہ بہت گھبرا سی گئی..... مگر دستک تو تھی اور اسی کے دروازے پر تھی۔

اس کے آپے سراپے میں جیسے گھبراہٹ کا کوئی ریوڑ سا در آیا۔ وہ سمجھ ہی نہیں پا رہی تھی کہ یہ دستک چاہی ہے یا ان چاہی..... مگر دستک تو تھی اور اسی کے دروازے پر تھی۔ اس کے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے، وہ دروازے تک جانا چاہ رہی تھی اور جا نہیں پا رہی تھی..... پھر بھی، شاید اس کے بستر سے اٹھنے کی آہٹ پا کر دستک رک گئی تھی، مگر چوکھٹ پر کسی کے ہونے کا احساس مسلسل دستکیں دے رہا تھا۔

وہ کس طرح دروازے تک پہنچی، کس طرح اس نے پردہ اٹھایا، کس طرح اس نے نظریں اٹھائیں، اسے یاد نہیں تھا۔

اس کے اندر تو بس ہولے ہولے ہلکورے لیتا کوئی بے نام سر تھا..... نہیں رنگ..... نہیں بادل..... نہیں چھاؤں..... پتہ نہیں کیا کچھ تھا..... مگر کچھ تھا، اندر بھی، باہر دروازے پر بھی..... دروازے کے پورے جسم پر چھایا ہوا۔

عرفان دروازے پر کھڑا ہوا تھا۔

"میں اندر آ سکتا ہوں؟"

برجیس رنگے ہاتھوں پکڑے گئے کسی گونگے چور کی طرح چپ کھڑی تھی اور اندر اندر اپنے آپ پر قابو پانے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی، مگر چہرہ من کے باؤلے پن اور بیاکل ہونے کی چغلی کھا رہا تھا۔

"کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟" ۔ عرفان نے مسکراتے ہوئے پھر بہت نرمی اور آہستگی سے پوچھا۔

وہ جواب تو اب بھی نہ دے پائی، مگر دروازے کا پردہ اس انداز سے ہٹایا جیسے وہ آنے والے کو رستہ دے رہی ہو یا اندر آنے کا اشارہ کر رہی ہو۔۔۔۔

اب صورت حال یہ تھی کہ عرفان کمرے کے اندر تھا اور برجیس کمرے کے دروازے پر، پردے کے پاس۔

"کیا آپ باہر جا رہی ہیں؟"۔

برجیس کا سر آپ ہی آپ انکار میں ہل گیا۔

''تو دروازے سے کمرے میں تو آیئے۔''

برجیس دو چار قدم چل کر کمرے میں رکھے اس ٹیبل کے دوسری طرف کھڑی ہوگئی جس کی مخالف سمت میں عرفان کھڑا تھا۔

برجیس نظریں جھکائے خاموش کھڑی رہی اور عرفان اسے دیکھتا رہا اور مسکراتا رہا۔ جب خاموشی کا عرصہ طویل ہونے لگا تو عرفان کھنکھارا پھر آہستہ سے بولا: ''میں جانتا ہوں۔ تمہیں خبر مل چکی ہے۔'' عرفان کی آواز بہت دور سے آتی محسوس ہوئی۔

برجیس جھینپولڑکی نہیں تھی، کالج کی طالب علم، اسمارٹ، بذلہ سنج، عام دنوں میں دوستوں کے درمیان اپنی حاضر دماغی اور حاضر جوابی کے لیے مشہور، مگر اس وقت اسے نہ جانے کیا ہوا کہ عرنان کی آواز سنتے ہی وہ شرم سے گلنار ہوگئی اور کمرے کے در و دیوار نے اگلا منظر صرف یہ دیکھا کہ برجیس دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپائے کھڑی ہے اور کانپ رہی ہے۔

''مگر۔'' عرفان کی آواز مزید مدھم اور بوجھل ہوگئی.... ''مگر مجھے پتہ نہیں تم کیا سوچتی ہو؟''

برجیس نے اپنے پیروں کی کپکپاہٹ محسوس کی، سوچا کہ بیٹھ جائے، مگر بیٹھ نہ پائی۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو اپنے چہرے پر محسوس کیا، چاہا کہ چہرے سے ہٹالے، مگر ہاتھ چہرے کو ڈھکے ہی رہے۔ اس نے سوچا کہ وہ عرفان سے کہے کہ تین دنوں سے جو کچھ ہو رہا ہے، اس میں کب کسی نے میری مرضی جاننے کی کوشش کی، مگر وہ ایک لفظ ادا نہ کر پائی۔

برجیس کی آزمائش کی اس کیفیت پر، چند پل گزرے ہوں گے کہ اچانک باہر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور عرفان ہڑبڑا کر باہر نکل گیا۔ وہ ایک ٹھنڈا اور مہربان پل تھا، جو ہوا کہ جھونکے کی طرح آیا اور گزر گیا۔

اس بات کو سال بھر گزر گیا تھا۔ چھوٹے بھائی سے ملنے والی خبروں کے مطابق عرفان پٹرو کیمیکل میں انجینیرنگ کی پڑھائی مکمل کر کے عراق چلے گئے تھے اور وہاں کسی اچھے عہدے پر فائز ہو چکے تھے۔

چھوٹی پھوپھی کے پھر ہندوستان آنے کی خبر تھی اور برجیس کے بھائی بہنوں نے بھی اسی وقت گھر آنے کا پروگرام بنایا تھا۔ ڈپٹی صاحب یا کسی نے بھی برجیس سے تو کچھ کہا نہیں، مگر جو

تیاری تھی، اس سے اندزہ رہا تھا کہ گھر میں کسی کی شادی ہونے والی ہے۔

ایک پر مسرت اور ہمہ ہمی کے ماحول والے گھر میں۔۔تب اچانک ایک خبر آئی!

اچانک وہ بات ہوگئی جس کے بارے میں سوچا بھی نہیں گیا تھا۔۔۔

جس وقت بہن نے فون پر پہلے، عرفان کی نوکری کی خبر سنائی تھی تو دجی صاحب کو بہت اچھا لگا تھا۔ گفتگو کے دوران انہوں نے کہا تھا: "پٹروکیمیکل کا انجینئر ہے تو اس کا سب سے زیادہ اسکوپ تو وہیں ہے۔"

برجیس کی ماں بھی خوش تھیں، مگر ان کی خوشی کی وجہ دوسری تھی۔ اصل میں ان کو زور زبردستی کرنے والوں سے بہت الجھن ہوتی تھی۔ یہ کیا ظلم ہے؟ جو منہ نہ ڈھانکنا چاہے اس کو بھی مجبوراً عبایا پہننا پڑتا ہے۔

فون ہی پر دونوں طرف سے ایک دوسرے کو مبارک بادیاں دی گئی تھیں اور اب تو خبر ملنے کی گھڑی بھی قریب ہی آرہی تھی۔ گھر میں شادی کی تیاری زوروں پر تھی کہ اچانک وہ بات ہوگئی۔

پوری دنیا میں اتھل پتھل مچ گئی، سب اپنے رشتہ داروں کے بارے میں پریشان تھے۔ کتنے گھروں پر قیامت ٹوٹی تھی اس کا تو پتہ ہی نہیں تھا، سومنہ سو باتیں، دجی صاحب کے یہاں پہلے تو دوسرے رشتہ داروں کا فون آیا، دجی صاحب اس کو افواہ سمجھ کر چپکے ہو رہے، مگر ٹی وی سے چپک ضرور گئے، لیکن یہ خود فریبی چل نہیں پائی۔ دو دن بعد بہن کا فون بھی آ ہی گیا، پہلے کی طرح دجی صاحب کو یقین نہیں ہوا، فون کا چونگا بیوی کے ہاتھ میں دے دیا، دراصل روتی ہوئی بہن کو سمجھانا ان کے بس کی بات نہیں تھی، بیوی فون پر نند کو سمجھاتی بھی رہی اور خود بھی بے چین ہوتی رہی۔ آخر تو اس معاملے سے بیٹی کا معاملہ بھی جڑا ہوا تھا۔

دجی صاحب ایزی چیئر پر تقریباً بے جان سے پڑے رہے اور بے چین نگاہوں سے کمرے کے خلا میں جانے کیا تلاش کرتے رہے۔ بیوی نے کیا کہا کیا سنا، دجی صاحب کو شاید اس کا ہوش ہی نہیں تھا۔ بہت دیر بعد بیوی نے فون رکھا اور تھکی تھکی سی سامنے بچھے پلنگ پر بیٹھ گئیں۔ اس دن دونوں ہی نہ روئے نہ اس مسئلے پر کوئی بات کی۔

مگر دوسرے دن۔ جب پھر فون آیا اور بہن پھر زار زار رونے لگی تو دونوں کا بندھ جیسے ٹوٹ گیا اور دونوں ہی گریہ کا شکار ہوئے۔ کتنے دن خود کو فریب دیا جا سکتا ہے۔ اب تو ہندوستانی

رشتہ داروں کو بھی خبر مل چلی تھی، فون آنے لگے تھے، کئی تو پرسہ دینے خود دجی صاحب کے گھر پہنچ گئے ۔دجی صاحب آبدیدہ ہوئے اور کھل کر اپنے افسوس کا اظہار کیا کہ" میری بہن کے گھر ایسی مصیبت کی گھڑی آن پڑی۔"

اور اس بات پر رب کا شکر ادا کیا کہ مولا۔ تیرا ہزار ہزار احسان کہ برجیس کی بات عام ہونے سے بچ گئی اور دل ہی دل میں اپنی عقلمندی کی خود کو داد دی کہ:" برجیس تک اس کے ماں باپ یا بھائی بہن کی طرف سے یہ بات بطور اطلاع پہنچی نہیں۔"

اسی پہلی یا دوسری خبر کے دو چار دن بعد بدرالدجی صاحب اپنے کمرے میں ایزی چیئر پر بیٹھے ہوئے تھے.....دجی صاحب سے ذرا پہلے ان کی اہلیہ نماز کے بعد دعا میں مصروف تھیں اور ان کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا..... برجیس کتاب بند کر کے دریچے پر آن کھڑی ہوئی تھی۔ فضا میں گرد و غبار کی آمیزش تھی، سہ پہر جا رہی تھی، شام کی آمد آمد تھی، مگر موسم کی سختی، تمازت اور راٹ بٹے پن میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ برجیس دریچے سے سر ٹکائے کھڑی رہی، اس کے آپے سراپے میں ایک عجیب سا خالی پن در آیا تھا، وہ موجود تھی کمرے میں، دیکھ رہی تھی کمرے کے باہر اور کمرے کے باہر جہاں اس کی نظر تکی تھی وہاں وہ کچھ نہیں دیکھ پا رہی تھی۔

اس غیاب میں بس ایک لمحے کا حضور تھا۔

برس ڈیڑھ برس پہلے کا ایک پل لپ جھپ کر رہا تھا۔

کوئی بے نام سر.....نہیں رنگ.....نہیں بادل.....نہیں چھاؤں....."

ایسا محسوس ہوا جیسے کمرے میں کوئی ہے۔

" مجھے پتہ نہیں، تم کیا سوچتی ہو؟" ایک سرگوشی سی سنائی دی۔ اس نے ہڑبڑا کر آواز کا تعاقب کیا۔ آواز کمرے کے باہر سے آئی تھی۔

دریچے سے، کمرے کے باہر، اس نے دور دور تک دیکھا، جہاں تک اس کی نظر گئی، وہاں تک کہیں کچھ نہیں تھا.....صرف مشرق و مغرب ہر طرف سے اور ہر روز وحشت ناک خبروں کے آنے کا سلسلہ جاری تھا.....!

☆☆☆

غم زدہ

بوبو کے انتقال کی خبر بیوی کے ذریعہ اس تک پہنچی تھی۔

دراصل جس وقت فون آیا، وہ شہر سے باہر تھا، ایک فکشن کانفرنس کے سلسلے میں افسانہ نگاروں کی یہ کانفرنس ممبئی میں تھی۔ آتے جاتے ایک ہفتہ گزر گیا۔ واپس آنے کے بعد بھی بیوی نے فوراً نہیں بتایا دوسرے دن جب یونیورسٹی سے لوٹا تو شام کے وقت چائے کے دوران بیوی نے پہلے کچھ ممبئی کی روداد پوچھی، کچھ بچوں کے فون کے بارے میں بتایا اور بچوں کی فون کالس کا ہی سرا پکڑا کر کہنے لگی: "آپ کے جانے کے دوسرے دن گھر سے بھی فون آیا تھا۔ بھابھی بتا رہی تھیں کہ بوبو ادھر کچھ عرصے سے بیمار چل رہی تھیں، پہلے تو پیٹ میں درد کی شکایت ہوئی، کچھ درد مار دوائیں دی گئیں تو وقتی طور پر درد کم ہو گیا مگر جب نہ تب درد پریشان کرتا ہی رہا۔ بچوں نے ڈاکٹر کو دکھایا تو اس نے ریاحی تکلیف بتائی۔ اس کا علاج بھی ہوا مگر آہستہ آہستہ پیٹ کے ایک مخصوص حصے پر سختی سی آتی گئی۔ وہ کہتیں بایو گولا ہے۔ ڈاکٹر نے کہا زخم ہے۔ آپریشن کر دیا، امید تھی کہ افاقہ ہو جائے گا مگر زخم کسی طور مندمل ہونے پر نہیں آرہا تھا، بیچاری بوبو کسی طرح اس کو جھیل رہی تھیں۔ پھر شک ہوا کہ شاید سوگر تو نہیں بڑھ گیا۔ آخر زخم اچھا کیوں نہیں ہو رہا ہے۔ بچوں نے جسم میں شکر کی جانچ کرائی تو اس کا تناسب بالکل صحیح نکلا۔ تب ڈاکٹر نے بایپسی کرنے کو کہا اور آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ ان کو کینسر نکل آیا۔ معلوم ہوا کہ بالکل آخری مرحلہ ہے، تین چار ماہ بوبو نے بہت تکلیف میں گزارا...."

بیوی بولتی رہی، وہ بالکونی کی طرف اٹھ کر چلا گیا۔ اندھیرا چھانے لگا تھا۔ اپارٹمنٹ میں شجر کاری بھی منصوبہ بند طور پر کی گئی تھی۔ سرو، آشوک، شیشم، نیم اور پیپل کے چھتنار درخت

اپارٹمنٹ کی چہار دیواری کے چاروں طرف سر جھائے کھڑے تھے۔ کہتے ہیں۔ یہ وقت درختوں کے سانس لینے کا ہوتا ہے۔ شاید جھٹپٹے کے سمئے میں حبس کا یہ ایک سبب ہو۔

اس نے منہ کھول کر زور زور سے سانس لینے کی کوشش کی۔ ایسا لگا جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہو۔ پھر اس نے پرندوں کی آواز سنی۔ سب اپنے اپنے آشیانے کی طرف لوٹ رہے تھے۔

وہ گھر کب جائے گا؟ اس کا اسے پتہ نہیں تھا۔ کمبخت جب نہ تب یاد کیوں آجاتا ہے؟ اس بار برسات بہت زوردار ہوئی تھی۔ پتہ نہیں ابا اماں کی قبر سلامت رہی یا دھنس گئی۔ گھر میں جس کو دیکھ بھال کے لئے رکھا گیا تھا اس کا فون آیا تھا۔ چھت ٹپک رہی ہے۔ گھر جانا چاہئے تھا مگر وہ کیسے جاتا؟ بچے ملک سے باہر، بیٹیاں سسرال۔ ایک طرف نوکری، دوسری طرف اپارٹمنٹ میں صرف میاں بیوی، دونوں گھٹنے کے درد سے بے حال۔ ایک بھائی وہ بھی شیلانگ میں، دونوں بہنیں تو کب کی ختم ہو گئیں۔ بیچاری بوبو چچازاد بہن تھیں مگر ہمیشہ سے قریب رہیں۔ اس سے عمر میں صرف ایک سال بڑی تھیں اس لئے دونوں کا تم تام چلتا تھا۔ دونوں گھروں کے درمیان کھڑکی تھی جو دونوں گھروں کو ایک بنائے ہوئی تھی۔ جب سب لوگ ایک جگہ رہتے تھے تو کیسی اپنائیت تھی، دونوں گھروں کے درمیان.....

"سوئم تو کل ہی ہو گیا ہوگا۔" بیوی جو کچھ دیر سے بغل میں خوش کھڑی تھی، آہستہ سے بولی۔

"چہلم کے فاتحے میں ہم لوگ چلیں گے"۔ اس کی آواز کسی گہرے کنویں سے آتی محسوس ہوئی۔

"اس میں تو خیر ابھی دیر ہے۔ کچھ پیسہ بھجوا دیا جائے"۔

تس پر اس کی آنکھیں بھر آئیں، اسے یاد آیا، بوبو کے گھر تو سدا غربت کا ڈیرا رہا۔ غریب تو سبھی تھے، پانچ بھائیوں میں کیسی کو بھی فراغت نصیب نہ ہو سکی۔ بڑے تایا تو خیر لاولد ہی رخصت ہوئے، منجھلے کے دو بیٹے تھے، دونوں اپنا حصہ بیچ کر ممبئی گئے تو کبھی لوٹے نہیں اور نہ ہی کوئی تعلق رکھا کہ پتہ چلے کہ کہاں ہیں، کس حال میں ہیں۔

چھوٹے تایا کا بس ایک بیٹا صحیح نکلا، دوسرا تو نکما ہی رہ گیا۔ چھوٹے تایا جب ختم ہوئے تو وہ بہت چھوٹا تھا۔ کسی کے کہنے میں نہیں رہا، بس زبان بہت لمبی ہے، خود سر بھی ہے، اپنے بھائی

کی بات نہیں سنتا، چچیرے بھائی کی بات کیا مانتا۔ بوبو کے ابا منجھلے تایا بھی پڑھ لکھ نہ سکے مگر ایک شریف زندگی گزاری۔ زندگی تو عسرت ہی میں گزری مگر اسے یاد نہیں کسی نے ان کے ہاتھ پھیلانے کا کبھی تذکرہ کیا ہو۔ بوبو اکیلی اولاد تھیں، ان کی شادی کے وقت گھر بیچ دیا۔ خود بوبو کی شادی کے بعد کرایے کے مکان میں بہ مشکل چھ ماہ رہے ہوں گے کہ موت آئی اور عدم آباد روانہ ہو گئے۔ منجھلی تائی کو ان کے بھائی لے کر چلے گئے، پردہ گر گیا۔

اسے پھر اپنے ماں باپ یاد آئے۔

'' چلیے۔ رات زیادہ ہو گئی ہے، کھانا کھا لیجیے۔'' بیوی دوبارہ بالکونی پر آئی۔ وہ ایزی چیئر پر آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔

'' ہاں چلو۔'' بیوی کے کہنے پر اس نے آنکھیں کھولیں اور ایزی چیئر سے اٹھ گیا۔

بستر پر پڑے پڑے، بہت دیر بعد اسے احساس ہوا کہ نیند نہیں آ رہی ہے۔ بیوی اکیلی جان، تھک کر سو گئی تھی۔ حالاں کہ بستر پر آنے کے بعد کچھ دیر تک اس نے شوہر کے حزن کو محسوس کرتے ہوئے بوبو کا تذکرہ چھیڑا اور جاری رکھا، مگر جب وہ لگاتار ہوں ہاں کرتا رہا تو بیوی سمجھ گئی کہ وہ کچھ بولنے کے موڈ میں نہیں ہے۔

رات بھر دھوپ چھاؤں کا کھیل رہا۔ دفتر میں کبھی کبھی کام اس طرح الجھ جاتا ہے کہ پورا دن ذہنی طور پر محنت والا دن بھی بن جاتا ہے۔ ساٹھ کے پیٹے میں پہنچتے پہنچتے کرسی پر مسلسل بیٹھے رہنا بھی ایک مصیبت بن جاتا ہے۔ وہ ذہنی اور جسمانی دونوں طور پر تھکاوٹ محسوس کر رہا تھا۔ نیند بار بار دبوچ رہی تھی بار بار اچٹ رہی تھی۔ ہیولے سے بن رہے تھے اور بگڑ رہے تھے۔ کبھی اماں پکارتیں: ''ننّن! اٹھ جاؤ بیٹا۔ دن چڑھ آیا، کبھی بوڑھن پہاڑی اور دھواں کنڈ کے راستے میں ٹٹہری بولنے لگتی اور جھاڑیوں میں بیر بہوٹی سبزے کو سرخ کرنے میں مصروف رہتی اور دھواں کنڈ کے خوفناک جھرنے کی آواز دور سے بھی سنائی دیتی۔ ابا کے ساتھ وہ دھواں کنڈ گیا تھا۔ '' سنکروا'' پکڑ کے لایا تھا۔ اس کے گلے میں دھاگا باندھ کر اسے اڑاتا، کیسی مدھم سیٹی جیسی آواز نکلتی۔ پتہ نہیں قمرن اور بی بی جان کہاں ہیں، گرمی کی دوپہروں میں گھنودیوان اور دادا کے مزاروں کے بیچ نمکوڑی چننے کے چکر میں ان دونوں سے کیسی دھا چوکڑی مچتی تھی۔ بوبو دھمکاتیں'' ہم کو اور نمکوڑی دو نہیں تو منجھلے تایا سے کہہ دیں گے۔'' وہ دانت کچکچا کر اپنے حصے کا بھی آدھا ان کے حوالے کر دیتا۔

بوبو مر گئیں!

بوبو کیوں مر گئیں؟ لوگ کیوں مر جاتے ہیں؟ کیا ہوتا ہوگا مرنے کے بعد؟ جو کچھ بتایا گیا اس میں دیکھا ہوا کتنا ہے اور سوچا ہوا کتنا؟ کیا مجھے بوبو کے مرنے کا افسوس نہیں ہے؟ ہے تو مگر مجھے نیند آ رہی ہے مگر میں سو کیوں نہیں پاتا؟ پیسہ..... ہاں کل پیسہ بھیج دوں گا۔ مگر کیا وہ بوبو کو ملے گا؟ نہیں وہ تو میاں بھائی کو ملے گا۔ اور ان کے بچے؟ میرے بھانجے؟ کوئی سلیقے کا نہیں نکلا۔ کسی نے میٹرک بھی نہیں کیا۔ خود میاں بھائی بھی تو جاہل تھے۔ آئنا مل میں مزدوری کرتے تھے۔ کتنا منع کیا تھا منجھلی تائی کو، مت کیجئے وہاں شادی، بوبو کو ایک دن بھی سکھ نہیں ملے گا مگر اس کی سنی ہی نہیں گئی، آئی اے کے طالب علم کی اوقات ہی کیا، شادی ہوگئی، پھر تلے اوپر بچے....."

ہاتھی..... ہاتھی..... ہاتھی کی سونڈ..... شور اٹھتا۔ دیکھتے دیکھتے آسمان سے بالکل ہاتھی کی سونڈ جیسی کوئی چیز ندی کی طرف بڑھتی دکھائی دیتی، پھر ندی کا پانی اس سونڈ کے ذریعہ آسمان تک پہنچ جاتا..... کوئی تانڈو ناچتا ہے، کہیں بارھ آتی ہے کہیں سوکھا پڑتا ہے، پھر سارے میں بہار آتی ہے، پھول کھلتے ہیں، ایک سیاسی لیڈر کے بارے میں سنا کہ پھول کی گرمی سے مر گئے..... آتش گل ..... بوبو! شادی کے بعد تم کو کبھی بیلے موتیا کا کوئی ہار بھی نصیب ہوا کہ نہیں؟ زندگی اور طوفان کا کولاژ..... مگر ایک انتہا تو سبھی کی ہے....."

بوبو بھی اپنی انتہا تک پہنچ گئیں..... اے شمع تیری عمر طبیعی....."

مگر کیا یہ واقعی شمع کے اختیار میں ہے؟

کم از کم بوبو کے اختیار میں تو یہ نہیں تھا..... جب تک میکے میں رہیں باپ کی وفا شعار رہیں، سسرال گئیں تو شوہر کی تابعداری کی۔ اگر جاہل رہیں تو اس لئے کہ باپ نے نہیں پڑھایا، سسرال میں اگر خوشی کو ترسیں تو اس لئے کہ شوہر ہی اس قابل نہیں تھا۔

خطا کس کی ہے؟

وہ جل بن مچھلی کی طرح چھٹپٹایا۔ کیا بوبو کی بدحالی میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے؟ ایک مرتبہ دونوں میاں بیوی یہاں بھی تو آئے تھے۔ دوپہر میں تنہائی پا کر رو پڑی تھیں:

"ہم اب تھک گئے ہیں، اب برداشت نہیں ہوتا۔ تمہارے میاں بھائی کے گھر والے بھی ہم لوگوں سے پیچھا چھڑا چکے۔ کچھ ہمارے لئے کر دو۔ اللہ نے تم کو بڑا بنایا، اور بڑا بنائے۔

ان کو کہیں بھی رکھوا دو، چپراسی گیری بھی منظور ہے۔ سات بچوں کا بوجھ کیسے اٹھاؤں؟

رات بیچ سے دو پھانک میں پھٹ گئی۔ گرمی کی ایک رحیم و کریم دوپہری نے آہستہ سے ایک پھانک کے بیچوں بیچ سے سر نکالا اور ہنس کر بولی: دیکھو میں ہوں''۔ پتہ نہیں قمرن اور بی بی جان کہاں ہیں۔ گھنو دیوان اور دادا کے مزاروں کے بیچ نمکوڑی چننے کے چکر میں ان دونوں سے کیسی دھینگا مشتی ہوتی تھی۔ بوبو دھمکاتیں۔'' ہم کو اور نمکوڑی دو نہیں تو منجھلے تایا سے کہہ دیں گے'' وہ دانت کچکچا کر اپنے حصے کا آدھا ان کے حوالے کر دیتا۔

رحیم دوپہر اداس اداس سی لوٹ گئی اور رات پھر آن براجی۔ اسے یاد آیا اس نے بوبو سے وعدہ کیا تھا کہ وہ کچھ ضرور کرے گا۔ جاتے وقت اس نے ان کو پانچ سو روپے بھی دیے، بیوی نے اس کے اور اپنے سارے پرانے کپڑے بھی بوبو کے حوالے کر دیے۔

بوبو کے جانے کے بعد کچھ دنوں تک یہ بات یاد رہی۔ اس بیچ اس نے اپنی آفس میں ایک چپراسی بحال بھی کیا۔ مگر اپنے بہنوئی کے لئے چپراسی کی نوکری تلاش کرنا اتنا مشکل کام ہے، اس کا اسے اس وقت اندازہ نہیں ہوا جب وہ بوبو سے وعدہ کر رہا تھا میاں بھائی کے لئے اس کے علاوہ اور کچھ ممکن بھی تو نہ تھا۔

مدتوں یہ بات یاد رہی اور مدتوں یہ خلش اسے بے چین کرتی رہی۔

وعدہ خلافی کے زخم کو مندمل ہونے میں بہت وقت لگا۔

بوبو اور میاں بھائی بھی پھر دوبارہ نہیں پلٹے اس نے بھی تو ان کی کوئی خبر نہیں لی!

خطا کس کی ہے؟

کسی جگہ ایک اسکول تھا۔ گرمی کی طویل چھٹی ہونے کے دن ایک بچے کو اسکول ہی میں بہت نیند آنے لگی۔ وہ اسکول کے ایک خالی کمرے میں ایک بینچ پر جا کر لیٹ گیا، پھر سو گیا، پھر شام ہو گئی، سب بچے خوشی خوشی گھر چلے گئے کہ کل سے پورا ایک مہینہ موج مستی کرنا ہے۔ آخر میں اسکول کا چپراسی بھی اسکول بند کر کے گھر چل دیا۔ رات میں بچے کی نیند ٹوٹی، اس نے وحشت زدہ انداز میں دروازہ پیٹنا شروع کیا۔ سننے والا کون تھا؟ اسکول تو شہر سے دور، ایک انتہائی کوردہ علاقے کے اس آخری سرے پر واقع تھا جس کے بعد پہاڑ کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ جہاں آگے پیچھے دائیں بائیں کوئی گھر نہیں، جہاں سے آگے کوئی راستہ کوئی پگڈنڈی بھی نہیں جاتی تھی، جہاں

پہاڑ کے علاوہ دور دور تک بس چٹیل میدان۔ اسکول کے اوقات کے علاوہ کسی بھولے بھٹکے راہی کو بھی اس علاقے میں جانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ اسکول کھلا تو بچے کی جگہ بچے کا پنجر ملا اور بلیک بورڈ پر لکھی اس کی فریاد.....''

'اماں! بھوک لگی ہے.....کوئی میری آواز نہیں سن رہا ہے.....میں نے ڈسٹر کھایا.....کھلی کھائی.....بابا۔ میں نہیں بچ پاؤں گا.....کتاب کاپی سب کھا گیا.....پانی.....پانی.....اماں، اماں! خطا کس کی ہے؟

اسے لگا، وہ اپنی اماں کی آغوش میں لیٹا ہوا چھ ماہ کا بچہ ہے اور چسر چسر دودھ پی رہا ہے.....اس کی ماں روز پاؤ بھر دودھ لیتی تھی اور دن بھر کی چائے کے بعد بھی ایک پیالی دودھ اسے ضرور دیتی تھی۔ بوبو اس کی اماں تو نہیں تھیں مگر جب بھی وہ اپنے گھر کی ایک پھلکی یا سموسہ اسے چپکے سے دیتیں۔ میدان سے بیر توڑ کر دامن میں چھپائے آتیں اور اشارے سے اس کو بلاتیں تو لگتا کہ یہ بچ میں اماں ہے۔

اماں بھی مر گئیں بوبو بھی مر گئیں۔

کیا کیا اس نے اماں کے لیے؟ جب تک وہ زندہ رہیں، ایک پیراسائٹ کی طرح وہ ان کو نچوڑتا بھنبھوڑتا رہا، پھر وہ مر گئیں تو خوب رویا، پھر باپ بھی مر گئے، پھر رویا، ہر بار رو دھو کے وہ تر و تازہ ہوتا رہا اور خوب کھاتا رہا اور خوب سوتا رہا، بچے پیدا کیے، پیسہ کمایا، عیش کے کوچے کو چلا، دنیا گھومی۔ اب جب بچے ملک سے باہر اور بیٹیاں سسرال تو اب کاہے کا بلبلانا؟

خطا کس کی ہے؟

خطا کس کی ہے؟

اسے جواب نہیں مل پا رہا تھا۔ یا شاید ذہن پوری طرح ساتھ نہیں دے پا رہا تھا، اسے لگا اس پر اونگھ غالب ہے، پھر محسوس ہوا.....نہیں نیند غالب ہو رہی ہے.....غنودیم.....غنودیم.....غنودیم.....''

وہ نیند کے بھنور میں پوری طرح ہچکولے کھانے سے اک پل پہلے تک.....اس کشمکش میں گرفتار رہا کہ بوبو کی موت کا اس طرح بیان کہانی بن سکتا ہے یا نہیں؟۔۔۔!

☆☆☆

یہ آدمی

دروازے پر پڑا ٹاٹ کا پردہ ہٹا کر وہ شخص اندر داخل ہوا۔

اندر داخل ہو کر وہ ایک چھوٹے سے کوٹھری نما دروازے میں آیا جس کی لمبائی تقریباً پانچ فٹ اور چوڑائی تین فٹ رہی ہوگی۔ اس حصے کی دیواریں پختہ تھیں مگر زمین کچی تھی اور اوپر کھپریل کی چھپر تھی۔ اس کوٹھری نما دروازے کے اندر کی طرف کھلنے والے دروازے کے ٹھیک سامنے غسل خانہ تھا جو شاید اس خیال سے بھی بنایا گیا تھا کہ دروازے کے بعد پڑنے والے آنگن کو بے پردہ ہونے سے بچایا جا سکے۔

وہ شخص دروازے میں داخل ہو کر کچھ دیر رکا، پتہ نہیں سانس برابر کرنے کے لئے یا اندر کی آہٹ لینے کے لئے یا بس یونہی!

وقت شام کا تھا' موسم جاڑے کا، جنوری کا مہینہ گزر چکا تھا۔

وہ شخص بڑے پیچ دار راستوں سے گزر کر یہاں تک پہنچا تھا۔ یہ گھر گلی کے تقریباً آخری سرے پر تھا۔ اگر یہ شخص واپسی کا سفر اختیار کرتا تو اس دروازے سے باہر نکلتے ہی اسے ایک چوڑی نالی پار کرنی پڑتی جو دروازے سے بالکل سٹ کر بہتی دکھائی دے رہی تھی۔ یہ نالی پہلے ادھر نہیں تھی، پچاس برس پہلے یہ گلی بھی نہیں تھی، آگے پرتی زمین تھی جس میں کچھ دور تک پھول لگے ہوئے تھے اور ایک مالی باضابطہ ان کی دیکھ ریکھ کرتا تھا، پھولوں سے آباد قطعے کے بعد دور تک بالکل کھلا میدان تھا جس کے چاروں طرف شیشم اور آشوک وغیرہ کے درخت لگے ہوئے تھے، اس کے بعد چہار دیواری تھی اور میدان کے بیچ میں میکسیکن گھاس بچھی رہتی تھی جس پہ گرمیوں کی شام میں گھر کے لوگ بیٹھ کر گپیں کرتے تھے اور بچے کھیلا کرتے تھے۔

مگر یہ بات پچاس برس پہلے کی تھی۔ اب تو نالی دروازے سے سٹ کر ہی بہتی تھی اور سامنے کا سارا حصہ گھر کے دوسرے حصہ داروں نے آہستہ آہستہ مختلف لوگوں کے ہاتھوں بیچ دیا اور پھر جو نئے نئے گھر بننے لگے تو یہ گھر گلی والا گھر کہلانے لگا کیوں کہ سامنے کے حصے میں جس نے بھی گھر بنایا اس نے اس گھر کے دروازے کی سمت اپنے گھر کا پچھواڑہ رکھا اور سبھی نے اپنی اپنی نالیوں کا رخ اسی گلی کی طرف کر دیا، پھر چوں کہ اس گلی میں اس گھر کے علاوہ ایک کباڑیے کا گودام تھا اس کے بغل میں ایک رکشا گیرج اور اس کے بغل میں ایک چھوٹی سی مسجد۔ مسجد کے بعد نکاسی کا رخ دوسری گلی میں ہو جاتا تھا اس لئے نمازیوں کو کچھ زیادہ زحمت نہیں اٹھانی پڑتی تھی۔ باقی بچے رکشے والے اور کاٹھ کباڑ جمع کرنے کے لئے آنے والے یہ سب تو کچھ دیر کے لئے آتے اور چلے جاتے۔ اس گلی کا اور اس گلی میں بہتی نالی کا اصل سامنا تو اسی گلی والے گھر کو کرنا پڑتا تھا۔

تو یہ شخص بھی اگر نالی اور گلی پار کر کے بڑھتا تو پھر دوسری گلی میں مڑ جاتا۔ یہ گلی اس پہلی گلی سے چوڑی ہے اس میں رکشہ تو کم از کم آ ہی سکتا ہے۔ مگر رکشے کے اندر داخل ہو جانے کے بعد پھر آدمیوں کو دیوار سے لگ کر کھڑے ہو جانا پڑتا ہے کہ رکشہ گزر جائے تو وہ آگے بڑھیں۔ اس گلی میں چھوٹی چھوٹی اینٹ بچھی ہوئی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ گلی عہد قدیم سے اسی انداز پر ہے۔ اس میں ایک خاص بات یہ ہے کہ اس گلی میں نالی کسی ایک طرف نہیں گلی کے بیچوں بیچ ہے۔ شاید جس وقت نالی بن رہی ہو تو دونوں طرف کے مکان والے اڑ گئے ہوں اور آخر میں بیچ بچاؤ کا راستہ یہی سمجھ میں آیا ہو کہ نالی نہ ادھر رہے نہ ادھر بلکہ بیچ میں رہے۔ مگر اس گلی میں ایک بہت خراب بات بھی ہے۔ لوگوں نے اپنی پنی سنڈاسوں کی نکاسی کا رخ گلی کی طرف ہی کر رکھا ہے۔ حالاں کہ اب گلی کے تین چار گھروں میں ہی سنڈاس سسٹم باقی رہ گیا ہے۔ مگر وہ بھی کچھ کم پریشان کن نہیں ہے دوسری بات یہ کہ جن گھروں میں سپٹک لیٹرن بنا بھی، وہ میونسپلٹی کی طرف سے دی ہوئی بہت قلیل سبسڈی کے ذریعہ بنا، نتیجہ یہ ہوا کہ سپٹک لیٹرن والے تمام گھروں کے گندے پانی کی نکاسی والا پائپ بھی گلی کی نالی سے جڑا ہوا ہے اس لئے گلی میں داخل ہوتے ہی ناک پر رومال رکھنے کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ ویسے یہ ضرورت نو واردوں کو ہی پڑتی ہے، اس گلی سے برابر گزرنے والے شاید اس کے عادی ہو گئے ہیں یا جانتے ہیں کہ یہ گلی چند قدم آگے بڑھ کر ایک تراہے میں بدل جاتی ہے۔ اس تراہے سے ایک راہ پھر ایک اور گلی میں جا کر بند ہو جاتی ہے۔ دوسری راہ دوسری گلی میں

مڑ کر پیچ در پیچ گلیوں سے گزرتی دور دور بس چلتی چلی جاتی ہے اور تیسری راہ ایک ایسے راستے سے جا کر مل جاتی ہے جو سڑک تو نہیں ہے مگر کسی نہ کسی طرح دور کشہ بیک وقت گزر جا سکتا ہے۔

اب سوچا جا سکتا ہے کہ یہ شخص تراہے سے کدھر مڑے!

ایک بند گلی کے دروازے پر تو وہ کھڑا ہی ہوا تھا اس لئے دوسری بند گلی میں اس کے جانے سے کہانی میں کوئی جان نہیں پیدا ہو سکے گی۔ ہاں اگر وہ اس راستے پر مڑے جو ذرا چوڑا ہے اور جس میں دو رکشے بیک وقت آ جا سکتے ہیں تو کہانی غالباً کچھ آگے بڑھ سکے گی مگر مشکل یہ تھی کہ یہ شخص صبح کا نکلا ہوا ابھی لوٹا تھا اور صبح صبح جو یہ نکلا تو کسی غرض سے نہیں نکلا، سرسٹھ اڑسٹھ برس کے آدمی کو کیا غرض اور کام ہو سکتا ہے اور اس شخص کو تو یوں بھی کبھی کوئی کام نہیں رہا، جب یہ جوان ہوا تو اس کے گھر میں اور رشتہ داروں میں کسی بھی کام سے زیادہ ضروری کام تھا شادی کرنا، اس لئے یہ جوان ہوا تو اس کی شادی ہوگئی، اور شادی ہوگئی تو اس کے گھر بچہ بھی پیدا ہونے لگا۔ اس شخص کا اور اس کے بزرگوں کا ماننا تھا کہ اولاد خدا کی نعمت ہے، پہلا بیٹا ہوا تو اس کا ڈھول باجے سے استقبال کیا گیا کہ ولی عہد بہادر تشریف لائے، چھٹی اور اور چھلے کے مواقع پر اندر میراثنوں اور باہر رنڈیوں نے محفل کی رونق میں چار چاند لگائے، پھر دوسری بیٹی ہوئی، پھر تیسری بیٹی ہوئی، تلے اوپر چھ بیٹیاں ہوئیں، اسی بیچ پہلا بیٹا ختم ہو گیا، بڑی ہا ہا کار مچی، ماں باپ کی دنیا اندھیری ہوگئی، زندگی کے باغ پر خزاں چھا گئی مگر مرنے والا کسی طور زندہ نہ ہو سکا البتہ چھ بیٹیوں کے بعد پھر ایک بیٹا ضرور پیدا ہو گیا، سب کے دل کو چین ملا قرار آیا مگر تین چار برس بعد اندازہ ہوا کہ یہ بیٹا تو گونگا پیدا ہوا، ارمانوں پہ اوس پڑ گئی، بھری بہار میں خزاں آ گئی، نہ ہنستے بنتا تھا نہ روتے۔ اس بیچ بہت کچھ بدل گیا گھر کے بڑے بوڑھے ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ زمین جائداد کا تین تیرہ نو اٹھارہ ہو گیا۔ پہلی ضرب زمین داری سسٹم کے خاتمے نے لگائی، دوسری ضرب بھائیوں کے جھگڑے اور اس جھگڑے کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بٹوارے نے پہنچائی اور تیسری ضرب اس وقت برداشت کرنی پڑی جب نکسل تحریک نے سر اٹھایا۔

اور ان ساری بلاؤں کے انجام تک پہنچتے اس گونگے بیٹے کے بعد بھی ایک بیٹی پیدا ہوگئی۔

ایسے میں تصور کیا جا سکتا ہے کہ یہ شخص جو تراہے پر کھڑا ہے اس کی زندگی کا بہترین حصہ تو بیٹیاں بیاہنے میں گزر گیا اور پینسٹھ سے زیادہ کا یہ آدمی اس لمحے میں ایک جوان گونگے بیٹے

اور ایک جوان غیر شادی شدہ بیٹی کا باپ تھا۔ گھر میں کچھ بچا نہیں، رشتہ داروں نے کچھ دیا نہیں سسرال سے کچھ ملا نہیں اس حال میں سرسٹھ اڑسٹھ برس کے اس آدمی کو گھر سے باہر کی دنیا میں کیا کام ہو سکتا ہے؟ صبح صبح گھر سے نکل جانا اس کا روزمرہ کا معمول تھا۔ وہ شخص صبح سویرے نکل جاتا اور شام ڈھلے گھر واپس آتا۔

ایسے میں سوچنے کی بات یہ ہے کہ تراہے پر کھڑا یہ آدمی کس راستے کی طرف مڑے؟ بند گلی سے بند گلی کی طرف جانا بے معنی ہے مگر مشکل یہ ہے کہ یہ آدمی اگر اس دوسرے راستے پر مڑتا جو ذرا چوڑا تھا اور جس پر دو دو رکشے بیک وقت آ جا سکتے ہیں تو پھر اس سڑک پر نکل کر یہ کیا کرتا؟ کیوں کہ وہ سڑک چوڑی ہونے کی وجہ سے بھیڑ بھاڑ والی سڑک تو ہے ہی، ستم یہ کہ اس پر دور دو یہ دو کانیں بھی ہیں اور دو چار مرتبہ جب جب وہ اس سڑک پر آیا تو اسے دیکھ کر کچھ دوکان داروں نے جہاں ادب سے سلام کیا وہیں بعضوں نے آواز لگا دی۔

”آیئے بڑے میاں!“

”کچھ چاہئے مولوی صاحب؟“

”چچا۔ کچھ لینا ہے؟“

حالاں کہ ایسے ہر لمحے میں اسے یاد آیا کہ لینا تو ہے۔ بیٹی کا کپڑا پھٹ گیا ہے، ماں بتا رہی تھی۔ بیٹا تو گونگا ہے مگر اشارے ہی اشارے میں بتا رہا تھا کہ چپل ٹوٹ گئی ہے۔ بیوی کبھی کچھ کہتی نہیں مگر اس کے ذہن میں تھا کہ اس کے پاس تو ساری چپل بلاؤز سب پرانا ہے۔ بیوی بچوں کی یاد آتے ہی اس کی نگاہ اپنی انتہائی پرانی شیروانی پر ٹک جاتی جس میں بیوی کی رفوگری کے کمال سے صرف وہی واقف تھا۔۔

اس لئے یہ شخص تراہے سے بڑھ کر پیچ در پیچ گلیوں سے گزرتا بس دور دور تک چلتا چلا جاتا۔ اور شام آجاتی۔

جس دن کا یہ واقعہ ہے اس دن بھی وقت شام کا تھا اور موسم جاڑے کا۔ وہ شخص دروازے میں داخل ہو کر کچھ دیر رکا، پتہ نہیں سانس برابر کرنے کے لئے، یا اندر کی آہٹ لینے کے لئے، یا بس یونہی! یہ آدمی تاوقتیکہ خود آگے نہ بڑھے، کہانی کیسے آگے بڑھے۔؟؟

☆☆☆

رام نگر کے رستے میں

اچانک بارش شروع ہوگئی اور بکریاں کسی چھت کی تلاش میں ہرن کی مانند بھاگنے لگیں۔

حالاں کہ دسمبر کی آخری تاریخوں میں اس کا امکان تو رہتا ہی ہے لیکن یاد کسی کو بھی نہیں رہتا، شاید اسی لئے امکانی حادثہ بھی غیر متوقع ہوتا ہے..... ان سب کے لئے بھی یہ غیر متوقع تھا لہٰذا سبھی پریشان تھے۔

وہ سب ایک شہر یا آس پاس کے رہنے والے تھے اس لئے یونیورسٹی میں چھٹیاں ہوتیں تو سبھی کا پروگرام ایک ساتھ بنتا..... یونیورسٹی اسٹیشن سے یہاں تک ایک ٹرین اور پھر یہاں سے دوسری ٹرین پکڑ کر گھر..... یہ برابر کا معمول تھا!

آج بھی سب ایک ساتھ چلے اور ایک ساتھ مصیبت میں گرفتار ہوئے۔

سب یونیورسیٹی کے طالب علم، من چلے، طاقت کے زعم میں گرفتار اور یہ اطمینان کہ گھر جارہے ہیں، نہ لحاف نہ کمبل، نہ فاضل گرم کپڑے، بس ہاف سوئٹر اور کوٹ بدن پر ڈالا اور روانہ ہوگئے کہ آٹھ بجے دن میں چلے تھے اور امید تھی کہ شام ہوتے ہوتے گھر پہنچ جائیں گے..... یہ کسے پتہ تھا کہ جس راستے سے انہیں گھر جانا تھا اسی راستے پر دو مال گاڑیوں کی ایسی ٹکر ہوجائے گی کہ راستہ صاف ہوتے ہوتے رات گذر جائے گی۔

مگر جو انہوں نے سوچا نہیں وہ ہو چکا تھا۔

ٹرین کینسل..... دسمبر کی ٹھنڈی رات سر پر..... اور اب یہ بارش..... سب سردی سے ٹھٹھر رہے تھے۔

"عجیب ناگہانی آفت میں ہم لوگ گرفتار ہوئے"۔ ترسیم سنگھ تھر تھر کرتے ہوئے بدبدایا۔

"ناگہانی ہو یا ہاں گہانی..... آفت تو آفت ہے جانی!" فضل الرحمٰن نے ترسیم سنگھ کو اپنے بازوؤں میں جکڑتے ہوئے کہا۔

"میری سنتا کون ہے؟" راہل ورما جھلا کر کہنے لگا..... "میں تو بس جو کہتا ہوں اس کی کاٹ ضروری ہے۔" "میں نے کتنا کہا، بند ھو۔ گرم چادر اور کمبل رکھو لو مگر میری کون سنتا ہے.... ٹھیک ہے، مت مانو میری بات.... بھگتو!"

"بول لو راجہ بول لو۔ ہمارا بھی سمئے آئے گا۔ فضل الرحمٰن ہنسا۔

"یار راہل"۔ زورآور سنگھ نے فضل الرحمٰن کو دیکھتے ہوئے ہنس کر کہا جواب بھی ترسیم سنگھ سے لپٹا ہوا تھا.... "اس وقت تو تم بھی وہ ڈائیلاگ بول سکتے ہو..... شالو چھپا شالو..... ہمارا بھی شمئے آئے گا"۔

"پر یار..... کچھ الٹا ہو رہا ہے"۔ لوکیش دت ہنسا۔

"کیا؟" راہل چونکا۔

"ترسیم سنگھ کا رول اس وقت فضل الرحمٰن ادا کر رہا ہے"۔

"آجا پیارے!" زورآور ہنس کر لوکیش کی طرف باہیں پھیلاتا ہوا بولا۔ "میں ترسیم سنگھ کا Substitute بننے کو تیار ہوں!"

"ہے ہے..... نہ ہوا میرا فوٹو کیمرہ اس وقت۔" راہل ورما سینے پر ہاتھ مار کر بولا۔

"پھر غلط ڈائیلاگ ادا کر رہے ہو تم۔" زورآور سنگھ ہنسا"۔ کہو کہ ذرا میرا فوٹو کیمرہ تو لانا، بروزن ذرا میری قرولی تو لانا!"

"اس کو تو قرولی، چاقو تلوار..... ہر وقت یہی سب کچھ یاد رہتا ہے۔" سہراب جوز روالا ہنستے ہوئے بولا۔

"قومی ورثہ!" شاداب عنایتی نے سہراب کے چھکے پر نہلا مارا۔

"بیٹے خان۔ اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟" لوکیش نے شاداب کے نہلے کو دہلے سے دبایا۔

"حقیقت خرافات میں کھو گئی....." شاداب نے کان پر ہاتھ رکھ کر الاپ لگائی.... اور سب ہنس دیئے۔

اچانک ترسیم سنگھ اٹھا تو سب کی نگاہیں اس پر مرکوز ہو گئیں۔

"ذرا پتہ تو چلا آؤں یارو! شاید کوئی راستہ نکل آیا ہو" وہ کہتا ہوا انکوائری کی طرف بڑھ گیا۔

چند منٹوں بعد لوٹا تو سب سے زیادہ استفہامیہ نظر زورآور سنگھ کی تھی۔

"کیا ہوا؟" فضل الرحمٰن نے پوچھا۔

"ڈھاک کے تین پات!" جھلائے لہجے میں جواب دیتے ہوئے ترسیم سنگھ اپنی جگہ بیٹھ گیا۔

ترسیم اپنی جگہ بیٹھ گیا مگر اس کا انداز بڑا عجیب سا تھا..... اکھڑا اکھڑا بھی..... اور گھبرایا گھبرایا بھی!

"یار تو تو خواہ مخواہ اپنے آپ کو ہراس کرتا ہے..... اس سرد ترین رات میں ہماری خاطر لائن پر گرا ڈبہ اٹھانے کون آئے گا؟"۔

ترسیم سنگھ نے کوئی جواب نہ دیا، شاید اس نے فضل الرحمٰن کی آواز سنی ہی نہیں..... اس کے خیال کی رو بھٹک گئی تھی..." بھاپا انتظار کر رہے ہوں گے، کل لڑکے والے ویراں والی کو دیکھنے آئیں گے میرا پہنچنا ضروری ہے، ماں تو شام ہی سے بے چین ہو رہی ہوگی، بھاپا کچھ کہتے نہیں ہیں لیکن پریشان تو وہ بھی ہوں گے، پچھلی ہی مرتبہ گھر سے آتے ہوئے انہوں نے کتنا سمجھایا تھا..... حالات بدل چکے ہیں، زیادہ رات تک ہوسٹل سے باہر نہیں رہنا چاہئے، اجنبی علاقوں میں گھومنے کی عادت اب چھوڑ دو، یہ آخری سال ہے، کسی طرح گذار لو، تمہارے کینیڈا والے تایا سے بات ہو چکی، تعلیم مکمل کر کے وہاں چلے جانا"...... مگر میں کیسے جا سکوں گا، میں تو اس بری طرح Home Sickness کا شکار ہوں کہ دو تین مہینے ہوتے ہوتے طبیعت بے چین ہونے لگتی ہے اور اپنا گھر، محلہ اور شہر یاد آنے لگتا ہے..... رام نگر تو میرے خواب میں آتا رہتا ہے، میری تو شدید تمنا تھی کہ ایم اے کر کے وہیں کے کسی کالج میں لیکچرر ہو جاؤں گا اور باقی زندگی رام نگر ہی میں گذاردوں گا ....مگر اب؟ بھاپا کہتے ہیں کینیڈا چلے جاؤ..... ہمیشہ کے لئے..... شاید بھاپا ٹھیک ہی کہتے ہیں"۔

"بادشاہو۔ کہاں ہو؟" شاداب نے اس کے چہرے کے آگے ہاتھ پہنچایا۔

"کہیں نہیں بھائی" زورآور ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔

"کہیں کیوں نہیں؟" ترسیم جھلاہٹ کا شکار ہو چکا تھا" کیا میرا ہوم لینڈ نہیں ہے؟"

"کون سا ہوم لینڈ بیٹے؟" راہل ورما چونکا۔

"کون سا ہوم لینڈ؟" ترسیم کا لہجہ کڑواہٹ سے بھرا تھا۔ کیا ہوم لینڈ بھی دس بیس ہوتے ہیں؟"

"بیٹے خان۔ وہی تو میں پوچھ رہا ہوں کہ اس ایک ہوم لینڈ کا نام کیا ہے؟"

"اے شکی..... بدگمان! میں اپنے رام نگر کی بات کر رہا ہوں"۔

"لو بھائی راہل ورما..... ایک مرتبہ پھر پہاڑ کھودا اور پھر چوہیا ہی نکلی" فضل الرحمٰن قہقہہ لگاتا ہوا بولا۔

مگر راہل ورما بھی کیا کرے؟ یہ غلط فہمی تو ترسیم سنگھ نے خود پھیلائی ہے..... رام نگر میں یہ پیدا ہوا..... بٹالہ میں اس کا ننھیال ہے..... اور اس کے باپ دادے لاہور میں رہتے تھے۔ یہ تو خود تین تیرہ ہو کے رہ گیا..... میرے نانا کے بٹالہ میں یہ ہے اور میرے دادا کے لاہور میں وہ تھا..... رام نگر، بٹالہ اور لاہور..... اس کے لاشعور میں تو ہنگامہ بپا ہے..... ایسے میں بے چارے راہل ورما کا کیا قصور؟

"یہاں سے رام نگر کوئی بس نہیں جاتی؟" ترسیم آپ ہی آپ بدبدایا۔

"نہیں پیارے۔" کسی نے کہا۔

مگر فوراً ہی سب کی توجہ پاس والی بنچ پر بیٹھے افراد کے درمیان ہوتی گفتگو کی طرف منتقل ہوگئی۔

"مرکز کی ساری کوششیں بیکار ثابت ہو رہی ہیں..... جس کا جہاں، جو جی چاہتا ہے کر گزرتا ہے"۔

"جب تک ان کے ساتھ پوری سختی نہیں ہوگی، یہ ہوش میں نہیں آئیں گے"۔

"خود تو پورے ملک میں قومی یک جہتی کا ترانہ گاتے ہیں اور وہاں....."۔

"یہی تو ان کی مکاری ہے۔ پتہ نہیں کس گدھے نے ان کو بیوقوف مشہور کر رکھا ہے!"

سبھی دوست چپ ہو گئے تھے، اور یوں بیٹھے تھے جیسے انہیں سکتہ مار گیا ہو..... پاس والی بنچ پر گفتگو ہنوز جاری تھی!

"تمہارا لوٹنے کا پروگرام کب ہے؟" لوکیش دت نے ترسیم سے پوچھا..... تہہ در تہہ جمی برف کاٹنے کی ایک کوشش!۔

"پہلے گھر تو پہنچ جایا جائے"۔ زورآور نے جواب دیا۔

"ارے بھائی۔ گھر تو پہنچ ہی جائیں گے"۔ فضل الرحمٰن بیچ میں کودا۔

"یہ عادی ہوگیا ہے۔ ٹھیٹھر ااور بے حیا بھی تو شاید ایسے ہی لوگوں کو کہا جاتا ہے"۔

ترسیم سنگھ کو ہنسی آگئی مگر پھر فوراً ہی سنجیدہ ہوگیا..... کیا قومی معاملات میں بے حیائی کا لبادہ اوڑھنا ضروری ہے؟ اب اسی زورآور کو دیکھو کیسے اطمینان سے قہقہے لگا رہا ہے.... کہتا ہے جو گزرنے والی ہے اسے کوئی روک نہیں سکتا..... یہ کون نہیں جانتا..... لیکن احتیاط برتنے کو بھی تو کہا گیا ہے..... اتنی گہری اندھیری اور سرد رات بیچ راہ میں یہ مصیبت..... اس کی کیا ضمانت ہے کہ ہم گھر پہنچ ہی جائیں گے..... گھر بھی عجب چیز ہے..... نازک حالات میں یہ زیادہ یاد آتا ہے۔ مگر یہاں کون سے نازک حالات ہیں؟ جو کچھ ہے.... یا ہوا یا ہو رہا ہے، وہاں ہو رہا ہے... اور وہ....؟ وہ تو ایک بحرانی لمحہ تھا جو گذر گیا۔ اس نے حرکت بھی تو اتنی ہی بھیانک کی تھی۔ اس کا بھگتان تو سب کو بھگتنا ہی تھا... مگر فضل الرحمٰن کا سوال بھی اپنی جگہ لاجواب ہے۔ اگر وہ بھی گوڈسے ہی ہوتا؟

گویا معاملہ صرف نام کا ہے..... مگر نہیں..... معاملہ صرف نام کا معلوم نہیں ہوتا.....
راہل ورما.... شاداب عنایتی.... زورآور سنگھ.... سہراب جوزروالا.... یہ سب نام بھی تو علامتیں ہی ہیں.... پھر ان علامتوں کے درمیان ابہام کی پیچیدگی کیوں نہیں پیدا ہوتی؟ ایک دوسرے پر ایک دوسرے کا ابلاغ اتنی آسانی سے کیسے ہو جاتا ہے؟

ترسیم سنگھ سوالات کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر میں کود پڑا تھا اور جواب کا کنارہ ناپید تھا!

"اٹینشن پلیز!" لاؤڈ اسپیکر چیخا اور سبھی چونک پڑے۔

"ہوڑہ امرت سر میل اپنے نردھارت سمئے پر پلیٹ فارم نمبر ۴ پر آرہی ہے" انکوائری سے اعلان ہو رہا تھا۔

"لے بھائی۔ پہلی مرتبہ امرت سر میل صحیح سمئے پر آرہی ہے" راہل ورما کی زبان سے جملہ پھسل پڑا۔

ترسیم اور زورآور دونوں کے چہروں پر ڈوبتے سورج کی چھوٹ پڑی.... ایک بھلا منش کیلے کے چھلکے پر سے پھسل کر گر پڑا اور چوٹ کی پرواہ کئے بغیر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور جھینپے جھینپے انداز میں چاروں طرف دیکھنے لگا.... "کسی نے دیکھا تو نہیں لیا؟"

''راہل۔تم اپنی زبان قابو میں نہیں رکھ سکتے؟''لوکیش کو واقعی غصہ آ گیا تھا۔

''سوری ترسیم!.... برا مت ماننا یار.... بس مذاق میں کہا ہے'' راہل کے لہجے سے خجالت ٹپک رہی تھی۔

زور آور سہراب کی نئی گھڑی دیکھ رہا تھا اور گھڑی کے بارے میں باتیں کر رہا تھا۔

''بیچارہ زور آور!''ترسیم کو بڑا ترس آ رہا تھا....اپنے آپ کو نارمل پوز کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر....''

اچانک اسٹیشن پر ایک ہلچل سی پیدا ہو گئی۔

کچھ عجیب ادبدا اور اٹ پٹا سا.... مانو کچھ ایسا جیسا ہونا نہیں چاہئے .... یا پھر کچھ ایسا جس کے چاروں طرف ایک دھندی چھائی ہو.... جھٹپٹے کی کیفیت....کچھ ایسا جو پورا کھلا یا پورا چھپا نہ ہو....''

سبھی کچھ عجیب سا محسوس کر رہے تھے....یہ سب آخر اچانک کیوں نمودار ہو گئے؟

''اسٹیشن بھی کانسٹی چیونسی ہے کیا؟''سہراب تمسخر آمیز انداز میں بڑبڑایا۔

''ظاہر ہے کہ نہیں ہے''لوکیش نے جواب دیتے ہوئے سامنے دیکھا''مگر ان کے موسم تو ہزار ہوتے ہیں''۔

ڈھیر سارے کھدر پوش ایسے نمودار ہوتے جا رہے تھے جیسے چیونٹیاں شکر کی تلاش میں بل سے نکلتی ہیں۔

''اچھا یہ بھی؟''فضل الرحمٰن چونکا۔

''یار تم لوگ پولس والوں کو دیکھ کر چونک کیوں پڑتے ہو؟''سہراب نے چوٹ کی۔

''چور سپاہی موسیرے بھائی!''راہل پھر بولا۔

''نہیں بھائی۔لاگ لگاؤ کا پرانا رشتہ یاد آ جاتا ہے''۔

سارے اسٹیشن پر ایک عجیب عالم تھا جیسے بھونچال آ گیا ہو.... مسلح جوان ہر بینچ پر بیٹھے لوگوں کو گہری نظروں سے دیکھتے اور شاید ان کے اندر باہر کا جائزہ لیتے....اپنے بھاری بوٹوں کے ساتھ کرچ....کرچ....اور ٹاپ ٹاپ کرتے ادھر سے ادھر آ رہے تھے اور جا رہے تھے۔

فضل الرحمٰن نے ترسیم سنگھ کو دیکھا، اس نے ٹھنڈ سے بچنے کے لئے مفلر اس طرح لپیٹ

رکھا تھا کہ اس کا آدھا چہرہ بھی چھپ گیا تھا۔

چوہے دان میں پھنسا چوہا..... چوہے دان کے پاس بلی..... بلی کو..... چوہے دان کے ایک کونے میں دبکا..... کن انکھیوں سے دیکھتا..... چوہا!

فضل الرحمٰن نے ترسیم سنگھ کو دیکھا..... چاہا کہ کچھ کہے..... پھر جانے کیا سوچ کر چپ ہو رہا۔

کئی بنچوں سے لوگ ہٹائے جا رہے تھے اور یہاں وہاں جوان پوزیشن سنبھالتے جا رہے تھے۔

کچھ جوان جب اس کی بنچ پر آئے تو لوکیش دت کھڑا ہو گیا۔

"کہئے۔کیا بات ہے؟ ہم لوگ بھی ہٹ جائیں کیا؟" لوکیش کا لہجہ بہت اکھڑا اکھڑا تھا۔

"نہیں نہیں!" ان میں جو شاید آفیسر تھا، اس نے نرمی سے کہا، پھر زورآور کی طرف دیکھا..... "یہ؟"

"ہم سب دہلی یونیورسیٹی کے اسٹوڈینٹ ہیں، اپنے گھر رام نگر جا رہے ہیں۔" اب کے راہل ورما بھی کھڑا ہو گیا۔

فضل الرحمٰن نے زورآور کی طرف دیکھا..... زورآور اس آفیسر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا تھا۔

کبوتر..... جو قتل ہوتے وقت اپنے قاتل سے آنکھیں لڑاتا ہے۔

ترسیم کو نیند آ گئی تھی۔

"اس سے کہہ دو..... چلا گیا" ۔آفیسر آگے بڑھ گیا تو زورآور نے ترسیم کی طرف دیکھتے ہوئے لوکیش سے کہا۔

"بک بک مت کرو۔اسے سونے دو!" لوکیش نے آہستہ سے زورآور کو ڈانٹا۔

"مگر یار۔تم لوگ واقعی عادی ہو گئے ہو۔" سہراب نے شاداب پر چوٹ کی۔

"مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں۔" شاداب آہستہ سے گنگنایا۔

"اس سے زیادہ مناسب تو وہ ہوگا"..... زورآور بولا..... سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے۔

"یہ تو تمہارے لئے موزوں ہے!" شاداب ہنسا۔

"اچھا تو چیونٹی کے بھی پر نکل آئے؟" راہل نے ہوٹ کیا۔

"چیونٹی جب دبتی ہے تب جانتے ہو کیا ہوتا ہے؟"

"ہاتھی کے پیر تلے آ گئی تو؟"

"سونڈ میں گھس گئی تو؟"

"کیا بات ہے بھائی؟" راہل جواب دینے کے بجائے سامنے سے گزرتے کھدر پوش کی طرف مخاطب ہوا۔

"وزیر صاحب امرت سر میل سے جا رہے ہیں۔" کھدر پوش اک شانِ بے نیازی سے جواب دیتا آگے بڑھ گیا۔

"وزیر صاحب؟" تر سیم نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں۔

"امرت سر جا رہے ہیں؟" زور آور بھی برداشت نہ کر سکا۔

"نہیں.... دہلی!" کھدر پوش نے آگے بڑھتے ہوئے مڑ کر کہا۔

"تم بھی عجب آدمی ہو یار؟" فضل الرحمٰن ہنسا.... صدرِ جمہوریہ دہلی میں، پارٹی صدر دہلی میں، وزیر اعظم دہلی میں.... تو وہ امرت سر کیوں جائیں گے؟"۔

"بتایئے بھلا.... امرت سر کیوں جائیں گے؟" لوکیش دت حلق دبا کر منمنایا۔

"ہاں جی کیوں جائیں گے؟" شاداب نے زور آور کی پیٹھ پر تھاپ ماری اور جملہ سُر میں اٹھایا۔

"بھلا کیوں جائیں گے؟" فضل الرحمٰن نے تال میں گرایا..... سب ہنس پڑے۔

اسٹیشن پر بھی زندگی مسکرا رہی تھی.... اسٹیشن کا عملہ کافی چاق و چوبند نظر آ رہا تھا، چاروں طرف کالے کوٹوں والوں کی بہار تھی، کوئی ٹی ٹی شاید خاک روبوں کو پکڑ لایا اور جلدی جلدی سارا اسٹیشن صاف ہونے لگا.... ہاکرس اپنا خوانچہ سنبھال کر ایک طرف سرک گئے..... غریب دیہاتی مسافروں کی سمجھ میں نہ معلوم کچھ آ سکا یا نہیں مگر وہ بھی اپنا بستر کمبل سنبھال کر مین گیٹ کے سامنے اور آس پاس سے دور ہو گئے......"

پھر اچانک ایک بے آواز مگر بہت زوردار کھلبلی مچی۔

ہوڑہ امرت سر میل کی روشنی دکھائی دی..... وزیر صاحب اپنے پرستاروں کے گھیرے میں اسٹیشن پر نمودار ہوئے.... فوٹو گرافران کا ایک اسنیپ لینے کے لئے ان کے آگے آگے دوڑنے

لگے.....اور عام جنتا اچک اچک کر دور ہی سے ان کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگی.... کچھ کھدر پوش وزیر صاحب سے ہاتھ ملانے اور ان کے ساتھ فوٹو کھنچوانے کی نیت سے وزیر صاحب تک پہنچنے کی کوشش میں مصروف نظر آئے......''

رابل ورما بغیر سوچے سمجھے بھیڑ کا حصہ بن چکا تھا۔

زور آور نے پہلے تو آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر جوانوں اور کھدر پوشوں کی نظروں سے گھبرا کر واپس آ گیا۔

لوکیش دت سیٹ پر بیٹھا بڑبڑا رہا ہے.....نان سنس! ایسے ہی تو میرے سامنے میرا کتا بھی کرتا ہے اور فضل الرحمٰن اسے ہوٹ کر رہا تھا.....بیٹے! ہمت ہے تو سامنے جا کر بولو!

اور ترسیم ایسے منہ پھلائے بیٹھا تھا جیسے عاشق و معشوق میں پہلی مرتبہ جھگڑا ہوا ہو۔

پھر ٹرین آئی.....وزیر صاحب چڑھے.....اور زندہ باد کے نعروں کی گونج میں ٹرین روانہ ہو گئی اور اسٹیشن جیسا تھا پھر ویسا ہی ہو گیا۔

بنچوں پر ایک دوسرے سے چپک چپک کر بیٹھے لوگ، جگہ جگہ پر ہاکرس اور خوانچہ والے، دیہاتی اپنے بستر اور کمبل کے ساتھ براجمان، بند بے جان ٹی وی سیٹ، چرخی کی طرح گھومتی Weight machin انکوائری سے گاہے گاہے گاڑیوں کی آمد و رفت میں تاخیر کا اعلان کرتا لاؤڈ اسپیکر، کبھی کبھی کھڑکھڑاتے گذرتے خالی گاڑی کے خالی ڈبے، کسی پسنجر یا اکسپریس ٹرین کی آمد، لمحاتی ہنگامے پھر خاموشی.....''

اور رام نگر پہنچنے کے خواہش مند لڑکے!

زور آور پھر قہقہے لگا رہا ہے اور ترسیم سنگھ سوچ رہا ہے..... بیچارہ زور آور.....اپنے کو نارمل پوز کرنے کی کتنی کوشش کرتا ہے.....کیسا، زور زور سے قہقہے لگا رہا ہے....کہتا ہے ہونی کو کوئی روک نہیں سکتا.....یہ کون نہیں جانتا.....مگر جلد سے جلد گھر پہنچ جانا ہی مناسب ہے.....اتنی گہری سرد اندھیری رات.....اور بیچ راہ کی بیچ رات میں یہ مصیبت.....اس کی کیا ضمانت ہے کہ یہ رات گزر ہی جائے گی.....اور مسافر اپنے گھر.....رام نگر پہنچ ہی جائیں گے۔۔!!!

☆☆☆

نیو کی اینٹ

سلامت اللہ نے آفس جاتے ہوئے دیکھا تھا پھر دفتری کاموں کی بھیڑ میں بات دماغ سے نکل گئی۔

مگر شام کو جب وہ اپنے گھر کے پاس پہنچا تو بھیڑ ویسی ہی نظر آئی۔ صبح میں تو آفس جانے کی جلدی بھی تھی اور ایک خیال یہ بھی آیا تھا کہ ہوگا کوئی فنکشن...... بچے بڑے ہوجاتے ہیں تو ان کے تلک چھیکا وغیرہ کا فنکشن بھی کیا کم بھیڑ اکٹھا کرتا ہے...... مگر شام کو بھی بھیڑ ویسی ہی نظر آئی تو اس کو فکر ہوئی...... کیا کوئی بیمار ہے؟ اب آفس کی جلدی تو تھی نہیں۔ اس نے سائیکل اپنے دروازے پر لگائی اور دو گھر چھوڑ کر تیسرے گھر کی طرف بڑھ گیا۔

"کیا بات ہے بھائی؟ شیو پوجن بھائی کہاں ہیں؟" ایک آدمی سے اتنا ہی پوچھ پایا تھا کہ شیو پوجن نظر آ گئے۔

"آداب شیو پوجن بھائی، بڑی بھیڑ ہے؟ صبح بھی دیکھا، سب کشل منگل ہے نا؟"

"ارے آپ نہیں جانتے؟ شیو پوجن جی تو......"

ایک آدمی بہت لپک کر کچھ بتانے کے موڈ میں تھا کہ اچانک شیو پوجن نے اسے ہاتھ سے ہٹاتے ہوئے سلامت اللہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنے قدم گھر کے باہر لگے منڈپ سے آگے بڑھانے شروع کر دیئے سلامت اللہ بھی شیو پوجن کے ساتھ آگے بڑھنے پر مجبور تھا۔ اس آدمی کے بولنے، شیو پوجن کے اس آدمی کو ایک طرف کرنے، سلامت اللہ کے کندھے پر ہاتھ رکھنے اور منڈپ سے آگے کی طرف قدم بڑھانے میں شاید دو سکنڈ کا وقت گذرا ہوگا۔ اس بیچ شیو پوجن چپ رہے پھر بولے، "نہیں کوئی کھاس، بات نہیں...... ہم تنک باہر گئے تھے......"

شیو پوجن کے ان جملوں کے درمیان ہی ایک آواز سنائی دی، جو آدمی سلامت اللہ کو شیو پوجن کے بارے میں کچھ بتانے جا رہا تھا اس کو کوئی اور دوسرا آدمی شاید بتا رہا تھا۔ ''سالا مُسْلَا ہے۔''

یہ جملہ سلامت اللہ نے بھی سنا اور شیو پوجن نے بھی......دونوں کے بیچ یہ جملہ پہنچتے ہی شیو پوجن زور سے ہنسے...... ''اور سنائیے کیا خبر ہے؟'' ''سب کچھ کشل ہے نا؟

سلامت اللہ کو اچانک احساس ہوا کہ وہ تو ننگا ہے۔ مادرزاد برہنہ۔ وہ اور شیو پوجن دونوں گیٹ تک آ چکے تھے۔'' اچھا شیو پوجن جی آداب'' وہ سمجھ نہیں پایا کہ اس کے اور شیو پوجن کے درمیان اب اور کون سا لفظ باقی بچا تھا۔

''نمستے''، شیو پوجن نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ سلامت اللہ تیزی سے اپنے گھر کی طرف بڑھ گیا۔

شام۔ وہ بھی دسمبر کی۔ چاروں طرف اندھیرا جھک آیا تھا۔ بجلی فیل تھی لہٰذا ہر گھر میں لیمپ، لالٹین روشن ہو چکی تھی۔ اچانک اسے اپنا گاؤں یاد آ گیا۔ شام ہوتے ہی وہاں بھی ہر گھر میں مٹی کا چراغ اور لالٹین روشن ہو جاتی تھی، پوس اور ماگھ کے جاڑے میں گھر کی بیٹھک میں سب جمع ہوتے، رحیم چاچا، سبطے ماموں، رامیشور چاچا، منگرو کاکا۔ اس نے اپنے گھر کے دروازے پر کھڑے ہو کر ایک نظر شیو پوجن کے گھر پر ڈالی اور اپنے گھر میں آ گیا۔

گھر میں داخل ہو رہا تھا تو گلی میں بچوں کے کھیلنے کی آواز سنائی دی، ''جے کنہیا رام کی''۔ بچے ماں کے کمرے میں لوڈو کھیل رہے تھے۔ بڑا لڑکا ٹیبل پر پڑھ رہا تھا۔ بیوی باورچی خانے میں تھی۔ دیکھتے ہی عجب انداز میں بولی، '' آپ آ گئے''۔

'' کیوں کیا بات ہے''؟ اسے کچھ حیرت سی ہوئی۔ وہ روز ہی آتا ہے اور بیوی بغیر کچھ کہے بس ہلکی سی مسکان سے اسکا استقبال کرتی ہے......پھر یہ؟

''نہیں اندھیرا ہو رہا تھا اس لیئے جی لگا ہوا تھا''

'' کیا اٹ پٹی سی بات کر رہی ہو؟ اندھیرا کیا آج ہی ہوا ہے''؟

اچھا اچھا منہ ہاتھ دھو لیجئے، چائے تیار ہے' اسے لگا وہ بات کا رخ بدل رہی ہے۔

'' ابو۔ ابو! شیو پوجن چاچا کے یہاں اینٹ آئی ہے'' اس کی بیٹی اس کی آواز سنتے ہی دوڑی آئی۔

وہ شاید عادت کے مطابق دن بھر کی خاص خاص خبریں سنانے کے موڈ میں تھی۔

''چلو جا کر پڑھو، لائٹ آ گئی ہے'' بیوی نے جھپٹ کر اسکا ہاتھ پکڑا اور کمرے کی طرف دھکیل دیا۔

''پاگل ہوگئی ہو؟ اس طرح کیوں ڈانٹتی ہو؟ اور یہ شیو پوجن کے یہاں اینٹ کیسی''؟

''چپ رہئے''۔ اس نے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور دھیرے سے بولی، ''آواز دوسرے گھروں میں بھی جاتی ہے۔ پہلے منہ ہاتھ دھو کر کچھ کھا پی لیجئے'' سلامت اللہ کچھ نہ بولا، وہ تھکاوٹ محسوس کر رہا تھا؟ اور بھوک بھی لگی تھی۔ ٹفن کے وقت کا کھایا کتنی دیر تک پیٹ میں رہتا؟ آج تو کوئی اسامی بھی نہیں پھنسا تھا کہ ناشتہ پانی کرا دیتا۔ مگر شیو پوجن.....اسے پھر باہر کی بھیڑ یاد آئی۔

پھر بیٹی کا جملہ، ''اینٹ آئی ہے'' اور اچانک شیو پوجن کا جملہ گونجا، ''ذرا باہر چلے گئے تھے''۔

''سنو'' اچانک اس کی چھٹی حس جاگ اٹھی اور اس نے دھیرے سے بیوی کو پکارا۔

''کیا ہے''؟

''شیو پوجن.....اجودھیا.....گیا تھا کیا؟''

''جی، باہر اسی کی بھیڑ ہے'' بیوی ہلکے سے بولی اور تھکے قدموں پھر باورچی خانے میں چلی گئی۔

بجلی پھر گم ہوگئی تھی اور پورے گھر میں عجیب سا سناٹا رینگ رہا تھا۔ آس پاس کے گھروں سے لالٹین کی ناکافی لو اس طرح تھر تھراتی اور رینگتی اس کی کھڑکیوں اور روشندانوں سے گھر کے اندر چلی آ رہی تھی کہ اسے لگا کہ سانپ کی کینچلی چمک رہی ہے۔

اندھیرا کچھ اور گہرا ہو گیا تھا۔ گلی میں بچے کھیل رہے تھے.....جئے کنہیا رام کی۔

''سنو'' اس نے بیوی کو پھر پکارا۔

''جی''

''تمہارے ابا کا دو تین خط آ چکا ہے نا؟ اب تو بڑے دن کی چھٹی بھی ہونے والی ہے۔ اپنے مائیکے ہو آؤ''

''اچھا چلی جاؤں گی۔ لیجئے کچھ کھا لیجئے'' وہ دھیرے سے بولی اس کا انداز دل رکھنے

والا تھا۔

اس نے تھوڑا سا کھایا۔ وہ لگ بھگ پانچ گھنٹوں کا بھوکا تھا۔ مگر اب بھوک ہی نہیں لگ رہی تھی۔ چائے پی کر اس نے سگریٹ سلگائی اور صوفے پر ہی لیٹ کر ایک کش لیا اور ایک عجیب پس و پیش کی حالت میں خیال آیا۔ مکان ملتا کہاں ہے...... مسلم علاقوں میں تو کرایہ آسمان چھوتا ہے، مکان مالک سمجھتا ہے وہ خدا ہے، مکان نہیں دے رہا ہے۔ کرایہ دار کی عمر بڑھ رہا ہے..... مگر کرایہ دار بھی تو بیوی اور بچوں کے لئے..... لیکن یہاں تو آمدنی محدود ہے۔ رشوت کے نام پر چائے پانی یا کبھی قسمت نے ساتھ دیا تو دس بیس روپئے..... آمدنی والا ٹیبل اسے آج تک ملا ہی نہیں۔

ایسے میں وہ سرکاری کوارٹر چھوڑ کر اور کہاں جاتا؟ اور کوارٹر بھی کیا؟ ایل.آئی.جی فلیٹ۔ مگر ایک کلرک کو ایل.آئی.جی نہیں ملتا تو اور کیا ملتا۔

"جے شری رام" اچانک ایک زوردار نعرہ گونجا اور وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"بیٹھیے بیٹھیے" بیوی جلدی سے پاس آئی اور دھیرے سے بولی، گھبرانے کی بات نہیں صبح سے ہی چل رہا ہے۔ دیکھنے والوں کا پھر کوئی نیا قافلہ آیا ہوگا"۔

وہ بیٹھ گیا مگر دل کی دھڑکن تو بڑھ ہی گئی تھی۔ اس نے محسوس کیا، اس سردی میں بھی ماتھے پر پسینہ آ گیا۔

گزشتہ رات تک بھیڑ کا احساس ہوتا رہا۔ رہ رہ کر نعرے سنائی دیتے رہے اور تنہائی کا اگیا بیتال سلامت کے کندھے پر چڑھا چڑ چڑ اس کی کھوپڑی کھاتا رہا۔

"مائیکے جانے کی بات آپ نے کیوں کی؟" رات میں جب بچے سو گئے تو بیوی نے پوچھا۔

"کیوں، نعرے نہیں سن رہی ہو؟"

نعرے تو عقیدت کے طور پر لگائے جا رہے ہیں۔

"عقیدت کو نفرت بنتے کتنی دیر لگتی ہے؟"

بیوی چپ ہو گئی۔ رات دھیرے دھیرے گہری اور اندھیری ہوتی جا رہی تھی۔ وہ بہت دیر تک جاگتا رہا۔ اپنی عادت کے برخلاف جاگتا رہا۔ عام دنوں میں تو وہ دن بھر کا تھکا ہارا بستر پر اس طرح گرتا تھا کہ اسے اس کا پتہ بھی نہ چلتا تھا کہ بیوی کس وقت آ کر اس کے پاس لیٹی۔ مگر آج وہ جاگ رہا تھا۔ آج کیوں جاگ رہا تھا؟ شیو پوجن؟ مگر اس کے سلوک میں تو کوئی اہم بات نہیں

تھی۔ اینٹ؟ نہیں جب ٦ دسمبر گزر ہی گیا تو..... تو پھر؟ اچانک جملہ گونجا'' سالا متلاً ہے'' اسے لگا کسی نے اس کے کانوں میں انگارے ڈال دیئے۔ یہی وہ لفظ ہے جو سات گھنٹوں سے اس کی آنتیں کاٹ رہا ہے۔ پندرہ سال کی زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا تھا۔ کل تک وہ صرف سلامت بھائی تھا۔

اچانک اسے اپنے رشتہ دار یاد آ گئے، اپنا بھائی برکت اللہ، چچا عزت اللہ، ماموں عبدالستار..... یہ سب لوگ اب کراچی میں تھے، ایک بار شادی میں وہ بھی کراچی گیا تھا۔ مگر وہ گیا اور چلا آیا۔ اس وقت کوئی خاص بات محسوس نہیں ہوئی۔

بلکہ اسے یاد آیا، اس کے ماموں نے جب کہا۔ سلامت تم بھی یہیں آ جاؤ تو وہ جھنجھلا کر بولا تھا۔ کیوں؟ کیا میں وہاں بھوکوں مر رہا ہوں؟

'نہیں یہ بات نہیں ہے'۔ ماموں نے اسے سمجھانا چاہا۔ وہاں اتنے زیادہ فسادات ہوتے رہتے ہیں کہ برابر فکر لگی رہتی ہے۔

ماموں 1971 کے بعد آپ لوگ تو کم سے کم فسادات کا حوالہ نہ دیجئے، شاید اس کے لہجے میں تلخی زیادہ تھی۔

ماموں ایک دم چپ ہو گئے اور دیگر لوگوں نے بھی جب تک وہ وہاں رہا، پھر اس حوالے سے کوئی بات نہ کی۔

'کیا ماموں صحیح کہہ رہے تھے؟' اچانک اس کے ذہن میں ایک زہریلا ناگ پھن کاڑھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ہاں نہیں کے بھنور میں چکراتا رہا۔ پھر سر کو جھٹکا دیا۔ نان سنس، جو کچھ میرے چاروں طرف ہے وہی میرا ہے۔

'' ہرے رام، ہرے کرشنا.....'' اس کی سوچ کی رفتار اچانک رک گئی۔ شیو پوجن کے یہاں بھجن شروع ہو چکا تھا۔

'' یہ؟'' اس کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔

یہ تو اک جھانکی ہے۔ متھرا کاشی باقی ہے۔ اسے شہر کی دیوار پر لکھا ایک نعرہ یاد آ گیا۔

دور سے ایک گاڑی کی آواز رات کے سناٹے کو چیرتی اس تک پہنچی۔ سردی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ باہر ہواؤں کا زور اپنے شباب پر تھا۔ بیوی اور بچے لحاف اوڑھے سو رہے تھے۔ اس نے لحاف سے ذرا سا سر نکال کر دیوار گھڑی دیکھی۔ دو بج رہے تھے۔

پھر نظر خود ہی کلینڈر کی طرف چلی گئی۔

۲۰ دسمبر...... اچانک ایک عجیب اٹ پٹی سی بات اس کے ذہن میں آئی۔ "کیا ۶ دسمبر گزر گیا؟" پھر اسی سے لگے لگے ایک اور دھند میں کھویا سوال...... ۶ دسمبر کیوں آتا ہے؟ پھر ایک اور ڈر...... کیا ۶ دسمبر پھر آئے گا؟ ایسے ہی اٹ پٹے خیالوں میں گم اسے نیند آ گئی۔

صبح سویرے بھجن کی آواز سے اس کی نیند ٹوٹی، بچے اسکول، کالج کی تیاری میں مصروف تھے۔ اس نے کھڑکی کھول کر دیکھا۔ شیو پوجن کے یہاں بڑی بھیڑ تھی۔ شاید بہت سارے لوگ رات میں یہیں رک گئے تھے۔ نل کے نیچے منھ دھونے اور نہانے کا سلسلہ جاری تھا۔ نوکر پورے گھر میں جھاڑو لگا رہا تھا۔ شاید نئے مہمانوں کے استقبال کی تیاری تھی۔

آج بچوں کو اسکول نہ جانے دو اور تم بھی تیار ہو جاؤ۔ میں تم لوگوں کو حیات بھائی کے یہاں چھوڑ دوں گا تب آفس جاؤں گا۔ سلامت نے بیوی سے کہا۔

"کیوں؟"

"تم لوگوں کو اکیلا چھوڑ کر آفس میں جی نہیں لگے گا۔"

بیوی ایک منٹ سوچتی رہی پھر بولی کالونی میں عزیز بھائی، انعام صاحب اور فضل احمد بھی تو ہیں۔ ذرا ان لوگوں سے بھی بات کر لیجئے۔

سلامت اللہ کو یہ بات پسند آئی۔ وہ گھر سے نکلا اور سیدھے نظر جھکائے ان تینوں سے ملنے چلا گیا۔ وہ تینوں بھی نئے حالات سے ڈرے ہوئے تھے، مگر چوں کہ شیو پوجن کا گھر ان کی لائن میں نہیں تھا اس لئے اتنا زیادہ اثر نہیں تھا۔ ویسے فضل احمد کی بات اس کے دل کو بھی لگی کہ آج دن بھر دیکھ لیا جائے۔ پھر انعام الحق کہنے لگے" میری چھٹیاں باقی ہیں۔ تم لوگ بے فکر ہو کر جاؤ۔ میں آج چھٹی لے لیتا ہوں۔"

مگر آفس میں بھی چین کہاں! شیو پوجن بھی اسی آفس میں تھے جس میں سلامت اللہ تھا۔ اور شیو پوجن کے لوٹ آنے کی خبر سب کو مل چکی تھی بلکہ ایسا محسوس ہوا جیسے آفس والوں میں سے کئی لوگ کل شیو پوجن کے یہاں سے درشن کر آئے ہیں کیوں کہ بات چیت گھوم پھر کر شیو پوجن تک پہنچ رہی تھی حالاں کہ سلامت اللہ اپنے ٹیبل پر تھا مگر دوسری میزوں پر ہونے والی گفتگو سے

اپنے کان کیسے بند کر لیتا؟

مگر بھائی نکالنے والے بھی بڑے گنی تھے۔ ایسا نکالا ہے کہیں سے ٹوٹی نہیں ہے۔

ارے تو ہے بھی تو پانچ چھ سو سال پرانی تب میٹیریل میں بھی تو کوئی ملاوٹ نہیں ہوتی تھی۔

شیو پوجن کی تو پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑھائی میں ہے اور کیوں نہ ہو اس کو ۷۴ جیسا تصادم تو مان ہی لیا گیا تو کل کو شیو پوجن مجاہد آزادی کا پنشن بھی لے گا۔ جو درشن کرتا ہے وہ دان بھی دیتا ہے اور پھر دھارمک سنگھرش کا ایک حصہ بن کر شیو پوجن راتوں رات دھارمک بھی بن ہی گیا۔

سلامت کا گھر تو شیو پوجن کے گھر کے پاس ہی ہے۔ اس کا کیا حال ہے؟ ایک دھیمی سی آواز گونجی۔

"وہی ہوگا جو ان لوگوں کا سارے دیش میں ہے"۔

سلامت اللہ اچانک چونک اٹھا۔ تو اس سارے رگڑے جھگڑے میں وہ بھی ایک پارٹی ہے؟ اچانک جیسے پورا منظر نامہ بدل گیا۔

اب تک وہ صرف اپنے بچوں، اپنے گھر اور اپنی کالونی کے حوالے سے سوچ رہا تھا۔ مگر اسے اچانک احساس ہوا کہ شکست کھائی فوج کا ایک سپاہی وہ بھی ہے۔ وہ ایک ایسی جنگ میں ہارا ہے جس میں اس نے حصہ ہی نہیں لیا۔ اسے اپنے آپ پر ہنسی بھی آئی اور ترس بھی آیا مگر ان کا کیا کروں؟ اسے اپنے ساتھی یاد آ گئے ان میں ایک شیو پوجن تو ہے ہی جو ایک ایسی جنگ کا فاتح ہے جس میں اس کا مقابلہ کرنے والا کوئی نہیں تھا اور پھر باقی بچے یہ میرے دوست جو ایک ایسی جیت پر خوش ہیں جس میں ان کی کوئی حصہ داری نہیں۔ مگر تب اسی وقت مولانا عبداللہ بخاری کا ایک جملہ یاد آیا، انہیں کی طرح ہم نے بھی مادرِ وطن کو خوب صورت بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، گرانٹ ٹرک روڈ، تاج محل، لال قلعہ ہم نے بنوایا۔

سلامت اللہ نے اچانک ہی اپنے کو ایک تلخ نفرت اور اوب کے گھیرے میں گھرتا محسوس کیا..... اوب تو حالات سے مگر نفرت کن سے؟ دوستوں سے یا مولانا عبداللہ بخاری سے؟ اسے اس سوال کا کوئی صحیح جواب نہیں مل سکا۔ بے خیالی میں اس نے میز کا ڈراور کھولا اس میں پڑا ہفت نامہ نکالا جو اس نے کچھ دن پہلے خریدا تھا۔ وہ بے خیالی میں ہفتہ وار کا ورق الٹنے لگا۔ الٹتے

الٹتے وہ ایک صفحے پر رک گیا۔ پورے صفحے پر ایک رنگین تصویر تھی۔ ڈھیر سارے لوگ گنبد پر چڑھ کر اس کو توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔

درد کی ایک تیز لہر اٹھی اور بھنور یا بگولے کی طرح اس کے اندر اندر سر سے پیر تک دوڑتی رہی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس درد میں دکھ کے ساتھ شرمندگی بھی شامل تھی۔ اس کا جی چاہا وہ چیخ کر رو دے۔ اس کا جی چاہا کوئی اسے پرسہ دے، دلاسے کے دو جھوٹے بول ہی سہی۔ اسے بیٹی کا جملہ یاد آ گیا۔ "شیو پوجن چاچا کے یہاں اینٹ آئی ہے۔" اس ایک اینٹ پر تصویریں نمایاں ہونے لگیں۔ سورت میں مادر زاد ننگی بھاگتی عورت کی تصویر۔ ممبئی میں لہولہان لاشیں۔ اسے گلزار یاد آ گئے۔ یہ زندہ بوند ہے بیٹی جہیز مانگے گی۔ پھر خسرو کی جیسے چیخ سنائی دی۔ ارے لکھی بابل مورے...... ہفتہ وار سے نکل کر وہ تصویر اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی اور سینہ پیٹنے لگی...... "ظالمو! میرے گوہر نہ چھینو"

اسے کہیں بہت دور سے آتی ایک آواز سنائی دی اور وہ چونک پڑا۔ اس کا کلیگ فضل احمد اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے اسے پکار رہا تھا۔

اس نے چونک کر اپنے کو دیکھا۔ ہفتہ وار کھلا پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں اور آفس کے سبھی لوگ اسے دیکھ رہے تھے وہ ہڑبڑا کر باتھ روم کی طرف دوڑا۔ باتھ روم سے ہاتھ منھ دھو کر نکلا تو اس کی طبیعت بالکل اچاٹ ہو چکی تھی۔ اسی حالت میں وہ باس کے کمرے میں چلا گیا۔

"سر، میں گھر جانا چاہتا ہوں"۔

"گھر؟" باس نے گھڑی دیکھی صرف دو بجے تھے۔

"جی سر، میں بہت تھکاوٹ محسوس کر رہا ہوں"۔

"اچھا جاؤ" باس نے نہ جانے کیا سوچ کر اجازت دے دی"۔

"سلامت" جب وہ چیمبر سے نکلنے کے لئے مڑا تو باس نے پکارا۔

"جی سر؟"۔

"کبھی کبھی کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے ہونے یا نہ ہونے پر اپنا کوئی اختیار نہیں رہتا۔ ایسے میں آدمی کو تھوڑا صبر سے کام لینا چاہئے ہر فیز ٹیمپوریری ہوتا ہے"۔

باس جو کچھ کہنا چاہ رہے تھے شاید سلامت نے وہ سن لیا اور دھیرے سے آفس سے

باہر آ گیا۔

مگر وہ تصویر اسے بار بار یاد آتی رہی اس کے اندر پھر ایک ہلچل سی مچی۔ کاش وہ وہاں ہوتا تو کم سے کم اپنی جان تو دے ہی دیتا۔ دلی میں بیٹھے کئی لوگوں کے لئے بڑی بھدی گالیاں اسے یاد آئیں۔ ان سبھوں کو تو گولی ماردینی چاہئے۔ حفاظت کا نعرہ بلند کر رہے تھے۔ دھوکے باز کہیں کے! کم سے کم وہ وہاں ہوتا......

پھر اس نے اپنے آپ کو میدان جنگ میں بڑے دھواں دھار انداز میں جنگ لڑتے دیکھا۔ اس کے چاروں طرف دشمنوں کا ایک ہجوم ڈھال تلوار، تیر، بھالے سے لیس اور وہ اکیلا، بغیر زین کسے ہوئے گھوڑے پر ایک ٹوٹی تلوار لئے ہوئے..... اس نے دیکھا کہ وہ ٹوٹی تلوار کے سہارے لڑ رہا ہے، دائیں۔ بائیں، اوپر نیچے سے اس پر حملے ہو رہے ہیں۔ وہ سب کا سامنا کرتے ہوئے، مارتا کاٹتا گنبد پر چڑھ جاتا ہے اور ان سے ایک دھواں دھار جنگ لڑنے لگتا ہے جو گنبد گرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اسی ادھیڑ بن میں گھر آ گیا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی جیسے بیوی نے بم پٹخ دیا، "کئی بار شیو پوجن جی آپ کو تلاش کرتے ہوئے آئے تھے"

"شیو پوجن؟ مجھے کھوج رہے تھے؟"۔

"جی ہاں"۔

"کیوں؟ مجھے کیوں؟"۔

"پتہ نہیں۔ لیکن کئی بار آ چکے ہیں، جا کر مل لیجئے۔"

"میں کیا کروں گا مل کر؟ پھر کوئی پاگل کچھ نہ کچھ کہہ دے گا۔"

اچانک اسے جملہ یاد آ گیا۔ سالا متلا ہے۔

"کیوں کسی نے کچھ کہا کیا؟"۔

"نہیں..... مطلب نعرہ۔ وارا" اب وہ بیوی سے اتنا بکھان کیا کرتا۔

"نعرہ؟ کوئی ضروری ہے کہ آپ ہی کو سنانے کے لئے ہو۔ ویسے بہت دیر سے کوئی نعرہ بھی سنائی نہیں دیا اور پھر ایک دو دن کا معاملہ نہیں۔ ہمیں بھی تو یہیں رہنا ہے۔ جا کر مل لیجئے۔ دریا میں رہ کر......"

وہ ایک پس وپیش کی حالت میں گھر سے نکلا اور شیو پوجن کے گھر کی طرف بڑھ گیا۔

"ارے" اس کی آنکھیں تعجب سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں آفس سے واپسی پر وہ اپنے ہی خیالوں میں ایسا گم رہا کہ شیو پوجن کے گھر کی طرف دھیان ہی نہیں گیا۔ وہاں تو نظارہ ہی دوسرا تھا۔ منڈپ ہٹ چکا تھا۔ بھیڑ تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ بھجن بھی بند ہو چکا تھا۔ اس کے پکارتے ہی شیو پوجن ہڑ بڑا کر باہر نکلے۔

"ارے، سلامت بھائی، آپ؟ میں آپ کو کئی بار کھوج چکا۔"

"کیا بات ہے؟"۔

"آیئے۔ آیئے نہ" وہ اسے لئے بیٹھک میں چلے گئے۔" بدھنا..... چائے لے آرے۔" انہوں نے نوکر کو آواز دی۔

"دیکھئے ایسا ہے کہ....." تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں کر کے وہ اصل بات پر آ ہی گئے۔ "میں نے آپ کو بتایا ہی تھا کہ میں باہر گیا تھا پھر آفس میں بھی آپ کو معلوم ہو ہی گیا ہوگا۔ یہ تو آستھا کا معاملہ تھا سلامت بھائی۔ آپ کچھ خیال مت کیجئے گا آپ دیکھ ہی رہے تھے کتنی بھیڑ تھی۔ مگر آج خبر ملی ہے....." تھوڑا ٹھہر کر بولے،" اصل میں دلی اور یہاں دونوں جگہ تو ہم لوگوں کی ورودھی پارٹیاں ہیں تو اب اسی کو بہانہ بنا کر دھڑ پکڑ ہو رہی ہے۔ تھانہ سے داروغہ جی خبر بھجوائے ہیں کہ اوپر کا حکم ہے...... پالن کرنا ہی ہوگا، آج کسی وقت چھاپا پڑ سکتا ہے.....اب اسے کہاں لے جاؤں؟"۔

اس نے بڑی حیرت سے شیو پوجن کو دیکھا..... مجاہد آزادی.......دھارمک سنگھرش؟ وہ شیو پوجن کو ایک ٹک دیکھتا رہا وہ بولتے رہے،" رمیش جی، ہزاری پرساد اگروال صاحب سب نے انکار کر دیا اور بات بھی ٹھیک ہے میرے بعد ان لوگوں کے گھروں کی بھی تلاشی ہو سکتی ہے۔ ایسے میں اب لے دے کر آپ ہی بچ جاتے ہیں، جہاں تلاشی کا چانس نہیں ہے، کرپا کر کے اس کو آپ اپنے یہاں رکھ لیجئے۔ میں نے سوچا مگر ادھر ادھر پھینکنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ شری نرائن بتا رہے تھے کہ سی آئی ڈی والے گھوم رہے ہیں۔" اور پھر اتنا کہہ کر وہ رکے، سلامت اللہ کو دیکھا اور دھیرے سے بولے" یہ تو آپ کے لئے بھی اتنی ہی اہم اور ضروری ہے۔"

سلامت اللہ کو ہنسی آ گئی۔ اس نانسنس میں اب کیا سنس تلاش کیا جائے۔

مگر پھر اچانک گلزار یاد آ گئے۔ یہ زندہ بوند ہے بنی جہیز مانگے گی..... اس لگا جہیز دینے کا وقت آ گیا۔ ایک بار پھر میگزین سے تصویر نکل کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اس کا پورا جسم آگ میں جھلس رہا تھا اور شعلے سانپ کی زبان کی طرح لپلپا رہے تھے۔ لاکھوں میں ایک بے کس و دلگیر ہائے ہائے.......... اسے لگا وہ پکار رہی ہے..... سلامت اللہ..... سلامت اللہ......"

اچھا یہ تو بتایئے یہ کس حصے کی ہے؟" اچانک سلامت اللہ نے ایک بہت ہی عجیب سوال کر ڈالا۔

"یہ؟ یہ نیو کی ہے۔ اوپر کا تو زیادہ حصہ برباد ہی ہو چکا۔" شیو پوجن نے بلا جھجک بڑی صفائی سے جواب دیا۔ مگر جب وہ اسے لئے ہوئے اپنے گھر پہنچا تو بیوی بالکل بلبلا اٹھی اور شیرنی کی طرح جیسے اس پر جھپٹ پڑی۔ آپ کی عقل ماری گئی ہے کیا؟ کل اسی کو لے کر اتنا پریشان تھے اور آج اسی کو گھر اٹھا لائے؟"

یہ بہر حال اپنی چیز ہے"۔ سلامت اللہ نے سمجھانا چاہا۔

"اپنی چیز؟" بیوی غصہ میں ناچ ناچ گئی۔ "کسی کو ناسور یا پھوڑا ہو جائے تو وہ بھی تو اس کی اپنی چیز ہوتا ہے۔ تو کیا وہ سینت سینت کر اپنے پاس رکھے رہتا ہے؟"۔

"لاحول ولاقوۃ" سلامت اللہ بگڑ اٹھا۔ "کیا بے ہودہ باتیں کرتی ہو؟ کہاں ناسور؟ کہاں یہ! ارے اس کی حفاظت کرنا اور اسے بچانا ہمارا فرض ہے۔"

"اچھا ابا ایک بات بتایئے۔" اچانک کالج میں پڑھنے والا بیٹا بول پڑا۔ آپ ہی نے بتایا تھا کہ واجد علی شاہ کے وقت سے یہ ہمارے لئے مسئلہ بنی ہوئی ہے، تو پھر ایک ایسی چیز جو ہر زمانے میں ہر آدمی کے لئے مسئلہ بن جاتی ہے، حد یہ ہے کہ اب شیو پوجن چاچا کے لئے بھی مسئلہ بن گئی۔ اسے اپنے سر منڈھ لینا کہاں کی عقلمندی ہے؟ سلامت اللہ نے آنکھیں پھاڑ کر سامنے دیکھا..... وہاں اس کا بیٹا ہی تھا مگر دھند گہری تھی اس لئے پہچاننے میں دشواری ہو رہی تھی۔

پھر بیوی کی آواز سنائی دی، کورٹ، کچہری، تھانہ..... ان کا کوئی ٹھکانہ! کہیں یہ شیو پوجن کے گھر جاتے جاتے ہماری طرف مڑ گئے تو؟ نا بابا نا..... بیوی بالکل مرنے مارنے پر تلی ہوئی تھی۔

"دیکھو تم لوگ سمجھنے کی کوشش کرو۔" سلامت اللہ کو لگا کہ اب وہ اپنے گھر میں بھی ایک

ہاری ہوئی جنگ لڑ رہا ہے۔

''ارے جائیے۔ جائیے'' بیوی غصہ میں ہاتھ نچاتے ہوئے بولی۔ ''کسی اور کو جا کر سمجھائیے اور اس سے پہلے خود سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ دلی میں بیٹھے سورما تو اس آگ سے گھبرا کر بھاگ کھڑے ہوئے ہم لاچار لوگ کس گنتی میں ہیں۔''

یہ بات سلامت اللہ کے جی کو بھی لگ گئی۔ سچ مچ جب آگ لگی تو دلی میں بیٹھے سورما بھی تو صرف دور دور ہی سے آگ آگ کا شور مچاتے رہے۔

''مگر قسمت کا لکھا کون ٹال سکتا ہے۔ جب وہ باہر آیا تو دیکھا کہ شیو پوجن کے گھر والے کہیں جا رہے ہیں۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' اس نے شیو پوجن کے لڑکے سے پوچھا جو گھر میں تالا لگا رہا تھا۔

''جی ہم لوگ موسی کے یہاں کاشی جا رہے ہیں۔''

''اور شیو پوجن جی......؟''۔

وہ پہلے ہی اسٹیشن جا چکے، اتنا کہتے ہوئے لڑکا بھی رکشہ پر بیٹھ گیا۔

شاید باپ کے حکم کے مطابق وہ بھی زیادہ بات نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔ شیو پوجن کی اسٹریٹجی سلامت اللہ کی سمجھ میں آ گئی۔ بال بچوں والا آدمی ڈر کے بھاگے نہیں تو اور کیا کرے۔

مگر اصل مسئلہ یہ نہیں ہے۔ شیو پوجن تو گیا سے نکلتا ہے اور کاشی چلا جاتا ہے۔ اور چاہے گا تو کاشی سے اپنے ماما کے گھر متھرا چلا جائے گا لیکن سلامت اللہ کیا کرے جس کو شیو پوجن نے زبردستی نیو کی اینٹ سونپ دی ہے۔

☆☆☆☆☆

تصنیفات وتالیفاتِ حُسین الحق

افسانوی مجموعے

۱ پسِ پردۂ شب

۲ صورتِ حال

۳ بارش میں گھرا مکان

۴ گھنے جنگلوں میں

۵ مطلع

۶ سوئی کی نوک پر رکا لمحہ

۷ نیو کی اینٹ

ناول

۸ بولو مت چپ رہو

۹ فرات

سوانح

۱۰ آثار حضرت وصی

تاریخ

۱۱ آثارِ بغاوت (تذکرہ قاضی علی حق)

تالیف

۱۲ آثار حضرت وحید (تصنیف حضرت سرور اورنگ آبادی)

۱۳ غیاث الطالبین (تصنیف مولانا غیاث الدین اصدقی)

۱۴ فوز وفلاح کی گمشدہ کڑی (تصنیف مولانا انوار الحق شہودی)

۱۵ شرفِ آدم کا نقطۂ عروج (تصنیف مولانا انوار الحق شہودی)

۱۶ آدابِ حج وزیارت (تالیفِ مصنف)

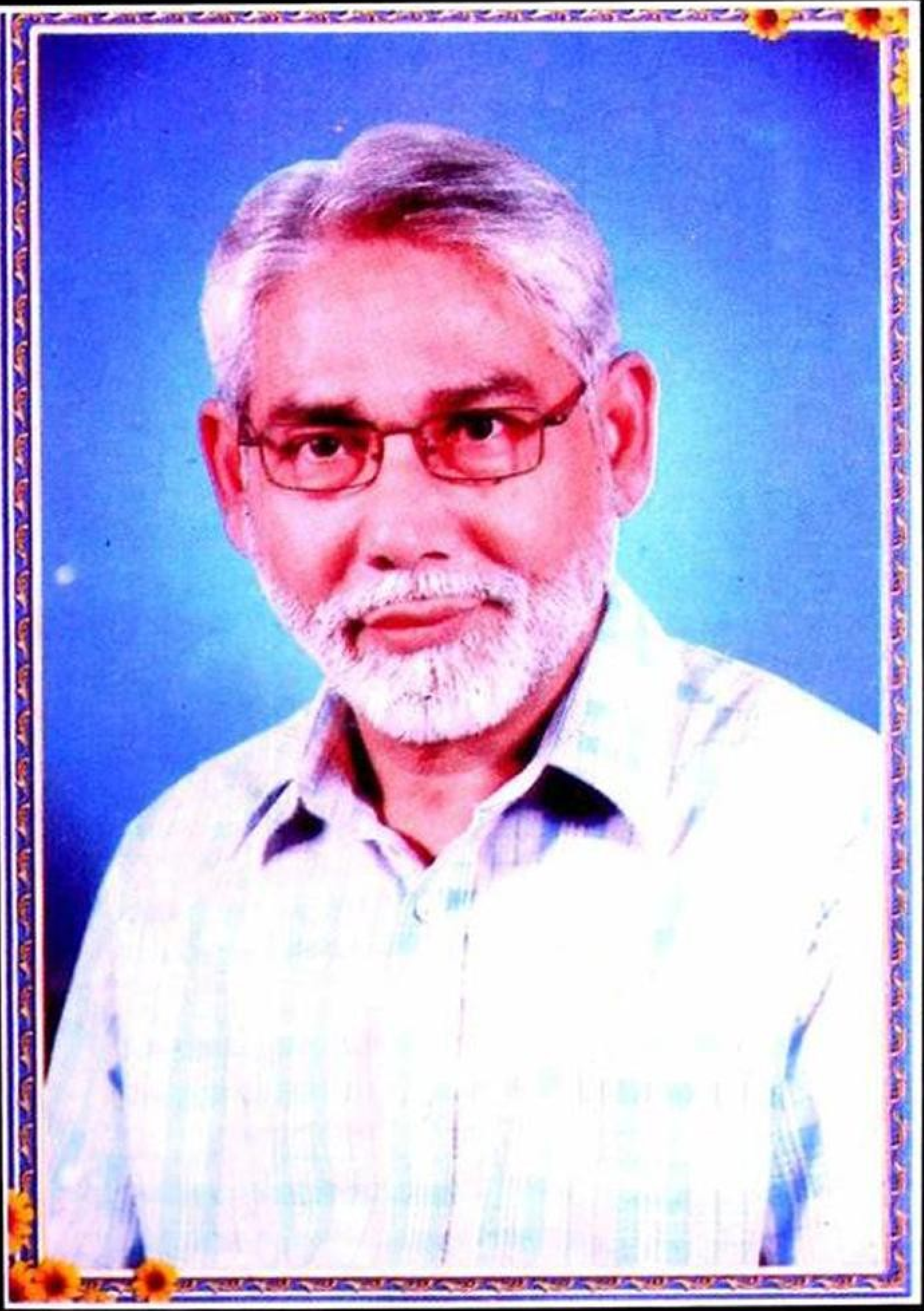
☆☆

NEO KI EIENT

(Short Stories)

by

Hussain-ul-Haque



EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, Gali Vakil, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)

Ph: 23216162,23214465 Fax : 0091 -11- 23211540

E-mail :info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com

Website: www.ephbooks.com

978-81-8223-718-6